عکسِ احمدؒ

سوانح حیات

فخر الاسلام حضرت مولانا

محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مہتمم خامس دار العلوم دیوبند

تقدیم و نگرانی

خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہ

مہتمم دار العلوم وقف دیوبند

تالیف

محمد شکیب قاسمی ❋ محمد نوشاد قاسمی

باہتمام

حجۃ الاسلام اکیڈمی

دار العلوم وقف دیوبند

عکسِ احمد

عکسِ احمد

سوانح حیات

فخر الاسلام حضرت مولانا

محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مہتمم خامس دار العلوم دیوبند

تقدیم و نگرانی

خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہ

مہتمم دار العلوم وقف دیوبند

تالیف

محمد شکیب قاسمی ✡ محمد نوشاد قاسمی

باہتمام

حجۃ الاسلام اکیڈمی

دار العلوم وقف دیوبند

تفصیلات

نام کتاب

عکس احمدؒ

تالیف

- محمد شکیب قاسمی
- محمد نوشاد نوری قاسمی

صفحات : ۴۸۸

ISBN: 9788192944135

اشاعت

رجب المرجب ۱۴۳۵ھ مطابق مئی ۲۰۱۴ء

پروف ریڈنگ

حجۃ الاسلام اکیڈمی اسٹاف

کمپوزنگ

خورشید اعظمی، دارالعلوم وقف دیوبند

باھتمام

حجۃ الاسلام اکیڈمی، دارالعلوم وقف دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہمارے بعد ہمیں ڈھونڈنے چلی دنیا
جلے چراغ؛ مگر دیر سے چراغ جلے

فہرست مضامین

مضامین	صفحات

باب سوم

باب چہارم

باب پنجم

بابِ ششم

بابِ ہفتم

آٹھواں باب

نواں باب

دسواں باب

گیارھواں باب

بارھواں باب

تیرھواں باب

چودھواں باب

تمت

تقدیم

خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم

مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

جدامجد فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کی تعلیم وتربیت اور نشو ونما جس علمی و روحانی ماحول میں ہوئی، وہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا، خیال کیجئے کہ حجۃ الاسلام حضرت محمد قاسم نانوتویؒ جیسی شخصیت اپنے فرزند فرید کی تعلیم وتربیت، جس بہتر انداز میں کرسکتے تھے، اوران کے دینی مستقبل کی جو فکران کے ذہن میں رہی ہوگی، ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اپنا اثر نہ دکھاتی۔

حضرت نانوتویؒ کا گھر بلا مبالغہ صلاح وتقویٰ اور خداترسی و بے نفسی کا گہوارہ تھا، اور جدامجد کی والدہ بھی والد محترم کی طرح تقویٰ واخلاص اور خداترسی و بے نفسی کا پیکر تھیں، ایسے گھرانے میں جدامجد کی پرورش ہوئی، اور اپنے وقت کے فخرِ روزگار علماء بالخصوص حجۃ الاسلامؒ کے تلمیذ خاص اور محدث شہیر حضرت مولانا احمد حسن امروہویؒ کے ہاں تعلیمی مراحل طے ہوئے، پھر آگے چل کر اپنے والد ماجد حضرت حجۃ الاسلامؒ کے قائم کردہ گلشن علم دارالعلوم دیوبند میں اولاً تدریسی خدمات کے لئے منتخب ہوئے، اس کے بعد ۱۳۱۳ھ میں منصب اہتمام آپ کے سپرد ہوا اور ۱۳۴۷ھ تک مسلسل ۳۵ رسال تک منصب اہتمام پر رہ کر دارالعلوم دیوبند کی خدمت کا موقع ملا، دارالعلوم کے دارالاقامہ جدید، مسجد قدیم، دارالحدیث، لائبریری کی تعمیر انہیں کے عہد اہتمام کی

یادگار ہیں، انہیں کے دور اہتمام میں مطبخ کا باضابطہ اجراء ہوا۔ اور کتب خانہ کے لئے کتابوں کی فراہمی اور دارالعلوم کی تعمیری و تعلیمی ترقیات کے لئے مالی تعاون کی راہیں بھی انہیں کی جدوجہد سے ہموار ہوئیں، ماہنامہ ''القاسم'' اور ''الرشید'' کا اجراء بھی انہیں کے عہد میں ہوا، اس طرح اپنے والد محترم کے لگائے ہوئے اس پودے کی حفاظت کے ساتھ اس کی آبیاری اور پرورش کے لئے انہوں نے اپنی عمر عزیز کے مکمل ۴۵ رسال صرف کئے اور جان سے زیادہ عزیز سمجھ کر اس کی خدمت، حفاظت اور ترقی کے لئے اپنے آپ کو مصروف رکھا، یہاں تک کہ عربی مدرسہ سے دارالعلوم کی صورت میں ایک قد آور شجر بن گیا، اور اس کا فیض ملکی سرحدوں کو پھلانگ کر پوری دنیا میں جاری وساری ہو گیا۔

جدامجد حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے علم وعمل کے ساتھ انتظامی سلیقہ اور قائدانہ صلاحیت سے مالا مال فرمایا تھا، ان کے عہد اہتمام میں دارالعلوم دیوبند کی ترقیات تعلیمی معیار اور عالمی سطح پر دارالعلوم کی شہرت اور نیک نامی، اس کی زندہ شہادت ہے۔

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کی انتظامی وتدریسی خدمات کے ساتھ ۱۳۴۱ھ تا ۱۳۴۴ھ ریاست حیدرآباد دکن میں افتاء و قضاء کی صدارت عالیہ کے منصب پر بھی فائز رہے، اوران کے قلم سے بیشمار فتاویٰ اور فیصلے صادر ہوئے، جو اپنے آپ میں فقہ وفتاویٰ کا ایک عظیم الشان کام ہے۔

حکیم الاسلامؒ اپنے والد ماجد کی عادات واطوار، کمالات اور دارالعلوم کی خدمات کے تعلق سے ذکر فرمایا کرتے تھے، مگر باضابطہ کوئی سوانح آپ کے قلم سے نہ نکل سکی، جس سے تفصیلی حالات خاندان کے علاوہ علمی حلقوں کے سامنے بھی آتے، اس کی سب سے بڑی وجہ حضرتؒ کی مصروفیت تھی، اور ایسی منظم اور باضابطہ کہ اس میں سے چند لمحات کا نکلنا بھی مشکل تھا، اس لئے دیرینہ آرزو تھی کہ جدامجد کے حالات

زندگی پر کوئی صاحب علم قلم اٹھائیں، کچھ حضرات نے ہمت بھی کی؛ مگر دارالعلوم دیوبند سے لیکر ریاست حیدرآباد تک بکھرے مواد کو یکجا کرنے کا مسئلہ آڑے آگیا، یہ جان کر بے انتہاء مسرت ہوئی عزیزم محمد شکیب قاسمی سلمہٗ استاذ دارالعلوم وقف دیوبند اس سلسلہ میں انتہائی سرگرم اور کوشاں ہیں کہ جد امجدؒ کی سوانح حیات مرتب ہونی چاہئے، عزیز موصوف نے اس کے لئے بڑی لگن اور دلچسپی کے ساتھ دن رات ایک کر دیئے، اور مواد کی فراہمی کے لئے طول طویل اسفار کئے، اور پھر بڑی محنت سے مواد جمع کر کے ایک خاص سلیقہ سے اس کو مرتب کیا اور اب ان کی شب و روز کی یہ محنت اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ''عکس احمد'' کی صورت میں حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند سے معیاری کاغذ عمدہ کتابت و طباعت اور جاذب نظر سرورق کے ساتھ منظر عام پر آرہی ہے، کتاب کی ترتیب و تالیف میں عزیز موصوف کے رفیق خاص جناب مولانا محمد نوشاد نوری قاسمی استاذ دارالعلوم وقف دیوبند بھی شریک رہے، دونوں حضرات ماشاء اللہ باصلاح و باصلاحیت ہیں، بہت سلیقہ سے کام کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی اس محنت کو قبول فرمائے، اور کتاب کو خاص و عام کے لئے دینی نفع کا ذریعہ بنائے۔

نوٹ:- دارالعلوم دیوبند کی تین گراں مایہ شخصیات:

(۱) حجۃ الاسلام حضرۃ الامام محمد قاسم النانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند

(۲) فخر الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد احمد صاحبؒ
مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند (پینتیس سالہ دور اہتمام)

(۳) حکیم الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد طیب صاحبؒ
سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند (ساٹھ سالہ دور اہتمام)

کے بارے میں درجہ فارسی دارالعلوم دیوبند کے فن حساب کے فارسی داں استاذ مرحوم

نے یہ معنی آفریں فارسی قطعہ تحریر فرمایا تھا جس میں مذکورہ ہر سہ بزرگوں کے اسماء گرامی بہ ترتیب شامل ہیں، موضوع کی فی الجملہ مناسبت کی وجہ سے یہ یادگار تاریخی قطعہ بغرض حفاظت تحریر کیا جاتا ہے۔

محمد طیب است ودین او پاک — محمد احمد است وشاہ لولاک
محمد قاسم و معطی خدا ہست — فرو ماندہ زوصفش وادراک

(حضرت مولانا) محمد سالم قاسمی (صاحب)
مہتمم دار العلوم وقف دیوبند

پیش لفظ

رب کریم کا احسان عظیم کہ بانیٔ دارالعلوم دیوبند، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے فرزند جلیل اور حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کے پدر بزرگوار، فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند کی سوانح حیات ''عکس احمد'' کتابت وطباعت کے صبر آزما مراحل سے گذر کر آپ کے ہاتھوں میں آرہی ہے، سوانح کی ترتیب کے لئے جن کٹھن راہوں سے گذرنا پڑا عام آدمی کے لئے تو اس کا ذکر کوئی خاص معنیٰ نہیں رکھتا؛ لیکن جو حضرات علمی کاموں کی نزاکت اور مواد کی فراہمی کے مسائل سے قریبی واقفیت رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک ایسی شخصیت کہ جس نے ۴۵ ربرس دارالعلوم دیوبند کی خدمت کی ہو اور اس کے عہدِ اہتمام کی ترقیات دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کا ایک نہایت ہی جلی اور اجلا باب ہو، اگر اس کے حالات خود دارالعلوم سے میسر نہ آسکیں، تو کہاں سے؟ تو امید کے بجائے یاس اور توقع کی جگہ مایوسی ہی حصہ میں آتی ہے، ایسے میں اگر تلاش وجستجو کی مہم دم توڑ دے، محنت کا جذبہ سرد پڑ جائے، مقصد کی لگن؛ بلکہ مقصد سے محبت کا جذبہ ختم ہوجائے تو کیا بعید، آخر انسان تو انسان ہے کوئی سنگ وآہن تو نہیں، مگر اس حوصلہ شکن مرحلہ پر زندگی کی ایک ایسی منطق اور ایک ایسے فلسفہ کا سہارا لے لیا کہ عادۃً اس کو نہ سہارا سمجھا جاتا ہے اور نہ سچ مچ عام زندگی میں وہ

کوئی سہارا ہو سکتا ہے

دیوانگی ہو عقل ہو امید ہو کہ یاس
اپنا وہی ہے وقت پہ جو کام آ گیا

آپ اس سہارے کو دیوانگی کہیے یا مقصد کا جنون، یاس کہیے یا اپنی لگن کا پاس۔ الغرض کسی کو سہارا بنالیا اور آگے بڑھتے رہے، کبھی کاندھلہ سے حیدرآباد تک کی خاک چھانی تب جا کر کچھ مواد ہاتھ لگا، بیشک حکیم الاسلامؒ کے تذکروں میں اپنے والد محترم کے کچھ حالات ملتے ہیں مگر ایسی تفصیل سے نہیں ملتے کہ ان سے باضابطہ ایک سوانح مرتب ہو سکتی، تاہم اس سے بھی کافی تعاون ملا، اور زیادہ تعاون ہمیں حیدرآباد دکن، اور حضرت مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی کی عنایتِ خاص اور علم نوازی کے نتیجہ میں ملا جس کے لئے ہم حضرت مولانا کے شکر گزار ہیں۔

بڑی ہی ناسپاسی ہوگی اگر میں اس موقع پر برادر عزیز مولانا نوشاد نوری قاسمی صاحب استاذ دارالعلوم وقف دیوبند کا شکریہ اداء نہ کروں، موصوف کا اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں کلیدی کردار رہا، اگر کہا جائے کہ اس کام کو ان کی معاونت و مفید مشوروں کے بغیر عملی جامہ پہنانا ممکن نہیں تھا تو اس میں یقیناً کسی قسم کا مبالغہ نہیں ہوگا، وہ اس کار عظیم میں ہمیشہ ہمت و حوصلہ دیتے رہے اور تکمیل تک ایک شریک کار کی حیثیت سے اپنا گراں قدر تعاون پیش کرتے رہے، بالآخر خداوند کریم کی توفیق سے تقریبا تین سال سے جاری یہ کام اپنے انجام کو آ پہنچا، مصلحت ایزدی دیکھیے کہ اس کام کی تکمیل بھی حجۃ الاسلام اکیڈمی کے توسط سے ہی مقدر تھی۔

فالحمد لله علی ذلک

ہم اسے اپنی سعادت اور اللہ تعالیٰ کا کرم ہی سمجھتے ہیں کہ یہ عظیم خدمت حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند سے ہم ایسے کم سوادوں کے ذریعہ انجام پا رہی ہے اور اس کے ذریعہ جد امجد خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب

قاسمی دامت برکاتہم اور خانوادۂ قاسمی کے دوسرے بزرگوں کے دیرینہ خواب کی تعبیر سامنے آ رہی ہے۔

یہ دعویٰ تو ہرگز نہیں کہ کوئی معیاری کام ہوا ہے، البتہ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں یہ اپنی حد تک ایک محنت اور کاوش ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائیں تو اس کا کرمِ بے حساب، اور کسی علم دوست کو اس سے دینی نفع پہنچ جائے تو یہی بہت ہے۔

محمد شکیب قاسمی

١٥/اپریل ٢٠١٤

١٢/٤/٢٠١٤ء

ابتدائیہ

دارالعلوم دیوبند

تمام انبیائے سابقین میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک امتیاز- بہت ساری امتیازات کے ساتھ- یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ابدی اور آفاقی ہے، آپ علیہ السلام کی رسالت کے جلو میں کرۂ ارضی کی خشکی بھی ہے اور تری بھی، عرب بھی ہے اور عجم بھی، کیا شمال، کیا جنوب، کیا مشرق اور کیا مغرب، اور کیا زمانی بُعد اور جغرافیائی مسافتیں، آپ کا نور رسالت صحراء کے ہر ذرۂ بے مقدار، جنگلات کی ہر شاخ تر و خشک، سمندر کے ہر قطرۂ نیساں، اور آبادی کے ہر شور وغل میں یکساں طور پر پھیلا ہوا ہے۔

یہ نورِ رسالت انقلابی ہے، اور اس کی تاثیر حیات بخش اور ملک گیر ہے، یہ نور اپنی حقیقت کے اعتبار سے بالکل غیر محسوس ہے؛ لیکن اپنی تاثیر اور ثمرات کے لحاظ سے مکمل طور سے دنیا کے ہر خطے میں محسوس کیا جاسکتا ہے، یہ نور رسالت فضلِ ربانی ہے، یہ ہر کسی کو نہیں ملتا، اس نور کے خزینے، ائمہ مجتہدین، علمائے امت مجتہدین ملت، مصلحین اور اولوالعزم مجددین کے وہ سینے ہیں، جن کے کاندھے پر طوفانِ بولہبی سے شمع محمدی کی حفاظت، بدعات اور جاہلانہ رسومات کی آلائش سے، دین کو پاک کرنے نیز اسلامی معاشرہ کو ''صراط مستقیم'' پر گامزن کرنے کی ذمہ

داری عائد ہوتی ہے۔

یہ نورِ محمدی ہر قسم کے زہر اور زہر آلود مادہ کا تریاق ہے، تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی اسلام پر بُرا وقت آیا، مسلمان فتنے کی زد میں آ گئے یا ارتداد کی آندھیاں چلنے لگیں، یا ظالم حکومتوں نے اسلام کی بیخ کنی کی کوشش کی، عین اسی وقت اسلامی معاشرے سے مدرسۂ محمدی کا کوئی شاگرد، نورنبوت کا کوئی خوشہ چین، انتہائی بے سرو سامانی کے عالم میں جلوہ گیر ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے باطل کی تمام تدبیروں کو تارِ عنکبوت اور پاسبانانِ فخر و غرور کو مٹی کا ڈھیر کر ڈالا۔ تاریخ نے بارہا اس کا تجربہ کیا ہے اور آئندہ بھی اس کا تجربہ کرتی رہے گی۔

''دارالعلوم دیوبند'' کے نام سے دنیا جس دعوت، جس تحریک، بلکہ جس اسلامی طوفان کو جانتی ہے، وہ درحقیقت اس نور رسالت کا فیض ہے جو ابوبکر صدیقؓ کی جرأت، عمر فاروقؓ کی عزیمت، خالد بن ولیدؓ کی تلوار، عبداللہ بن مسعودؓ کی فقاہت، عمر بن عبدالعزیزؒ کی عدل، ابوحنیفہؒ کی فقہی بصیرت، احمد بن حنبلؒ کی بے باکی و حق گوئی، ابن تیمیہ کے جرأت مندانہ کردار، مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کی اصلاحی سرگرمی اور شاہ ولی اللہؒ کے تجدیدی کارناموں میں جلوہ گر رہا ہے، اور یہی نور مضبوط کڑی اور مربوط سلسلے کے ذریعہ بانیانِ دارالعلوم کو حاصل ہوا، اور انہوں نے اسی شمع محمدی سے، انتہائی مشکل حالات میں سفال ہندی کو بقعۂ نور بنا دیا۔

کون نہیں جانتا کہ ہندوستان میں اسلام کی ضیاء پاش کرنیں، پہلی صدی کے اواخر اور دوسری صدی کے اوائل میں پہونچ چکیں تھی، اور غزنوی خاندان کے بلند حوصلہ امیر مسعود غزنویؒ نے ۴۱۳ھ میں باقاعدہ یہاں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھ دی تھی، ان امراء و حکام کی علم دوستی اور علماء نوازی سے متاثر ہو کر پوری دنیا سے علماء، ادباء، شعراء اور فقہاء، کشاں کشاں ہندوستان چلے آئے، اور دیکھتے ہی دیکھتے

ہندوستان علم وفن کا مرکز، اور فکر و ادب کا مینارۂ نور بن گیا، بڑی تیزی سے یہاں اسلام کی اشاعت ہوئی، بڑی بڑی ذہانتوں نے خدمتِ دین میں حصہ لیا، ایسی تصانیف وجود میں آئیں کہ اسلامی تہذیب کا سر فخر سے اونچا ہوگیا، ایسی نابغۂ روزگار ہستیوں نے جنم لیا کہ سینۂ فلک، قسمت گیتی پر رشک کرنے لگا اور جن کے سامنے، دیگر ادیان و مذاہب کے کارنامے کجلا گئے، رفتہ رفتہ اسلام کی جڑیں مضبوط ہوتی چلی گئیں، خاص طور سے اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں یہ عروج اوج کمال کو پہونچ گیا، مگر مسلمانان ہند کی بدقسمتی کہ ۱۱۱۸ھ میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ فرماں روا ملک گیری، جہاں بانی، دینی وفکری سرحدوں کی حفاظت کے عظیم ورثہ کو سنبھالنے میں بدقسمتی سے ناکام رہے، اور اس زوال کا باقاعدہ آغاز اس وقت ہوگیا جب عالمگیر کے پڑپوتے فرخ سیر (۱۱۲۲ھ-۱۱۳۱ھ) نے ایک مغربی تجارتی کمپنی ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کو نہ صرف یہ کہ ہندوستان آنے کی پروانۂ راہ داری عطا کی؛ بلکہ بنگال میں اڑتیس گاؤں کی زمینداری خریدنے کی اجازت دے دی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کبھی بھی تجارتی ادارہ نہیں تھی؛ بلکہ حقیقت یہ ہے- اور نتائج نے اس کی تصدیق کردی- کہ اسلام کے خلاف وہ صہیونی صلیبی تحریک کا ایک مضبوط حصہ تھی، صلیبی تحریک نے- جو اسلام کے خلاف تاریخ کے ہر موڑ پر جواں اور اپنے مذموم مقاصد کی طرف رواں دواں رہی ہے- جب ہندوستان میں اسلامی تہذیب وثقافت کی جڑیں مضبوط ہوتی دیکھیں، اور انہیں اندازہ ہوگیا کہ اسلام کا یہ نیا قلعہ بعض لحاظ سے بہت ممتاز اور نمایاں ہے اور بروقت اس پر شکنجہ نہ کسا گیا تو یہ ناقابل تسخیر اور ہمارے مقاصد کی راہ میں سد سکندری بن جائے گا تو اس کی صلیبی رگیں پھڑک اٹھیں، اور انہیں مذموم مقاصد (اسلام کو کمزور کرنے اور اسلامی سلطنت کا چراغ گل کرنے

کے مقاصد) نے جب عملی شکل اختیار کی تو ایسٹ انڈیا کمپنی کا بت ہندوستان کے سیاسی منظرنامے پر تیار کھڑا تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی کے عیار اور شاطر ذمہ داروں نے بڑی خوبی اور چالاکی سے حکومت پر اپنے ڈورے ڈالنے شروع کیے، اور انہیں کامیابی ملتی چلی گئی، پھر ایک دور وہ آیا کہ مؤرخ کا قلم پوری طرح شکست خوردہ نفسیات لئے ہوئے بدحواسی کے عالم میں یہ لکھنے پر مجبور ہوا:

> ''یہ اسکیم تھی جس سے شاہ عالم کی حیثیت ایک پنشن خوار کٹھ پتلی سے تو کچھ زیادہ بڑھ جاتی ہے مگر اس کے ساتھ، اس کے پاس اختیارات شاہی نہ تھے، وہ بادشاہ تھا بھی اور نہیں بھی، سب کچھ تھا اور کچھ بھی نہیں تھا''[۱]۔

الغرض صدیوں میں بنایا ہوا عظمت کا محل زمیں بوس ہو رہا تھا، اور دہلی سلطنت کا پھلدار و سایہ دار درخت، ایسٹ انڈیا کمپنی کی آندھی کے سامنے پتے بن کر اڑ رہا تھا۔

داستان دار و رسن

لکھا جا چکا ہے کہ ''ایسٹ انڈیا کمپنی''، صلیبی تحریک کے خبیث مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے ہی ہندوستان آئی تھی، اور اپنی عیاری سے اس نے سب سے پہلے اسلامی سلطنت کے تار و پود بکھیر دیئے، مغلیہ فرماں رواں کو بے کار و معطل کر دیا، ۱۸۵۷ھ میں بہادر شاہ ظفر کو جلا وطن کر دیا، پھر کیا تھا؟ روشنی بجھ چکی تھی، محافظ اور پہرے دار راستے سے ہٹائے جا چکے تھے، درندہ صفت انگریزوں نے پورے ہندوستان میں، قتل و غارت گری لوٹ کھوٹ، پھانسیاں، جلا وطنیاں اور شرمناک اور عبرتناک سزاؤں کی وہ گرم بازاری کی کہ الامان والحفیظ، انگریزی

---

[۱] سلاطین ہند، تاریخ ملت: ص ۱۹۳ بحوالہ مقدمہ راجہ رام موہن رائے: ص ۹۳۔

حکومت کے خلاف اٹھنے والی زبانیں تراش لی گئیں، اس کے مقابلہ میں چلنے والے پیر توڑ دیے گئے، گردنیں جدا کردی گئیں، خون کے دریا بہا دیئے گئے، عفت و عصمت کو بالا خانوں پر لہرا دیا گیا، خانقاہیں اور مدرسے اصطبل خانے بنا دیئے گئے، پورے ہندوستان میں ہُو کا عالم تھا، ہندوستان میں مسلمان حزن وملال کی تصویر بن چکے تھے، حکومت کے خاتمے کا غم، علماء اور دانشورانِ قوم کی شہادت کا غم، مراکز و مساجد کے ڈھائے جانے کا غم، غموں کا یہ اندوہناک سلسلہ ابھی ختم بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ مسلمان ایک نئی اور پہلے سے زیادہ مؤثر اور خطرناک مصیبت سے دوچار ہوئے اور وہ تھی ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو عیسائی بنا دینے کی خطرناک مہم، انگریزی حکومت نے پورے منصوبہ بند طریقے پر بڑی تعداد میں پادریوں کو بلایا اور پوری طرح سرکاری نگرانی میں انہوں نے مسلمانوں کو مرتد بنانے کی کوششیں تیز کردیں، یہ پادری میلوں عرسوں اور مساجد میں جاتے اور وہاں اسلام اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تقریریں کرتے، ان پادریوں کے ساتھ پولس ہوتی، پادری کی بات کا جواب دینا گردن زدنی جرم تھا، یہ پادری مسلمانوں کو چیلنج دیتے، چیلنج کا جواب بھی موت اور خاموشی تو بدترین موت، ضمیر کی موت، ملت کی موت۔

جو غیرت مند علماء پادریوں کا مقابلہ کرنے نکلتے وہ کفن بردوش جاتے کہ انجام معلوم تھا، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے آگرہ میں فنڈر نامی پادری کا چیلنج قبول کیا اور مناظرہ میں اسے ذلت آمیز شکست دی؛ لیکن آپ وہاں کفن لیکر پہنچے تھے، پادری کی شکست کو حکومت نے اپنی شکست سمجھا، اور مولانا کے خلاف وارنٹ نکلا، مولاناؒ کسی طرح بچ بچا کر مکہ پہونچ گئے۔

محسوس کیا جاسکتا ہے کہ وہ امت مسلمہ، جس میں پہلے سے ہی شیعہ نوابوں اور جاگیرداروں کی وجہ سے شیعی اثرات اور قسم قسم کی بدعات وخرافات رائج ہو چکی

تھیں، حکومت کا چراغ گل ہو چکا تھا، علماء کی بہت بڑی تعداد شہید ہو چکی تھی، اور بہت بڑی تعداد دار و رسن کی نذر ہو چکی تھی، امت پوری طرح شتر بے مہار اور قافلۂ بے سالار ہو چکی تھی، اس امت کو منصوبہ بند طریقہ پر عیسائی بنانے کی سرکاری مہم کس ہلاکت کا پیش خیمہ ہونے والی تھی؟

اہل بصیرت نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اب ہندوستان دوسرا اندلس بنے گا، یہاں کے اسلامی آثار مدارس و مساجد اور تمام چیزیں تازیانہ عبرت ہوں گی، اور مسلمانوں کو عیسائی بنانا لقمۂ تر کی طرح آسان ہو جائے گا، ایسے مشکل حالات میں جب ہر طرف تاریکی اور ہر سُو خوف و ہراس کا عالم تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنے چند مخصوص بندوں کو ہندوستان میں اسلام کی نشأت ثانیہ کے لیے مقرر فرمایا، یہ مخصوص جماعت ان لوگوں کی تھی، جن کے دلوں میں جذبۂ جہاد کا شعلہ بھڑک رہا تھا، اور مسلمانوں کی زبوں حالی وافسردگی جنہیں گھن کر طرح کھائے جارہی تھی، اور جو لوگ بے سروسامانی کے عالم میں کئی مرتبہ انگریزوں سے ٹکر لے چکے تھے، نتیجہ ظاہر تھا، انہیں شکست ہوئی، کئی نابغۂ روزگار ہستیاں وہیں پیوند خاک ہو گئیں؛ مگر یہ ظاہری شکست ''فتح مبین'' کا پیغام بن کر آئی، رب ذوالجلال کی طرف سے الہام ہوا کہ اب تلوار کی جنگ کامیاب نہیں ہو سکتی، اب فکری اور علمی یورش کام آئے گی۔

چنانچہ یہ عظیم جماعت کشاں کشاں دیوبند آئی اور تمام محاذوں پر شکست کا یکساں انتقام لینے کے لیے ''مدرسہ عربی دیوبند'' کے نام سے وہ ادارہ قائم کیا، جو اپنے فکر اور مقاصد کے اعتبار سے روز اوّل سے آفاقی اور عالمگیر تھا، جس نے فتنے کی ہر آندھی کو پلٹن دیا، مسلمانوں میں علم کی مشعلیں روشن کیں، بدعات وخرافات کو مٹایا، توحید خالص کی تعلیم دی، باطل فرقوں کے قدم اکھاڑ دیئے اور اس کی برکت سے ہندوستان میں اسلام کا وہ درخت جو لگ رہا تھا کہ مرجھا کر سوکھ جائے گا، پھر سے اپنے پھلوں اور پھولوں سمیت لہلہانے لگا۔

"دارالعلوم دیوبند" چوں کہ ایک الہامی ادارہ ہے جسے مشیت ایزدی نے برپا ہی اس لیے کیا ہے کہ اس کے ذریعہ سے پورے عالم میں بالخصوص برصغیر میں اسلامی عقائد و تعلیمات کی حفاظت ہو سکے، شمع محمدی کو ہر باد مخالف سے بچایا جا سکے، علم و فن کو نئی زندگی دی جائے اور یہاں ایسے کردار تراشے جائیں، جس میں اسلاف کا سا تقوی، ابوحنیفہ کی فقاہت، ابن تیمیہ کی زمانہ شناسی اور رازی و غزالی کی نکتہ رسی ہو، اس لیے قدرت ہی کی طرف سے اس گلستاں کی نگہبانی کے لیے ایسے افراد مقرر کیے گیے جو علم و عمل، تقویٰ و خدا ترسی، نیز حکمت و بصیرت میں اپنے زمانے میں بہت ممتاز تھے، بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ اور آپ کے عظیم رفقاء نیز آپ کے بلند نگاہ تلامذہ و جانشین، درحقیقت روئے زمین پر خدائی قدرت کا کرشمہ تھے، ضلالت و گمراہی کی کون سی آندھی ہے جو ان کے سامنے ٹھہر سکی، خدمت دین کا وہ کون سا گوشہ ہے، جو اُن کے نفسِ گرم سے روشن نہیں ہوا۔

ذمہ داران دارالعلوم کی فہرست بڑی طویل ہے، اور ان میں ہر فرد اپنی جگہ ممتاز اور یگانۂ روزگار، اسی کہکشاں میں وہ نجم تاباں بھی ہے جن کے تذکرے سے قلب و نظر کی تطہیر کا کچھ سامان کیا جا رہا ہے یعنی فخر الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد احمد صاحب مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند و مفتیِ اعظم ریاست دکن ابن حجۃ الاسلام حضرت الامام محمد قاسم نانوتویؒ، آپ ۳۵ سال تک دارالعلوم کے مہتمم رہے، آپ کے زمانے میں دارالعلوم نے ہر طرح ترقی کی، آپ کا دور اہتمام دارالعلوم کے لیے خیر و برکت کا موسم بہار تھا، آپ کے تذکرے اور کارنامے متفرق طور پر یہاں وہاں ملتے ہیں، البتہ کوئی جامع سیرت جو آپ کی زندگی کے ہر گوشے کا احاطہ کر سکے، اب تک منظر عام پر نہیں آئی تھی، سوانح کی مختلف کتابوں سے آپ کے تذکرے کا پھول چن کر، آپ کی

سیرت کا یہ گلدستہ تیار کیا گیا، خدا کرے اس میں خوشبو بھی ہو اور پائیداری بھی، اور نام احمد کی برکت سے کچھ لائق ستائش بھی۔

تیری رحمت سے الٰہی، پائیں یہ رنگِ قبول
پھول کچھ ہم نے چنے ہیں ان کے دامن کے لیے

باب اول

خاندان وطن اور ماحول

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کا وطن قصبہ نانوتہ ہے جو ضلع سہارنپور میں ہے، سہارنپور سے اس کی مسافت (جنوب کی طرف) ۱۵ رکوس، دہلی سے شمال کی طرف ۶۰ کوس، گنگوہ سے (مشرق کی طرف) ۹ رکوس اور دیوبند سے (مغرب کی طرف) ۱۴ رکوس ہے[1]۔

نانوتہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، یہاں شاہ جہاں کے عہد سے صدیقی شیوخ کا ایک معزز خاندان آباد ہے، اس خاندان کے مورث اعلیٰ مولوی محمد ہاشم ہیں، جو عہد شاہ جہانی میں بلخ سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور نانوتہ میں آباد ہوئے، اس ہجرت کی وجہ شاید وہ رہی ہو، جس کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے، یعنی مغل حکمرانوں کی علم دوستی وعلماء نوازی، مولوی محمد ہاشم، جس دور میں ہجرت کر کے ہندوستان آئے ہیں، وہ مغل بادشاہ شاہ جہاں کا دور تھا، شاہ جہاں علم وادب کی خدمت اور اہل فضل وکمال کی دادرسی میں اپنے پیشرو سے کسی طرح کم نہ تھا، اس کے زمانے میں لاہور، احمد آباد، دہلی اور جون پور میں علم وفن کے ایسے مراکز قائم تھے، جو عالمگیر شہرت رکھتے تھے اور دنیا

---

[1] مولانا قاسم نانوتویؒ حیات اور کارنامے: ص ۳۲۔

بھر کے اہل علم وفضل کو دعوتِ نظارہ دیتے تھے، اسی عہد میں مولوی محمد ہاشم نانوتہ میں آکر آباد ہوئے، آپ کے فضل وکمال سے بادشاہ متاثر ہوا، اور بادشاہ نے انہیں اپنا مقرب بنالیا اور نانوتہ میں کئی دیہات جاگیر میں دے دیئے۔

حضرت نانوتوی کا آبائی مکان جو قصبہ نانوتہ میں تھا، اس کے کھنڈرات عرصہ دراز تک باقی رہے، یہ مکان قصبہ کی جامع مسجد سے متصل تھا، اس کا طرز تعمیر، اس کے بلند وبالا دروازے، اور گنبد اس بات کے کافی اشارے ہیں کہ یہ عہد مغلیہ کے کسی جاگیر دار کا مکان تھا، لکھوری اینٹیں، چونے اور گچ کا استعمال اور مکان کا مرکزی محدب قبہ مغل دور کا طرز تعمیر ہے، اس طرح یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مولوی محمد ہاشم کو جو جاگیر شاہی فرمان کے ذریعہ ملی تھی، اس کی آمدنی معقول تھی، اور خاندان کی زندگی بڑی خوش حالی اور فارغ البالی سے بسر ہوتی تھی۔

مولوی محمد ہاشم کی اولاد میں اللہ نے بڑی برکت رکھی، ان سے جو خاندان چلا، وہ بڑا ہی نامور اور مشہور ہوا، اس خاندان میں ایسی نامور ہستیاں پیدا ہوئیں، جن کے فیضان کرم سے پوری دنیا آج تک فیضیاب ہو رہی ہے، اسی خاندان میں استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند، مولانا مظہر علی نانوتویؒ بانیٔ جامعہ مظاہر علوم سہارنپور، مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ صدر مدرس دارالعلوم دیوبند، مولانا محمد احسن نانوتویؒ، مولانا محمد منیر احمد نانوتویؒ اور مولانا حافظ محمد احمد صاحب نانوتویؒ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

یہ سب مشاہیر ایک ہی گلستان کے گل ولالہ ہیں، جن کی دلنواز خوشبوؤں سے علم وادب کی بساط معطر ہے، اس خاندان کی خوبصورت شاخوں اور ان بزرگان کی نسبی قرابتوں کی تفصیل تو شجرۂ نسب سے معلوم ہوگی، جسے ہم آگے ذکر کریں گے (ان

شاء اللہ) مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے اس خاندان کی کچھ نامور شخصیات کا مختصر تعارف پیش کر دیا جائے، تا کہ آخری دور میں قصبہ نانوتہ کی علمی مرکزیت اور دینی حیثیت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

۱-مولانا مملوک علی نانوتویؒ

استاذ الاساتذہ، بے نظیر شہرت کے مالک، اپنے زمانے کے اکثر مشاہیر کے اساتذہ اور مرجع، علوم عقلیہ ونقلیہ میں کامل دست گاہ، انگریزوں کی قائم کردہ دہلی کالج میں صدر المدرسین اور انگریز دشمنی میں سب سے پیش، یہ ہیں نانوتہ کی علمی سحر کا عنوان اور بزم دہلی کی شام کے امین، مختلف افکار ونظریات کے سنگم: حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ۔

آپ کی ولادت نانوتہ میں ہوئی (تراجم کی کتابوں میں آپ کی تاریخ ولادت کا تذکرہ نہیں ملتا ہے) آپ کی تعلیم دہلی میں ہوئی، آپ نے بیشتر علوم وفنون اور حدیث کی کتابیں مولانا رشید الدین خان دہلوی سے پڑھیں، جو حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے براہ راست شاگرد تھے، البتہ معقولات کی بعض کتابیں آپ نے مولوی قلندر بخش سے پڑھی تھیں۔

آپ بہت ذہین تھے، سینکڑوں کتابیں آپ کے حافظہ کے خانہ میں محفوظ تھیں، سر سید کا کہنا تو یہ ہے کہ "اگر علم وفن کی ساری کتابیں ناپید ہو جائیں تو مولانا موصوف کے حافظہ سے حرف بہ حرف ان کو دوبارہ لکھا جا سکتا ہے[۱]۔

انگریزوں سے آپ کی دشمنی کا منتہی یہ تھا کہ "ایک بار انتہائی مجبوری کی حالت میں ایک انگریز عہدے دار سے ہاتھ ملانے کی نوبت آگئی، تو اس ہاتھ کو علیحدہ کیے ہوئے تھے، اور جب وہ افسر چلا گیا، تو اس کو صابن سے خوب دھویا تب ان کو اطمینان ہوا۔

۱؎ دیکھیے مولانا نانوتویؒ حیات اور کارنامے، ص ۲۱۔

آپ کے شاگردوں میں بڑے بڑے مشاہیر ہیں، حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ، مولانا فضل رحمانیؒ دیوبندی ڈپٹی انسپکٹر آف مدارس، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی ڈپٹی انسپکٹر آف مدارس، مولانا منیر احمد نانوتویؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا محمد احسن نانوتوی استاد بریلی کالج، سرسید احمد خان بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ وغیرہ جیسی نابغۂ ہائے روزگار شخصیات آپ ہی کے تلامذہ ہیں، آپ کی وفات دہلی میں ۱۱/ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ-ستمبر ۱۸۵۱ء کو ہوئی، مہدیان دہلی میں آسودۂ خواب ہیں۔

۲- حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند

ملت اسلامیہ کی آبرو، علوم اسلامیہ کا مجدد، دماغ فلسفی، دل صوفی، نکتہ ہائے رازی کا امین، سوز وگداز رومی کا وارث، تکلفات ونمائش سے دور، شہرت ونا موری سے بیزار، سراپا عجز وانکساری، عابد شب بیدار بھی اور مجاہد کارزار بھی، فروتنی ایسی کہ پہچانے بھی نہ جائیں، شہرت ایسی کے نام سے ہی پادریوں اور پنڈتوں پر کپکپی طاری ہو جائے، یہ ہیں افق نانوتہ کے نیر تاباں، روئے زمین پر خدائی برہان، عالم پیا فیضانِ علمی کی نہر سلسبیل: دارالعلوم دیوبند کے بانیوں کے سرخیل حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔

آپ کی ولادت ۱۲۴۸ھ میں نانوتہ میں ہوئی، ابتدائی تعلیم مولوی مہتاب علی کے مکتب میں ہوئی، پھر سہارنپور میں مولوی نواز سے عربی صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، ۱۲۵۹ھ کے آخر میں مولانا مملوک علی نانوتوی کے ہمراہ دہلی گئے اور وہیں مروجہ علوم دینیہ کی تحصیل کی، حضرت شاہ عبدالغنی مجددی سے علم حدیث حاصل کیا، زمانہ طالب علمی ہی میں آپ کی ذہانت، علم وفضل اور فہم وفراست کی شہرت عام ہوگئی تھی۔

فراغت کے بعد آپ نے ذریعۂ معاش کی لیے حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ کے مطبع احمدی دہلی میں تصحیح کتب کا کام اختیار کیا، اسی زمانے میں حضرت

مولانا احمد علی کی فرمائش پر صحیح بخاری کے آخری چند سپاروں کا حاشیہ بھی تحریر فرمایا، آپ کا سب سے عظیم کارنامہ، ہندوستان میں علوم دینیہ کی نشأۃ ثانیہ کے لیے تعلیمی تحریک کا احیاء، اور مدارس دینیہ کے لیے ان رہنما اصول کی وضع ہے، جن پر مدارس دینیہ کی بقاء کا انحصار ہے، آج ہندوستان میں مدارس کا جو جال بکھرا ہوا ہے وہ اسی امام کی عبقری فکر کا پرتو ہے، آپ عظیم متکلم اسلام تھے، آپ کے زمانے میں ہندو پنڈتوں اور عیسائی پادریوں نے اپنے اپنے مذاہب کی برتری اور تفوق کے راگ الاپنے شروع کر دیے، وہ جگہ جگہ جارحانہ تقریریں کرتے اور علمائے اسلام کو چیلنج دیتے، آپ نے میلہ خدا شناسی اور مناظرہ رُڑکی میں پنڈتوں اور پادریوں کے دانت کھٹے کر ڈالے پھر تو یہ ہوا کہ آپ کی آمد کی خبر ہی، پنڈتوں اور پادریوں پر بجلی بن کر گرتی اور وہ راہ فرار اختیار کرنے ہی میں عافیت سمجھتے، آپ نے جنگ آزادی میں شرکت کی، شاملی کے معرکہ میں آپ کمانڈر ان چیف رہے۔

آپ نے عقد بیوگان کی ترویج کی بھی تحریک چلائی، ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں زندگی کی ۴۹ بہاریں، خزاں رسیدہ ملت اسلامیہ پر نثار کرنے کے بعد، اسلام کا یہ عظیم سپوت قبرستان قاسمی میں ہمیشہ کے لیے آسودہ خواب ہو گیا۔

۳- حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ

حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ، استاذ الاساتذہ مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے صاحب زادے تھے، اور حضرت نانوتویؒ کے تقریباً ہم عمر تھے، یہ بھی دہلی میں اپنے والد سے حضرت نانوتویؒ کے ساتھ پڑھتے تھے، بڑے جید عالم تھے، فراغت کے بعد انہوں نے مختلف مقامات پر تدریسی خدمات انجام دیں، جب دارالعلوم قائم ہوا اور اساتذہ کی تعداد بڑھی تو آپ کو سب سے پہلے صدر مدرس منتخب کیا گیا، پھر تا زندگی اس منصب عظیم پر فائز رہے، بھوپال کے وزیر اعظم مولوی محمد جمال الدین

نے بڑی مشاہرہ پر طلب بھی فرمایا مگر دار العلوم سے ترک تعلق گوارہ نہیں کیا، آپ کے ممتاز تلامذہ میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ، حضرت شیخ الہندؒ، مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ، خصوصیت سے لائق ذکر ہیں ربیع الاول ۱۳۹۲ھ مطابق جنوری ۱۸۸۵ء میں آپ کی وفات ہوئی[1]۔

۴-مولانا محمد مظہر نانوتویؒ

حضرت نانوتویؒ کے خاندان کے ممتاز عالم دین، والد کا نام حافظ لطف علی، آپ کی ولادت نانوتہ میں ہوئی، بچپن یہیں گزرا، ابتدائی تعلیم بھی یہیں حاصل کی پھر شوق علم نے دہلی کی راہ دکھائی، جہاں علم وفن کے آفتاب شباب پر تھے، علوم وفنون کی مروجہ تمام کتابیں مولانا مملوک علی نانوتویؒ اور مفتی صدر الدین صدر الصدور سے پڑھیں، حدیث میں شیخ رشید الدین خاں اور شاہ محمد اسحاقؒ محدث دہلوی کی شاگردی اختیار کی، تعلیم سے فراغت کے بعد مطبع نولکشور میں تصحیح کتب کی ملازمت اختیار کی، پھر ترک ملازمت کر کے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور آگئے، یہ مدرسہ ابھی ابتدائی مرحلے میں تھا، اسے سہارنپور کے ایک بزرگ مولانا سعادت علی سہارنپوریؒ نے قائم کیا تھا، اور اس کا نام صرف مدرسہ عربیہ تھا، اس مدرسہ کی ترقی اور عالمگیر شہرت، حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ کے ہاتھوں پر مقدر تھی، آپ نے اپنی شب وروز محنت کے ذریعہ مدرسہ کو خوب ترقی دی، معیار تعلیم بلند ہوا، طلبہ کا رجوع بڑھ گیا، ارباب انتظام نے اعتراف خدمات کے طور پر، مدرسہ کو آپ کی ذات کی طرف منسوب کر دیا اور اس کا نام ''مظاہر علوم'' رکھا گیا، آپ مظاہر علوم میں ۱۲۸۳ھ میں مسند صدارت پر فائز ہوئے، اور پھر تاحیات اسی منصب عظیم پر فائز رہے، ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ ستمبر ۱۸۸۵ء میں ستر سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔

---

[1] آثار الصنادید سر سید احمد خان: ص ۵۷۸۔

۵-احسن العلماء مولانا محمد احسن نانوتویؒ

جید عالم دین، علوم وفنون کے ماہر، اسرار شریعت سے واقف، کوچۂ تصوف سے بھی آشنا، مایۂ ناز کتابوں کے مترجم اور شارح، حضرت مولانا محمد احسن نانوتویؒ، مولانا محمد مظہر نانوتویؒ کے حقیقی بھائی تھے، ولادت اور نشو ونما نانوتہ میں ہوئی، یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کر کے دہلی چلے گئے، مولانا مملوک علیؒ اور دوسرے بعض علماء سے تعلیم حاصل کی، حدیث میں حضرت شیخ عبدالغنی مجددیؒ سے شرف تلمذ تھا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ بریلی کالج میں استاذ ہوکر بریلی چلے گئے، اور عرصۂ دراز تک وہیں رہے، ۱۲۸۳ھ-۱۸۶۶ء میں حج کیلئے تشریف لے گئے، آپ کے شیخ شاہ عبدالغنی مجددیؒ ہجرت کر کے حجاز چلے گئے تھے اور مدینہ میں مقیم تھے، آپ نے ان سے بھرپور استفادہ کیا، اور حدیث کی کتابیں پڑھیں، حج سے واپسی کے بعد پھر اپنے منصب پر رہ کر تعلیم وتدریس کا کام شروع کردیا، مطالعہ بہت وسیع تھا، تصوف کا رنگ خاندانی تھا، جو حضرت شیخ مجددیؒ کی صحبت میں اور نکھر گیا تھا، تصنیفی ذوق بھی بڑا بلند تھا، امام غزالی کی مشہور کتاب ''احیاء العلوم'' کا مذاق العارفین کے نام سے ترجمہ کیا، فقہ کی مشہور کتاب کنز الدقائق کا ترجمہ ''احسن المسائل'' کے نام سے کیا، غایۃ الاوطار کا تکملہ لکھا، درمختار کو اردو میں منتقل کیا ''احسن البضاعۃ فی مسائل الرضاعۃ'' نام سے ایک کتاب تصنیف کی، شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء کی تصحیح کی اور ان پر حاشیہ لکھا، اور اپنے مطبع صدیقیہ سے شائع کیا، آپ کی وفات شعبان ۱۳۰۱ھ-مئی ۱۸۸۴ء میں ہوئی۔

۶-مولانا محمد منیر نانوتویؒ

آپ کی ولادت نانوتہ میں ۱۲۴۷ھ ۱۸۳۱ء میں ہوئی، نانوتہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کر کے دہلی چلے گئے اور وہاں متعدد اساتذہ سے علوم وفنون کی کتابیں

پڑھیں، تکمیل تعلیم کے بعد آپ نانوتہ آگئے، آپ نانوتہ ہی میں مقیم تھے کہ ۱۸۵۷ء کا حادثہ وقوع پذیر ہوگیا، آپ نے حاجی امداداللہ تھانویؒ، حافظ ضامن شہیدؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور دوسرے اکابر کے ساتھ جہاد میں عملی طور پر حصہ لیا، جب ہنگامہ فرو ہوا، اور حالات پرسکون ہوئے تو آپ بریلی چلے گئے، جہاں آپ کے بڑے بھائی مولانا احسن نانوتویؒ ایک کالج میں استاذ تھے، آخر میں آپ بریلی سے ملازمت ترک کر کے وطن آئے تو دارالعلوم میں مہتمم کی جگہ خالی تھی، ارباب شوری نے آپ کو بلا کر دارالعلوم کا مہتمم بنا دیا، آپ دو سال اس منصب پر رہے، آپ حضرت گنگوہیؒ سے بیعت تھے، اور آپ کے خلیفہ مجاز بھی، ۱۳۰۲ھ-1885 میں وفات ہوئی[1]۔

یہ قصبہ نانوتہ کی چند سدا بہار شخصیات ہیں جن کا علمی وفکری فیضان، تمام حدود وقیود سے بالا ہے، ان شہ دماغ شخصیات اوران کے لازوال کارناموں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ آخری دور میں جب انحطاط، زوال، جہالت ذلت ونکبت امت مسلمہ کی تقدیر بن چکی تھی، اس کے سیاسی بازو کاندھے سے اتارے جاچکے تھے، اور امت جہالت وذلت کی بیساکھی پر، بے سمت وبے منزل گامزن تھی، اس وقت نانوتہ ہی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اس کے مایۂ ناز فرزندوں نے امت کی پلکوں سے غفلت کی دبیز چادریں اتاریں، مشکل حالات میں عزت کے ساتھ زندہ رہنے کا فن بتایا، اور علم وفن کے وہ چشمے جاری کیے، جوامت کے ہر طبقہ کو آمدِ بہار کی نوید سنا گئے۔

ہندوستان میں سرسید احمد خاں کو، مسلمانوں میں عصری علوم کی ترویج واشاعت کا بانی سمجھا جاتا ہے؛ لیکن یہ بات کم لوگ جانتے ہیں کہ سرسید کے شہپرِ فکر کو یہ بلند پروازی، نانوتہ ہی کے ایک عظیم مفکر وعالم دین حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے خوانِ علم کی ریزہ چینی سے حاصل ہوئی ہے۔

---

[1] حضرت نانوتویؒ: حیات اور کارنامے: ص ۳۶۔

جہاں تک ہندوستان میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے سب سے نمایاں رہبر، حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کی بات ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے شاگرد ہیں؛ بلکہ گلستان نانوتہ ہی کے وہ گل سرسبد ہیں، جن کے کارناموں کی خوشبو سے سارا چمن زعفران زار ہے۔ انہیں گوناگوں خصوصیات وامتیازات کی وجہ سے ہندوستان کے شہروں اور قصبوں کے طویل حلقے ہیں، نانوتہ کی حیثیت انگوٹھی کے آبدار نگینے کی ہوگئی ہے۔

[1] حضرت نانوتوی: حیات اور کارنامے: ص ۳۹۔

باب دوم

ولادت، بچپن اور تعلیم

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کی ولادت نانوتہ ضلع سہارنپور میں ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء میں، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے گھر ہوئی، یہ نورِ نظر بڑی آرزوؤں اور تمناؤں کے بعد حاصل ہوا تھا، ابتداءً حضرت نانوتویؒ کے یہاں کئی صاحبزادیاں پیدا ہوئیں، حضرت نانوتویؒ کے والد صاحب شیخ اسد علی مرحوم کولڑکے کی بڑی تمنا تھی، پانچ لڑکیوں کے بعد ۱۲۷۹ھ میں پہلے صاحبزادے حضرت مولانا محمد احمد صاحب پیدا ہوئے، جب دادا کولڑکے کے تولد کی اطلاع دی گئی تو خوشی میں گیہوں کی کوٹھی کا منہ کھلوادیا اور قصبہ نانوتہ کے فقراء میں کافی خیرات تقسیم کی اور خوشی منائی[1]۔

آپ کے والد ماجد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ہیں، آپ کی والدہ ماجدہ، دیوبند کے مشہور رئیس شیخ کرامت حسین عثمانی کی بڑی صاحبزادی تھیں، بڑی صابرہ شاکرہ خاتون تھیں، نامور باپ نے جہیز خوب دیا تھا، پہلی شب میں حضرت نانوتویؒ نے فرمایا: میں کون ہوں اور تم کون؟ میری سنوگی یا اپنی سنواؤ گی؟ بے تکلف عرض کیا: میں تو آپ کی کنیز ہوں، اپنی منوانے کا کیا سوال، فرمایا: اگر یہ

---

[1] پچاس مثالی شخصیات: ص ۸۵۔

بات ہے تو اپنا تمام زیور اتار کر ہمیں دے دو، بلا تامل حکم کی تعمیل کی، صبح کو یہ سب زیور اور جہیز دار العلوم کے سرمایہ میں شریک کر دیا گیا، باپ نے دوبارہ دیا، پھر یہی معاملہ کیا، مہمان نواز اس درجہ کی تھیں کہ خود حضرت نانوتویؒ فرماتے: ہماری میز بانی تو احمد کی اماں کی مرہون منت ہے۔[۱]

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ "سوانح عمری" میں حضرت نانوتویؒ کی اہلیہ کا حال ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "وہ ایسی تابعدار تھیں کی والدین کی خدمات میں جو مشقت اٹھائی مولوی صاحب کی مزاج داری، ان کے علاوہ برآن ہوئی، اور والدین کی رضا کیلئے جب ناخوش ہوتے تو ان کو ہی کچھ کہہ لیتے، آخر میں ان کے بڑے شکر گزار رہے، اور اللہ جل شانہ نے بہت کچھ عنایت فرمایا، جو کچھ فتوح ہوتی، ان کے حوالہ کر دیتے، وہ اللہ کی بندی خدا سلامت رکھے، ایسی سخی اور دست کشادہ ہیں کہ جناب مولوی صاحب کی مہمانداری کو اسی کے باعث رونق تھی، کبھی یاد نہیں کہ کسی وقت کوئی آ گیا ہو اور گھر میں کھانا نہ ہو؛ بلکہ خود فرماتے کہ ہماری سخاوت، احمد کی والدہ کی بدولت ہے، جو میں قصد کرتا ہوں وہ مہمان نوازی میں اس سے بڑھ کر کرتی ہے۔[۲]

پورے دیوبند میں آپ "دادی بو" کے نام سے معروف تھیں، صوم وصلوۃ کی بے پناہ پابند تھیں، حضرت گنگوہیؒ سے مرشدانہ تعلق تھا، بڑی دعاؤں کے بعد پوتا قاری محمد طیبؒ پیدا ہوئے، جب گڈلیوں چلنے لگے تو ایک دن تیل سے بھرا ہوا کنستر گرا دیا، دادی بو نے اس شوخی پر مٹھائی تقسیم کی۔[۳]

دادا شیخ اسد علی

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے دادا شیخ اسد علی تھے، جو اگرچہ

---

۱ لالۂ وگل: ص ۳۶۱۔ ۲ سوانح عمری: ص ۳۲۔

۳ لالۂ وگل: ص ۳۶۱۔

باضابطہ عالم دین نہیں تھے؛ لیکن تعلیم یافتہ انسان تھے، اس زمانہ میں ساری عدالتوں، سرکاری دفتروں اور محکموں میں فارسی زبان رائج تھی، فارسی کی بہترین صلاحیتوں پر سرکاری نوکریاں ملتی تھیں، اور فارسی کا نصاب ''شاہ نامۂ فردوسی'' تھا، جو آج کل کے بی. اے. کے برابر تھا، شیخ اسد علی کی تعلیم، شاہنامہ تک تھی، تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے بغرض تعلیم دہلی کا سفر کیا تھا، اگرچہ ان کے تعلیمی دور کی تفصیلات نہیں ملتی ہیں، مگر یہ صحیح ہے کہ انہوں نے ملازمت کے بجائے زراعت کو ترجیح دی، ان کا مستقل قیام نانوتہ میں رہا، کاشتکاری ذریعۂ معاش تھی[۱]۔

نانا شیخ کرامت حسین دیوبندی

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے نانا، شیخ کرامت حسین دیوبندی تھے، جن کا شمار دیوبند کے رؤساء میں ہوتا تھا، ہندوستان میں ان کے مورث اعلیٰ شیخ لطف اللہ، سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے دیوان تھے، آپ کا شاہانہ محل اس وقت محلہ دیوان کے نام سے مشہور تھا، جو دارالعلوم کی عمارت سے متصل تھا، شیخ کرامت حسین، حضرت نانوتویؒ کے خاندان کے نواسے تھے، بعد میں حضرت کے خسر ہوئے[۲]۔

شجرۂ نسب

حضرت نانوتویؒ کا سلسلۂ نسب ۴۴ رواسطوں سے قاسم ابن محمد ابی بکر صدیقؓ سے جا ملتا ہے، ہندوستان میں ان کے مورث اعلیٰ مولوی محمد ہاشم، بلخ سے وارد ہندوستان ہوئے اور اپنی صلاحیت وقابلیت کی وجہ سے دربار شاہی میں باریاب ہوکر عہدہ ومنصب حاصل کئے، آپ کو قصبۂ نانوتہ کی جاگیر شاہ جہاں کی طرف سے مرحمت ہوئی تھی مولوی محمد ہاشم تک شجرۂ نسب کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ حضرت نانوتوی: حیات اور کارنامے: ص ۱۴۱۔

۲۔ حضرت نانوتویؒ: حیات اور کارنامے: ص ۴۶۔
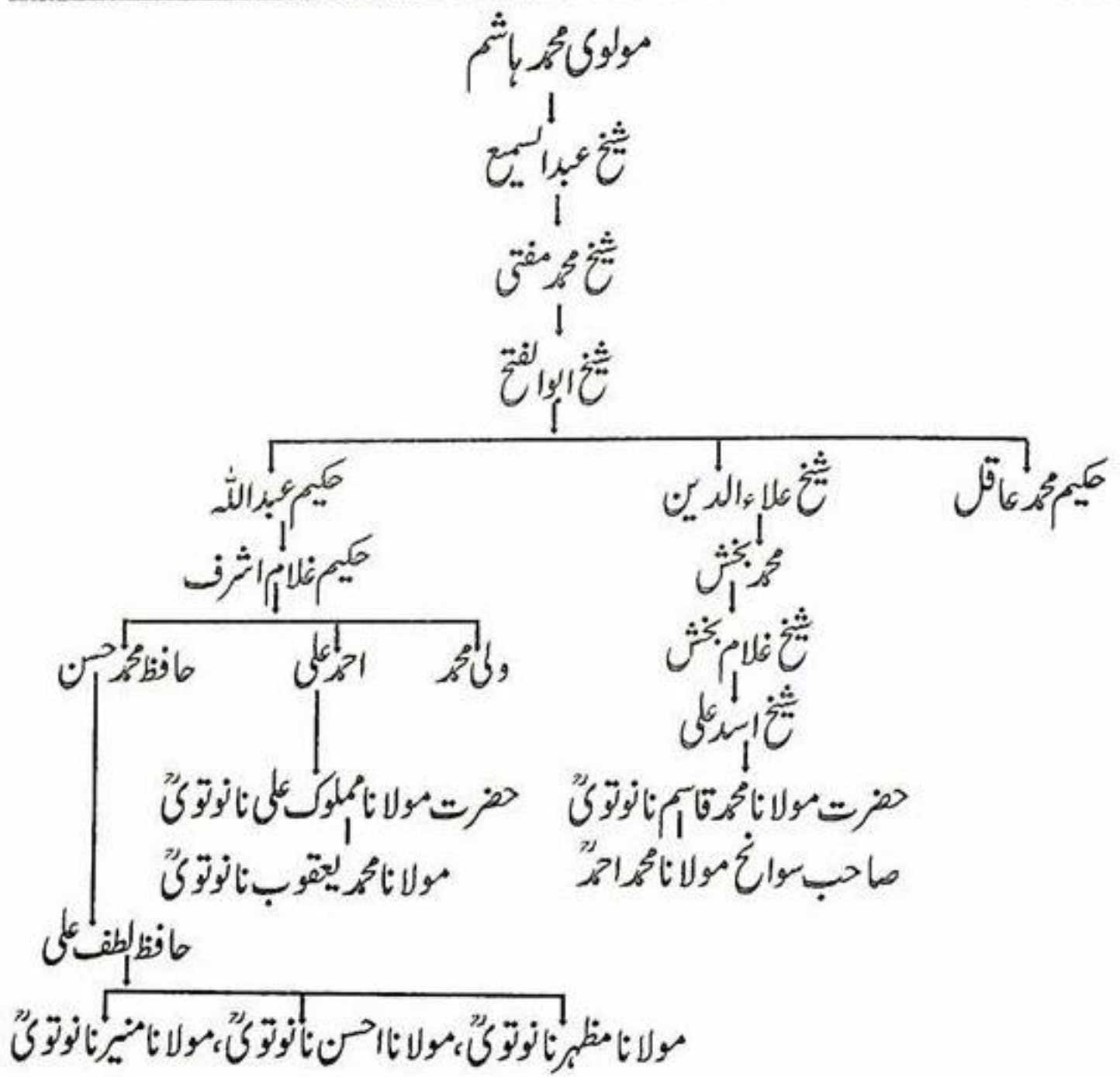
تعلیم وتربیت

حضرت نانوتویؒ جنہوں نے دیار ہند میں علم کی شمع، فروزاں کرنے کی تحریک چلائی، جن کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی ذلت وپستی کا مداوا، علم کے کارآمد تریاق سے ہی کیا جاسکتا ہے، آپ یہ عزم لیکر اٹھے کہ مسلمان کا کوئی گھر، علم کی روشنی سے محروم نہ رہے، اور آپ اور آپ کے جانشینوں نے بہت حد تک اس خواب کو شرمندۂ تعبیر بھی کر دیا، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس عبقری شخصیت نے ہر مسلمان بچہ کے لیے یہ سنہرے خواب دیکھے تھے، اس کے دل میں اپنے بچے کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے کیسے

جذبات امنڈ رہے ہوں گے، چناں چہ آپ نے حضرت مولانا محمد احمد صاحب کی تعلیم وتربیت میں کسی مصلحت کو آڑے آنے نہیں دیا، اور بچے کی تعلیمی یکسوئی کو شروع سے ہی نظر سے دور رکھا۔

تعلیم کا پہلا مرحلہ: (مکتبی تعلیم)

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کی عمر جب مکتب نشینی کے قابل ہوئی تو قصبہ رام پور میں جید حافظ قرآن جناب نور محمد صاحبؒ کے سامنے بٹھا دیا، والا تبار بچے کی ذہانت وفطانت اور مشفق استاذ کی توجہ نے جلد ہی رنگ دکھایا، اور اس خوشخبری نے حضرت نانوتویؒ کی آنکھیں ٹھنڈی کر دیں کہ ''احمد میاں'' نو سال کی عمر میں حافظ قرآن بن چکے ہیں، اس زمانہ میں مدرسہ کا کوئی باضابطہ انتظام نہیں تھا، نو سال کی عمر کو لوگ کھیلنے کودنے کی عمر ہی سمجھا کرتے تھے، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے اس کمسنی میں حفظ قرآن مکمل کرنے سے لوگ متعجب ہوئے اور کم عمری میں ہی آپ کو حافظ صاحب، حافظ صاحب کہہ کر پکارنے لگے، پھر تو بچپن میں لوگوں کے دیئے ہوئے اس مشفقانہ خطاب نے عمر بھر ساتھ نہ چھوڑا، آپ زندگی کے ہر مرحلے میں ''حافظ صاحب'' ہی رہے، آپ اس وقت بھی حافظ صاحب رہے، جب حضرت گنگوہیؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے ہوئے تھے۔ اور اس وقت بھی حافظ صاحب رہے، جب ملت اسلامیہ کی آبرو، دار العلوم دیوبند کے محافظ اور اس کے علمی وفکری کارناموں کے امین بنائے گئے، جس کی دہلیز پر حافظ تو کیا، شاہانِ عقل وخرد کے پتے بھی پانی ہو جاتے ہیں، اور اس وقت بھی حافظ صاحب رہے، جب ریاست دکن کے مفتیٔ اعظم بنائے گئے، جب آپ کی جنبش قلم سے برسوں کے الجھے ہوئے مسائل حل کئے جا رہے تھے، خیر حافظ صاحب بن کے جئے اور حافظ صاحب بن کر مرے۔ **حفظه الله من کل مکروه فی الآخرة۔**

تعلیم کی دوسری منزل (گلاؤٹھی میں)

حضرت نانوتویؒ اور آپ کے رفقاء جب ہندوستان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک لے کر اٹھے، تو آپ کا سب سے مؤثر ہتھیار اقامت مدارس ہی تھا، آپ مختلف دیہات اور قصبات کا دورہ کرتے جہاں روشنی کی کمی ہوتی وہیں مدرسہ کی شکل میں ایک چراغ جلا دیتے، آپ کے قائم کردہ یہ مدارس آپ کے اخلاص وللّٰہیت کی برکت سے ”بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی“ کا کام کرتے، اسی تناظر میں آپ نے گلاؤٹھی میں بھی ایک مدرسہ قائم فرمایا تھا، اس مدرسہ میں آپ کے شاگردوں اور خدام کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ جب حفظ قرآن سے فارغ ہوئے تو ابتدائی تعلیم کے لیے انہیں گلاؤٹھی بھیجا، اس زمانے میں وہاں حضرت کے بڑے داماد مولانا محمد عبداللہ صاحب انبہٹویؒ (جو بعد میں مسلم علی گڑھ یونیورسٹی کے ناظم دینیات ہوئے) اقامت پذیر تھے۔

مولانا عبداللہ انبیٹھوی، مولانا انصار علیؒ کے صاحبزادے تھے، ۱۲۶۷ھ میں پیدا ہوئے، حضرت نانوتویؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے علوم وفنون کی تحصیل کی، حدیث حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ سے پڑھی، ۱۲۸۷ھ میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے، حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت وارشاد کا تعلق قائم فرمایا، کچھ دنوں گلاؤٹھی کے مدرسہ میں خدمات انجام دیتے رہے پھر تقریباً نصف صدی تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں صدر شعبۂ دینیات کی حیثیت سے مقیم رہے، آپ نے علیگڑھ میں سر سید احمد خان کے زمانے میں ہی کام شروع کر دیا تھا، وہاں آپ کو بڑی شہرت ملی[۱]۔

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے ابتدائی تعلیم گلاؤٹھی میں حاصل کی، آپ کتنے سال گلاؤٹھی میں رہے اور کن کن اساتذہ سے کسب فیض کیا، اس کی تفصیلات

---

[۱] قاسم العلوم: نورالحسن راشد کاندھلویؒ: ص ۲۲۴۔

تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتی ہے، حضرت حکیم الاسلام محمد طیب صاحبؒ نے ابتدائی تعلیم کا ذکر کیا ہے، اور ابتدائی تعلیم مدرسہ کے عرف میں فارسی اور اول عربی اور دوم عربی تک کی تعلیم کو کہا جاتا ہے، اور یہ تعلیم دو تین سال میں مکمل ہو جاتی ہے، اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ حضرت مولانا احمد صاحبؒ کا زمانہ دو یا تین سال کا ہوگا، اور عمر کے بارہویں سال میں آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کر لی تھی۔

تعلیم کی تیسری منزل (مراد آباد میں)

حضرت نانوتویؒ نے ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد اپنے نورِ نظر کو مدرسہ قاسم العلوم مسجد شاہی (جو آج دار العلوم شاہی مراد آباد کے نام سے دنیا میں مشہور ہے) بھیجا، یہ مدرسہ بھی حضرت ہی نے قائم فرمایا تھا۔

۱۲۹۷ھ کی روداد میں اس مدرسہ کا ذکر کچھ یوں کیا گیا ہے "مراد آباد ایک مشہور و معروف شہر ہے، وہاں کے غریب مسلمانوں نے حسب ایماء، حضرت نانوتویؒ عرصہ دو تین سال سے ایک مدرسہ اسلامی جاری کیا ہے، اگرچہ اوائل میں یہ کارخانہ بہت مختصر تھا، مگر ماشاء اللہ آج یہ مدرسہ اچھے عروج پر ہے اور یوماً فیوماً امید ترقی ہے، واقعی اس مدرسہ کے جملہ کارپردازان نہایت زیرک اور امانت دار و دیانت دار ہیں، خداوند تعالیٰ ان کی سعی میں برکت عطا فرمادے، اور اس کارخانے کو قائم رکھے، اور زیادہ تر ترقی بخشے۔ آمین اور اس کارخانے کی زیادہ ترقی و رونق کے سبب، مولوی میر احمد حسن صاحب شاگرد رشید حضرت مولانا مولوی محمد قاسم صاحب، جو مدرس اول اس مدرسے کے ہیں، ان کے اخلاق حمیدہ سے وہاں کے جملہ مسلمانان کمال درجہ خوش ہیں، مہتمم اس مدرسے کے مرزا نبی بیگ ہیں، اور نیز چند وجوہ سے اس مدرسہ کو ہم اپنا ہی مدرسہ سمجھتے ہیں اور اس کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں، اللھم زد فزد[1]۔

---

[1] طبع اول: ص ۶۳/۶۱ بحوالہ تاریخ دار العلوم دیوبند جلد اول ص: ۲۰۷۔

اس مدرسہ میں حضرت نانوتویؒ کے شاگرد رشید اور آپ کے علوم و معارف کے امین حضرت مولانا احمد حسن امروہویؒ حضرت نانوتویؒ کے حکم سے تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے پوری تندہی اور یکسوئی کے ساتھ مراد آباد میں، علوم وفنون کی مختلف کتابیں پڑھیں، اسی دوران حضرت نانوتویؒ نے اپنے نورِ نظر کو خاص انداز سے پڑھانے کا ارادہ فرمایا اور حضرت محمد احمد صاحبؒ کو مراد آباد سے دیو بند بلالیا۔

ایک قابل ذکر واقعہ

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ جب مراد آباد سے رخصت ہو رہے تھے، تو وہ منظر عجیب وغریب تھا، مدرسہ شاہی مراد آباد کے تمام مدرسین بالخصوص حضرت مولانا احمد حسن امروہوی صاحبؒ اسٹیشن تک پہونچے اور زار و قطار روتے ہوئے صاجزادے سے فرمایا: ہم لوگ آپ کا کوئی حق ادا نہیں کر سکے ہیں، اگر حضرت ہم خدام کے بارے میں آپ سے کچھ پوچھیں تو آپ خدا کے لیے کلمۂ خیر فرمادیں، مولانا محمد احمد صاحبؒ نے باچشم نم فرمایا: حضرت! آپ کیا فرما رہے ہیں، مجھے گھر سے زیادہ آپ حضرات نے راحت پہونچائی، اولاد کی طرح میری ہر طرح ناز برداری کی، اگر میں حضرت سے آپ حضرات کی نسبت کلمۂ خیر کہوں گا تو وہ خلاف واقعہ اور محض آپ کی دلداری کے لئے نہ ہوگا؛ بلکہ حقیقت واقعہ ظاہر کرنے کے لیے ہوگا، چناں چہ یہی ہوا کہ حضرت اقدس نے صاجزادے کو تنہائی میں لے جا کر دریافت کیا کہ مراد آباد کے لوگوں نے تیرے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ عرض کیا کہ انتہائی راحت اور انتہائی ناز برداری کے ساتھ مجھے رکھا، فرمایا: الحمد للہ! مجھے ان حضرات سے یہی توقع تھی۔[۱]

یہ واقعہ جس قدر دلچسپ ہے، اسی قدر سبق آموز بھی ہے، سلف کی علمی گہرائی

---

۱ پچاس مثالی شخصیات: ص: ۸۷-۸۶۔

اور بے نظیر مقبولیت کا راز یہی تھا کہ وہ اپنے اساتذہ یہاں تک کہ ان کے خانوادے کا غیر معمولی ادب کرتے تھے، مولانا محمد احمد صاحبؒ مراد آباد میں اندازہ یہی ہے کہ تین یا چار سال رہے، اور حضرت مولانا احمد حسن امروہویؒ کے فیض صحبت میں علوم وفنون کی مشکل وادیاں طے کیں۔

تعلیم کی چوتھی منزل (دیوبند میں)

حضرت نانوتویؒ کی تمنا یہ تھی کے اب اپنی خاص توجہ سے مولانا محمد احمدؒ کی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا جائے، اور اسی لیے مراد آباد سے دیوبند بلالیا، مگر حضرت نانوتویؒ کی وفات کا زمانہ قریب آچکا تھا، سفر حج کی تیاریاں تھیں، اور اسی سفر میں مرض موت شروع ہوگیا، اس لیے جس خصوصی تعلیم کے لئے صاحبزادۂ محترم کو بلایا تھا، وہ خود نہیں دے سکے، البتہ مولانا محمد احمد صاحبؒ نے اپنی بقیہ تعلیم دارالعلوم دیوبند میں پوری کی، متعدد کتابیں بالخصوص معقولات اور عربی زبان وادب کی اونچی کتابیں حضرت شیخ الہندؒ سے پڑھیں، حضرت شیخ الہندؒ نے پوری محنت وتوجہ سے اس سونا کو کندن بنایا، اور علمی، فکری اور انتظامی طور پر ایسی توانائی بخشی کہ آنے والے دنوں میں کوئی شورش، کوئی طوفان، حضرت مولانا احمد صاحبؒ کے قدم کو ڈگمگا نہیں سکے، آپ نے دارالعلوم سے ۱۳۰۰ھ میں فراغت حاصل کی، اس وقت آپ کی عمر تقریباً اکیس سال تھی۔

تکمیل حدیث

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت شیخ عبدالغنی مجددیؒ کے بحر علم کے دو ایسے آبدار موتی ہیں، جن کی چمک دمک سے ہزاروں تشنگان علوم کے دل منور ہوگئے، جب ان میں سے ایک (حضرت نانوتویؒ) کے پاس موت کا بلاوا آیا، اور صدفِ لحد نے اس یگانۂ روزگار موتی کو اپنی آغوش میں

لے لیا، تو طلبۂ علوم پروانہ وار دوسرے ''یتیمۃ الدھر'' موتی کی طرف ٹوٹ پڑے، دیوبند میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ شمع حدیث فروزاں کیے ہوئے تھے، مگر واسطہ کی کمی (جو ہر زمانے میں طالبانِ حدیث کا قیمتی مطلوب رہی ہے) طلبہ کو کشاں کشاں آستانۂ گنگوہی پر لے جاتی۔

ان ہی سعید طلبہ میں مولانا محمد احمد صاحبؒ بھی تھے، مولانا محمد احمد صاحبؒ نے تکمیل حدیث کیلئے ''گنگوہ'' کا سفر کیا، ایک دیرینہ رفیق اور ہمدم ودمساز کے فراق کے بعد، اس کی یادگار اور لائق فرزند کو دیکھ کر، حضرت گنگوہیؒ کے دل میں جو جذبات موجزن ہوتے ہوں گے، کون ہے جو اس کا صحیح اندازہ لگا سکے، حضرت گنگوہیؒ نے بڑی شفقت وعنایت کا معاملہ فرمایا اور اجازت حدیث دی۔

باب سوم

آپ کے مشہور اساتذہ

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ، فکر دیو بند کے عظیم ترجمان، حدیث وفقہ کا گنجینہ، علوم وفنون کے راز آشنا، اور بہت ساری خوبیوں کے پیکر تھے، ابتدا ہی میں اکابر دیو بند نے دار العلوم کے اہتمام کی عظیم ذمہ داری ان کے سپرد کر دی، اس وجہ سے ان کے علمی کارنامے منظر عام پر نہیں آسکے، آخر عمر میں نظام حیدر آباد نے پوری ریاست دکن کا ''صدر الصدور (مفتی اعظم)'' بنا دیا، اس زمانے میں آپ کے لکھے ہوئے فتاوی دستیاب ہوئے ہیں، جن سے فقہ اسلامی میں آپ کی مہارت، مصالح و مقاصد شریعت پر آپ کی مکمل دستگاہی نمایاں طور سے معلوم ہوتی ہے۔

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے تبحر علمی اور فقہ وشریعت میں بصیرت کے لیے آپ کے اساتذہ پر ایک نظر ڈال لینا کافی ہوگا، کیوں کہ یہ اساتذہ وہ ہیں، جو نہ صرف اپنی تدریسی مہارت اور بے پناہ خصوصیات میں عالمگیر شہرت رکھتے ہیں؛ بلکہ انہوں نے نسبی احترام کو پیش نظر رکھ کر، آپ کے ساتھ بہت ہی شفقت، عنایت اور توجہ کا معاملہ فرمایا، ان اساتذہ کی شان بقول شاعر یہ تھی

دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

دوسری طرف حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کا طائر پرواز بھی، شوقِ طلب میں، آفاق کی بلندیوں پر تھا۔

"سوانح عمری" کے مصنف حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جناب مولوی صاحب نے دو صاحبزادے چھوڑے، ایک میاں احمد، جس کی عمر اٹھارہ برس کی ہے، شادی ہوگئی ہے، طلب علمی میں مصروف ہیں بحمد اللہ، طبیعت تیز مزاج سنجیدہ ہے"[۱]۔

ایک طرف طلب، شعلۂ جوالہ بن کر، دل کی انگیٹھی میں سلگ رہی ہو، اور دوسری طرف افادہ کے لیے اساتذہ، بصد شوق آمادہ ہوں، تو اندازہ کیجئے کہ اس کارخانے میں کون سا علمی کندن تیار ہوگا، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ اسی علمی کندن کا مجسمہ تھے۔

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے طلب علم کی آخری منزل، آستانۂ گنگوہی ہی تھی، یہیں آپ نے علم حدیث کی تکمیل کی، ویسے تو حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے سب سے آخر میں گنگوہ کا رختِ سفر باندھا، مگر آپ پر سب سے زیادہ اثر حضرت گنگوہی کا تھا، مشہور ہے کہ مسلک دیو بند اپنے اصول ومبادی میں علوم نانوتویؒ، اور فروع میں، علوم گنگوہیؒ کا دل آویز مجموعہ ہے۔

یہ گنگوہیؒ شان، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ پر پوری زندگی نمایاں رہی، حضرت گنگوہیؒ ۶ر ذیقعدہ ۱۲۴۴ھ کو دوشنبہ کے دن گنگوہ میں پیدا ہوئے، حفظ قرآن کریم، فارسی اور صرف ونحو کی ابتدائی تعلیم کے حصول بعد، اعلیٰ تعلیم کے لیے

---

[۱] سوانح عمری، ص: ۳۲۔

انہوں نے دہلی کا سفر کیا، اور وہاں استاذ الاساتذۃ حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، یہیں حضرت نانوتویؒ سے شناسائی ہوئی اور یہ رفاقت اسلامیان ہند کی تاریخ کے لئے انقلابی تبدیلی کا سبب بنی، حضرت گنگوہیؒ نے حضرت نانوتویؒ کے ساتھ، حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ کی خدمت میں حدیث کی تکمیل کی، پھر دونوں ساتھ ہی حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت ہوئے، حضرت گنگوہیؒ نے دہلی سے واپسی کے بعد، حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے حجرے کو زینت بخشی، اور اسے اپنی قیام گاہ بنایا، اور وہیں سے خدمت علوم دینیہ کے شیریں چشمے جاری کیے۔

۱۸۵۷ء، میں خانقاہ قدوسی سے مردانہ وار نکل کر انگریزوں کے خلاف شاملی کے معرکۂ جہاد میں صف آرا ہو گئے اور اپنے شیخ حضرت حاجی صاحبؒ اور اپنے عظیم رفقاء کے ساتھ، خوب دادِ شجاعت دی، معرکۂ شاملی کے بعد گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوا، اور ان کو گرفتار کر کے سہارنپور کی جیل میں بھیج دیا گیا، جیل میں آپ نے دعوتِ دین کے کام کو جاری رکھا، اور بہت سے قیدی مسلمان ہو گئے، اور جماعت کے ساتھ جیل میں نماز ہونے لگی، آپ دینی غیرت وحمیت، راست گوئی، پاکی وپاکبازی، فقہی بصیرت، دینی پختگی، بدعات کی تردید اور سنت کی اتباع میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔

۱۲۹۷ھ میں حضرت نانوتویؒ کی وفات کے بعد دارالعلوم دیوبند کے سرپرست ہوئے، اور تاحیات اپنی صائب فکر سے دارالعلوم کی سرپرستی فرماتے رہے۔
۸/۹ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء بروز جمعہ علم وفن کا یہ ماہتاب گنگوہ کے افق پر غروب ہو گیا، رحمه الله رحمة واسعة۔

حضرت گنگوہیؒ کے انداز تدریس کی خاص خوبی یہ تھی کی وہ اپنے شاگردوں میں علم کے ساتھ، عمل کا جذبہ بھی پیدا کرتے تھے، حضرت گنگوہیؒ خود اعلیٰ درجہ کے متبع سنت تھے، اور اپنے شاگردوں کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ آستانۂ گنگوہی سے اتباع سنت کا ایسا وافر جذبہ لے کر اٹھے، جو زندگی کے

کسی مقام پر ان سے الگ نہیں ہوا۔

سید العلماء حضرت مولانا احمد حسن امروہویؒ

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے قابل قدر استاذ تھے، آپ ہی کے یہاں انہوں نے علوم وفنون کی تکمیل کی۔

آپ کی ولادت ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۸۵۰ء میں امروہہ کے مشہور خاندان، ساداتِ رضویہ میں ہوئی، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کی، پھر حضرت نانوتویؒ کی خدمت میں پہونچے، اور معقولات ومنقولات کی تمام بڑی کتابیں، نیز صحاح ستہ حضرت نانوتویؒ سے پڑھیں، اور ۱۲۹۴ھ میں فراغت حاصل کی، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت وخلافت حاصل تھی۔

فارغ التحصیل ہونے کی بعد مختلف مدارس میں پڑھایا، جب ۱۲۹۶ھ میں مرادآباد میں حضرت نانوتویؒ کے حکم سے مدرسہ شاہی قائم ہوا تو اس کے صدر مدرس بنائے گئے، ۱۳۰۳ھ میں مستعفی ہو کر امروہہ گئے اور وہاں ایک پرانے مدرسہ کی تشکیل جدید کی جو آج تک قائم ہے، آپ حضرت نانوتویؒ کے مخصوص تلامذۃ میں تھے، اور جلیل القدر محدث تھے، آپ کو علوم قاسمیہ کا امین سمجھا جاتا ہے، آپ نے فکر نانوتویؒ کی ترویج میں زندگی بھر حصہ لیا، حضرت نانوتویؒ بھی آپ کے ساتھ بے حد شفقت فرماتے تھے، آپ کو احترام سے ہمیشہ ''میر صاحب'' کہہ کر پکارتے تھے، حضرت نانوتویؒ خود فرماتے تھے، ان کا ذھن چاندی ہے اور میرا ذھن سونا ہے، اور مزاج کے اعتبار سے وہ مجھ سے زیادہ قریب ہیں، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے تھے:

> ''حضرت محدث امروہویؒ کو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے تمام علوم وکمالات کا آئینہ دار اور نمونہ کہا جائے گا تو بے جا نہ ہوگا''[۱]۔

آپ نے بہت سے مناظرہ میں شرکت کی، مناظرہ اور تقریر میں وہی قاسمی

---

[۱] دیکھئے، تاریخ دار العلوم ۱/۱۴۱۔

رنگ نمایاں رہتا تھا، آپ نے ساری زندگی درس وتدریس اور تبلیغ واصلاح میں گزاری، ۲۸-۲۹ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ کی درمیانی شب میں طاعون کے مرض میں جان جانِ آفرین کے سپرد کردی، نماز جنازہ حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ ہی نے پڑھائی، جامع مسجد امروہہ کے صحن کے جنوبی گوشے میں مدفون ہیں۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے جن اساتذہ کا اثر سب سے زیادہ قبول کیا اور جو دارالعلوم کی روح ومزاج کو سمجھنے میں ان کے لیے بہترین معاون بنے وہ حضرت شیخ الہندؒ کی ذات والاصفات تھی، حضرت شیخ الہندؒ دارالعلوم کے وہ مایۂ ناز فرزند ہیں، جنہوں نے تحریک دیوبند کو پوری دنیا میں پھیلادیا، حدیث وفقہ کی خدمت ہو، یا جہاد آزادی ہو، رجال سازی کا میدان ہو یا فرق باطلہ کی تردید کا مسئلہ ہو، حضرت شیخ الہندؒ کی جامع الکمالات ذات نے ہر میدان میں اپنی انفرادیت منوائی، ہندوستان میں خدمت دین کے کسی بھی گوشے کی جب بھی تاریخ رقم ہوگی تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی ذات، اور آپ کی خدمات کا سنہرے حروف میں تذکرہ ہوگا۔

حضرت شیخ الہندؒ بانیانِ دارالعلوم کے بعد، دارالعلوم کا اصولی وفروعی مذاق اوراس کے امتیازات کوسب سے زیادہ سمجھتے تھے، آپ اپنے استاذ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے صحیح جانشین تھے، آپ کے والد ماجد حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ، دارالعلوم کی بنیاد میں شریک تھے، تحریک دارالعلوم کی یہی وہ خصوصیات اور امتیازات ہیں، جو حضرت شیخ الہندؒ اپنے شاگردوں میں تقسیم فرمایا کرتے تھے۔

ذہن میں رکھئے کہ حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ جب مرادآباد میں سید العلماء حضرت مولانا احمد حسن امروہویؒ کے پاس علوم عالیہ کی تکمیل کررہے تھے تو والد

ماجد الامام محمد قاسم نانوتویؒ نے، خصوصی تعلیم وتربیت کے لئے مولانا کو مرادآباد سے دیوبند بلالیا تھا، اور اس سے پہلے کہ حضرت الامام، اس جانب متوجہ ہوتے، آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

ظاہر ہے یہ بات حضرت شیخ الہندؒ سے پوشیدہ نہیں تھی، حضرت شیخ الہندؒ نے، اپنے سرمایۂ افتخار استاذ کی تمناؤں کی تکمیل کے لیے، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کی فکری اور علمی تربیت پر جو محنت کی ہوگی، وہ بیان سے باہر ہے، تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کا خمیرِ علم وفن، فکر دیوبند کی دونوں بنیادوں (حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ) سے تیار ہوا تھا، اور آپ دونوں بزرگوں کی اولاد واحفاد سے بھی انتہائی نیازمندانہ تعلق رکھا کرتے تھے، اس سلسلے میں کئی واقعے قابل ذکر ہیں؛ لیکن تھوڑے سے غور وفکر کے بعد یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ نیازمندی برائے نیازمندی نہیں تھی؛ بلکہ اس نیازمندی میں تعلیم وتربیت کا پورا سامان ہوا کرتا تھا، وہ شفقت ومحبت کے ساتھ آباء کی عظمتوں اور فکری حدود داربعہ کا ابناء کو وارث بنایا کرتے تھے، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نقل کرتے ہیں کہ:

> ''حضرت شیخ الہندؒ کے مالٹا سے آنے کے بعد حضرت کی مردانہ نشست کے سامنے کے کمرے میں بند کواڑ کھول کر میں اچانک داخل ہوا، تو یہ منظر دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا، کہ دونوں مخدوم زادے ابن قاسم مولانا محمد احمد صاحبؒ اور ابن رشید حضرت حکیم مسعود احمد صاحبؒ گنگوہی، تخت پر ہیں اور حضرت شیخ الہند، ان دونوں کے سامنے باادب بیٹھے ہیں اور رو رہے ہیں، اور انتہائی نیازمندی سے کہہ رہے ہیں کہ میں نے آپ دونوں کا کوئی حق ادا نہیں کیا، اب میرے مرنے کا وقت ہے اور دونوں بزرگوں (حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ) کو منہ دکھانا ہے تو میں انہیں ان کے صاحبزادوں کے بارے میں کیا جواب دوں گا؟![1]

---

[1] دارالعلوم کی پچاس مثالی شخصیات: ص/۹۔

کیا یہ صرف نیاز مندی ہے؟ نیاز مندی تو ہو رہی ہے پھر آخر اپنے اساتذہ سے ملاقات میں خوف کس بات کا؟ دراصل مسئلہ، فکری اور علمی میراث کی تقسیم کا ہے، استاذ کا حق یہی تھا کہ وہ علمی اور فکری امانتیں، جو حضرت شیخ الہندؒ کو اپنے اساتذہ سے ملی تھیں، انہیں پوری توجہ کے ساتھ، ابنائے دارالعلوم، بالخصوص ان کی اولاد واحفاد، کے حوالے کر دیا جائے، حضرت شیخ الہندؒ کو اسی کا ڈر تھا کہ معلوم نہیں، وہ اس میں کتنے کامیاب ہوئے ہیں، اس انداز تربیت پر، مندرجہ ذیل واقعہ سے بھی روشنی پڑتی ہے، جسے حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ نے لکھا ہے:

''مالٹا سے تشریف آوری کے بعد، میرے والدؒ حضرت محمد احمد صاحبؒ نے حضرت شیخ الہندؒ سے فرمایا کہ حضرت! ان دونوں بچوں (محمد طیب اور محمد طاہر) کو بیعت فرمالیجئے، فرمایا: بھائی احمد! میں تو ان سے بیعت جہاد لوں گا، والد نے فرمایا: آپ میری طرف سے ان کے سر کٹوا دیجئے، اس میں مجھ سے کیا پوچھنا ہے، آپ جانیں اور آپ کی اولاد جانے، اور پھر فرمایا کہ لوگ مجھے کہتے ہیں کہ یہ بڑا ہوشیار ہے، دونوں بزرگوں (حضرت گنگوہیؒ اور حضرت نانوتویؒ) کے دو ہی صاحبزادے ہیں (مولانا مسعود احمد گنگوہیؒ اور مولانا احمد صاحبؒ) اس نے ان دونوں پر پہلے ہی قبضہ جما رکھا ہے، اب اگر ان بچوں کو بھی بیعت کر لیا تو کہیں گے کہ دیکھو، اس نے آگے بھی قبضہ رکھنے کی داغ بیل ڈال دی ہے، دو دنوں کے بعد اچانک خود ہی دارالعلوم میں تشریف لا کر مجھے اور طاہر مرحوم کو بلا یا، ہمارے ذہن میں بھی نہیں رہا تھا کہ ہمیں بیعت بھی ہونا ہے، میں نے عرض کیا: حضرت! کیوں یاد فرمایا ہے؟ فرمایا: مرید بھی کرنا ہے، اس وقت ندامت سی ہوئی کہ اس کے لیے ہمیں خود حاضر ہونا تھا؛ لیکن یہاں قصہ برعکس ہو رہا ہے[1]۔

---

[1] دارالعلوم دیوبند کی پچاس مثالی شخصیت: ص ۶۷۔

اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ، نیاز مندی کے در پردہ، اس خانوادہ کی علمی وفکری تربیت فرمایا کرتے تھے، خلاصہ یہ ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کو جہاں علوم وفنون سے آراستہ کیا، وہیں تحریک دیوبند کے اغراض ومقاصد خصوصیات اور امتیازات سے بہرہ ور کیا، تربیت کی یہی وہ روشنی تھی کہ حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ، دارالعلوم دیوبند کے اہتمام کی عظیم ذمہ داری، پورے ۳۵ رسال تک اس کامیابی کے ساتھ انجام دی، کہ اکابرین کی زبانیں صدائے آفریں بلند کرنے لگیں۔

باب چہارم

آپ کی تدریسی خدمات اور درسی خصوصیات

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے ۱۳۰۰ھ میں سند حدیث سے فراغت حاصل کی[1] اس وقت آپ کی عمر تقریباً اکیس سال تھی، فراغت کے بعد آپ نے تدریس کو ترجیح دی، سب سے پہلے، مدرسہ عربیہ تھانہ بھون پہونچے، جو حضرت نانوتویؒ کا ہی قائم کیا ہوا تھا، آپ نے وہاں بڑےتند ہی سے تدریسی خدمات انجام دیں، تھانہ بھون میں آپ تقریباً تین سال خدمات انجام دیتے رہے، ۱۳۰۳ھ میں وہاں سے دیو بند بلائے گئے، اور دار العلوم دیو بند میں مدرس ششم مقرر کیے گئے، تمام فنون کی کتابیں آپ سے متعلق تھیں؛ لیکن خصوصیت سے مشکوٰۃ شریف، مختصر المعانی، جلالین شریف، میر زاہد وغیرہ کتابوں کا درس بہت مشہور تھا[2]۔

آپ کا درس بہت مقبول تھا، آپ کے درس میں طلبہ کا رجوع بہت زیادہ ہوتا تھا، آپ انتہائی کامیاب مدرس تھے، اور کامیاب مدرس کی تمام خوبیوں سے آراستہ، علوم قاسمی پر عبور اور گہری نظر نے آپ کے اندر شرح صدر کی کیفیت پیدا کردی تھی، اور آپ علوم وفنون کی سنگلاخ وادیوں کو بآسانی طے کرلیتے تھے، اہتمام کی ذمہ داریوں نے آپ کے درسی خصوصیات پر پردہ ڈال دیا، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ تدریس

---

[1] مشاہیر علمائے دیو بند، ص: ۴۱/۴۰۔

[2] پچاس مثالی شخصیات، ص: ۸۷۔

ہی آپ کا شوق، اور کتابیں ہی آپ کا مشغلہ تھیں، آپ نے طویل عرصہ تک مسند اہتمام کو رونق بخشی؛ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ تدریس کا سلسلہ ایک دن کے لیے بھی موقوف نہ ہوا، آپ کا درس انتہائی مربوط، اور انداز دلنشیں ہوتا تھا، آپ کے شاگردوں کا اعتراف ہے کہ:

> ''درس حدیث میں جو تقریر بھی کسی معرکۃ الآراء حدیث پر فرماتے وہ باوجود مفصل ہونے کے اس درجہ دلنشیں ہوتی اور ان کے انداز تفہیم سے اس قدر دل میں اتر جاتی کہ اگر طالب علم بھلانے کا قصد بھی کرتا تب بھی وہ شاید اسے بھول نہیں سکتا تھا''[1]۔

ظاہر ہے کہ ایسا انداز درس، تبحر علمی، وسعت نظری اور بے پناہ تفہیمی صلاحیت کا منتہی ہے، آپ کے درس کی ایک بڑی خصوصیت قلبی تاثرات اور رقت انگیزی ہے، آپ کی درسی تقریر جامد اور خشک نہیں ہوا کرتی تھی؛ بلکہ جو بات بھی آپ کہتے تھے، دل سے کہتے تھے، اور طلبہ سمجھتے کہ یہ صرف زبان آرائی نہیں ہے؛ بلکہ دل کی اتھاہ گہرائی سے نکلنے والے کلمات ہیں جن میں سوز بھی ہے اور گداز بھی، حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ رقم طراز ہیں:

> ''تقریر نہایت مرتب، مبادی اور مقدمات پر مشتمل نتائج سے لبریز، اور ساتھ ہی قلبی تأثرات سے بھرپور ہوتی تھی، جو زبان وکلام کے راستے سے دل میں اثرات پیدا کرتی اور بیٹھ جاتی تھی مشکوٰۃ شریف، میں جب ''کتاب الجنائز'' آئی اور عالم برزخ کے حوادث وواقعات کی روایتیں گزریں تو حضرت ممدوح نے ایسے تأثر اور دردآمیز شوق کے ساتھ ان پر کلام فرمایا کہ گویا عالم برزخ ہماری نگاہوں کے سامنے تھا، اور اس وقت دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کے شوق کا ایک ایسا غلبہ قلوب میں محسوس ہوتا تھا کہ گویا ہم دنیا میں ہیں ہی نہیں۔

---

[1] پچاس مثالی شخصیات: ص: ۱۰۰-۱۰۱۔

درس کا ایک خاص انداز یہ تھا کہ افعال نبوی علی صاحبہ الصلاۃ والسلام کی جو روایتیں کسی ہیئت عمل پر مشتمل ہوتی تھیں، انھیں علمی طور پر سمجھانے کے بعد، ان کی عملی ہیئت بھی خود عمل کر کے اجاگر کیا کرتے تھے، صفتِ رکوع کی حدیث آتی تو درس ہی میں رکوع کر کے دکھلایا کرتے، سجدہ کی حدیث آتی تو سجدہ کر کے دکھلاتے، عقد انامل کی حدیث آتی تو انگلیوں سے عقود باندھ کر دکھلاتے ''رنۃ الحنانۃ'' کی حدیث آتی تو اس رفیق کی آواز بنا کر سناتے اور فرماتے کہ میں نے حدیث کے درس کے وقت یوں ہی اساتذہ کو کرتے ہوئے دیکھا تھا، مزید فرماتے: اگر اساتذہ حدیث اور محدثین، ہیئات عمل، یوں ہی کر کے دکھانے کا معمول نہ رکھتے تو آج کسی عمل کی کوئی مطلوب ہیئت تم لوگ محض الفاظِ کتاب سے متعین نہیں کر سکتے''[1]۔

ظاہر ہے اس قدر توجہ واہتمام وہی کر سکتا ہے جسے تدریس کے ساتھ لگاؤ ہی نہیں؛ بلکہ عشق ہو، اور طلبہ کے دل میں مضمون اتار دینے کی لگن پائی جاتی ہو۔

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ حدیث پڑھاتے وقت حدیث کی عظمت کو بھی سامنے رکھتے اور ساتھ ہی اپنے اساتذہ وشیوخ کے انتساب کی عظمت وحرمت کو قول وعمل سے واضح فرماتے، حضرت مولانا اپنی فراست ایمانی سے طلبہ کے ہجوم میں، جوہر قابل کا ادراک فرمالیا کرتے تھے، اور اس درنا شگفتہ پر اس وقت تک محنت کرتے رہتے، جب تک وہ گوہر شب چراغ نہ بن جائے اور ایسے طلبہ جب سامنے ہوتے تو آپ کا انداز درس دیدنی وشنیدنی ہوتا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ لکھتے ہیں:

''جس سال حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے یہاں، مشکوۃ شریف کے درس میں مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا مبارک علی صاحب جو بعد میں دار العلوم دیوبند

---

[1] پچاس مثالی شخصیات، ص ۱۰۱۔

کے نائب مہتمم بنائے گئے شریک تھے، اس سال مشکوٰۃ شریف خاص اہتمام سے پڑھائی اور ختم میں بھی خاص اہتمام فرمایا، ختم کے دن حضرت ممدوح، حضرت گنگوہیؒ کا وہ جبہ پہن کر درس کے لیے تشریف لائے، جو حضرت نے انہیں بطور سند وتبرک عطا فرمایا تھا، مولانا مبارک علی صاحب کا بیان ہے کہ اس دن چہرے سے غیر معمولی وقار و تمکنت نمایاں تھا، اس سال حضرت ممدوح کا درس دارالمشورہ (دارالاہتمام) میں ہوا تھا اور غیر معمولی انداز کا تھا[1]۔

آپ کے انداز درس پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت مولانا محمد مبارک علی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے:

"حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ درس میں نہایت جم کر تقریر فرمایا کرتے تھے، جو علمی وقار وعظمت لیے ہوئی ہوتی تھی، حدیث کے معرکۃ الآراء مسائل پر، مشبع کلام (نہایت بھرپور کلام) فرماتے جو حقائق پر مشتمل ہوتا تھا"[2]۔

مولانا مبارک علی صاحبؒ حضرت کے درس کی تاثیر کے بارے میں اپنا ایک مشاہدہ کچھ اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"ایک دن معرکۃ الآراء مسئلہ پر پورے چار گھنٹے تقریر فرمائی جو بے نظیر حقائق ومعارف پر مشتمل تھی، اور تمام طلبہ محوِ حیرت اور مستغرق تھے"[3]۔

حضرت مولانا کے علمی کمالات کے تعلق سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کو حضرت نانوتویؒ کی کتب اور حقائق ومعارف پر غیر معمولی نظر تھی؛ بلکہ وہ ان کی علمی وراثتوں کے صحیح جانشین اور بلند پایہ ترجمان تھے۔

حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ لکھتے ہیں:

"حضرت نانوتویؒ کے تلامذہ کے بعد حضرت اقدس کی حکمت پر سب سے زیادہ حاوی تین شخصیتیں تھیں، ایک حضرت والد ماجد مولانا محمد احمد

---

[1] پچاس مثالی شخصیات: ص ۱۰۲۔

[2] ایضاً ص ۱۰۲۔ [3] ایضاً ص ۱۰۲۔

صاحبؒ، دوسرے مولانا عبید اللہ سندھیؒ، اور ان کے بعد تیسرے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحبؒ[1]۔

علوم قاسمیہ پر حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کی وسعت نظری کا عالم یہ تھا کہ اگر کسی مسئلہ کے بارے میں پوچھا جاتا کہ حضرت کی کتاب میں یہ مسئلہ کہاں ملے گا تو بے تکلف ان سب کتابوں کے نام مع صفحہ اور ورق بتلا دیتے جہاں مسئلہ مذکور ہوتا تھا[2]۔

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ، علوم قاسمیہ سے، اپنی درسی تقریر کو مزین فرمایا کرتے تھے جس کی وجہ سے معنوی اور دقیق باتیں بلکہ ژولیدہ بحثیں بھی پیکر محسوس بن جایا کرتی تھیں، اور پورا دین، عقل وفطرت سے بدیہی طور پر، ہم آہنگ نظر آنے لگتا تھا۔

حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ نے خوب لکھا ہے:

"درس میں انداز نہایت متین اور متواضعانہ ہوتا تھا، اور طبعی جلال یا تیزی، یکسر مبدل بہ شفقت ہو جاتی تھی، جو عام حالت میں ایک طبقی انداز تھا، بہر حال عملی لائن میں تفہیم بے نظیر، قول کے دائرہ میں تاثیر ممتاز، تحقیق عالی اور تبیین واضح تر تھی، جس نے ان کے درس کو مقبول بنا دیا تھا، اگر یہ اہتمام کے جھگڑے ان کے سر نہ ہوتے تو اس وقت ان کی یہ علمی خصوصیت زیادہ سے زیادہ نمایاں اور مؤثر ہوتی اور اس میدان میں ان کی امتیازی شہرت ہوتی، لیکن یہ بھی ان ہی اکابر کا کمال تھا کہ انتظامی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ علمی میدان میں بھی پیچھے نہ رہے تھے، جو کمال استعداد کی دلیل ہے"[3]۔

❁❁❁

[1] پچاس مثالی شخصیات: ص ۱۰۲۔
[2] پچاس مثالی شخصیات: ص ۱۰۲۔
[3] پچاس مثالی شخصیات: ص ۱۰۳۔

باب پنجم

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے کچھ مشہور تلامذہ

دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ ایک لمبے عرصے تک، تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، آپ ۱۳۰۳ھ سے لیکر ۱۳۴۲ھ تک، بلاکسی انقطاع کے، مسند تدریس کی زینت رہے، اس دوران آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے والے شاگردوں کی فہرست بڑی دراز ہے۔

مگر ان میں کچھ شخصیتیں ایسی ممتاز ہیں، جو علم وادب کے افق میں آفتاب و ماہتاب بن کر نکلیں، ان میں سے ایک ایک فرد، تاریخ ساز اور عہد آفریں ہے، اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کی عظمت کے لئے یہ بات بجائے خود بہت بڑی دلیل ہے، کہ ان نابغۂ روزگار اور یکتائے زمانہ شخصیات نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، اور آپ کی نظر نے ان خام مادوں سے ایسی بے نظیر شخصیات تراش ڈالیں، ذیل میں آپ کے کچھ مشہور تلامذہ کا تذکرہ، مختصر تعارف کے ساتھ، پیش ہے:

(۱) حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ

''میری امت بارش کے ان قطروں کی مانند ہے، جن کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ پہلے حصہ میں بہتری ہے یا آخری''[۱]۔

---

۱ سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۲۸۶۹۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ، اس حدیث کی صحت کی کھلی برہان تھے، وہ آخری دور میں خزاں رسیدہ چمنستان علم وفن کے لیے، بہار کی نوید جاں افزا بن کر آئے، ان کے وجود کی کلی، جنت نظیر کشمیر میں چٹکی، اوران کی علم ریز نکہت سے سارا برصغیر معطر ہوا، کیا دیو بند اور کیا ہندوستان، پورے برصغیر کیلئے، سرمایۂ نازش اور کلاہِ افتخار، ایسے ویسے کا تو ذکر کیا؛ علامہ اقبال اور علامہ زاہد کوثریؒ جیسے محتاط محقق اور مفکر کا اس پر اتفاق کہ ''اسلام کی آخری پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے''[1]۔

علامہ کشمیریؒ ۲۷؍شوال ۱۲۹۲ھ کو کشمیر میں پیدا ہوئے، ۱۳۱۰ھ میں دیو بند آئے، تشنہ جگر اور پیاسی روح نے، مینائے علم کے خم کے خم چڑھا ڈالے، ۱۳۱۴ھ میں فراغت حاصل کی، حضرت گنگوہیؒ سے بیعت ہوئے اور خلافت پائی، مدرسہ امینیہ دہلی میں تدریس کی خدمت انجام دینے لگے، ۱۳۲۰ھ میں کشمیر واپس ہوئے، وہاں ایک مدرسہ فیض عام کے نام سے قائم فرمایا، ۱۳۲۷ھ میں دیو بند واپس آئے، اساتذہ نے روک لیا، درس کی خدمت پر مامور کیا، مدت تک دارالعلوم سے کوئی حق الخدمت نہیں لیا، ۱۳۳۳ھ میں، حضرت شیخ الہندؒ کے حجاز روانگی کے بعد ۱۲؍سال تک مسند صدارت پر رونق افروز رہے، اور یہیں سے آپ کے علم وفن کا غلغلہ بلند ہوا۔

دیو بند میں آپ نے حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ اور دیگر اساتذہ سے استفادہ کیا، مولانا محمد احمد صاحبؒ کو اپنے اس ہونہار شاگرد اور دارالعلوم کے کامیاب صدر مدرس پر ناز تھا، شاہ صاحبؒ شادی کرنا نہیں چاہتے تھے، اکابرین نے شادی کروادی، شادی کے بعد مدتوں حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے مہمان بنائے رکھا، اور بالکل بیٹا جیسا معاملہ فرمایا۔

۱۳۴۶ھ میں دارالعلوم میں ایک شورش بپا ہوئی اوراس ابر گہر بار کو گجرات کی طرف اڑا لے گئی، گجرات کی قحط زدہ سرزمین، اس ابر کرم کی برکت سے لالہ زار ہوگئی،

---

[1] دیکھیے نقش دوام ص: ۲۸۷۔

شاہ صاحبؒ کی دینی حمیت کا عالم یہ تھا کہ قادیانیت کو سینے کا داغ بنالیا، خلوت پسند طبیعت اور محاذ آرائی کا کوئی سابقہ تجربہ نہ رکھنے کے باوجود، قادیانیت کے خلاف مورچہ سنبھالا، اپنے شاگردوں کو قادیانیوں کے تعاقب پر مامور فرمایا اور اس قافلۂ سخت جان نے قادیانیوں کو سرِ راہ ڈھول چٹادی، اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھا، جب تک کہ پاکستانی عدالت نے قادیانیت کو غیر مسلم اقلیت کا فیصلہ صادر نہ فرمادیا، ۲۳ر صفر ۱۳۵۲ھ کو علم وفن کے اس مینار نے دنیا کو الوداع کہا، اور دیو بند میں پیوند خاک ہوگیا۔

(۲) شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

دیو بند میں عثمانی خانوادہ، علم وعمل اور فضل وکمال کا وہ شجرۂ طوبیٰ ہے، جس کی ہر شاخ اپنی جگہ ایک نئی تاریخ نویس ہے، جس کی ہر کلی، آمد بہار کی پیغامبر، جس کا ہر پھول، عروسِ علم وفن کا جھومر، اور جس کی خوشبو، گل چینِ فضل وکمال کے لئے نشاط انگیز اور روح افزا رہی ہے۔

علم وفن کی آبیاری، تفسیر وحدیث، تاریخ وسیاست، شعر وادب، مردم سازی وافراد تراشی، انتظام وانصرام، تحریک ومحاذ آرائی یہ سبھی اس خاندان کی تگ ودو کا روشن عنوان اور اس کی غیر معمولی سرگرمیوں کی جولان گاہ رہے ہیں، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اسی خانوادۂ عثمانی کے گوہر شب چراغ ہیں۔

آپ حضرت مولانا فضل الرحمٰن دیو بندیؒ کے فرزند رشید ہیں، ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں بمقام بجنور پیدا ہوئے، ۱۷ر سال کی عمر میں دار العلوم میں درجہ قرآن مجید میں داخل ہوئے، ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء میں فراغت حاصل کی، آپ حضرت شیخ الہندؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے اور انہیں سے بیعت بھی۔

فراغت کے بعد کچھ سال، دہلی کے مدرسہ فتح پوری میں صدر مدرس مقرر ہوئے اور وہاں سے ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۱۰ء میں آپ کو دار العلوم بلالیا گیا، یہاں عرصے

تک درجہ علیا کی مختلف کتابیں پڑھائیں، مولانا عثمانیؒ کے درس صحیح مسلم کو بڑی شہرت حاصل تھی، حضرت نانوتویؒ کے علوم پر آپ کی خاص نظر تھی، ایک عرصے تک دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۸ء میں دارالعلوم سے بعض اختلافات کے سبب سے حضرت مولانا محمد انور شاہؒ اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن وغیرہ حضرات کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سورت) تشریف لے گئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث مقرر ہوئے، ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء میں حضرت تھانویؒ اور بعض دوسرے اکابر کے ارشاد پر دارالعلوم تشریف لائے، اور ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۴ء تک بحیثیت صدر مہتمم دارالعلوم کی خدمات انجام دیتے رہے، اس دوران جامعہ ڈابھیل سے بھی تعلق رہا، تاریخ دارالعلوم دیوبند میں آپ کی خصوصیات پر کچھ یوں روشنی ڈالی گئی ہے۔

"علم وفضل، فہم وفراست، تدبیر اور اصابت رائے کے لحاظ سے علامہ عثمانیؒ کا شمار، ہندوستان کے چند مخصوص علماء میں ہوتا تھا، وہ زبان وقلم دونوں کے یکساں شہسوار تھے، اردو کے بلند پایہ ادیب اور بڑی سحر انگیز خطابت کے مالک تھے، فصاحت وبلاغت عام فہم دلائل، پُراثر تشبیہات وانداز بیان اور نکتہ آفرینی کے لحاظ سے ان کی تحریر وتقریر دونوں منفرد تھیں، حالاتِ حاضرہ پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے، اس لیے ان کی تحریر اور تقریر عوام وخواص دونوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، عظیم الشان جلسوں میں ان کی فصیح وبلیغ عالمانہ تقریروں کی یاد آج بھی اہل ذوق کے دلوں میں موجود ہے[۱]۔

علامہ عثمانیؒ میدانِ سیاست کے بھی شہسوار تھے، وہ بجاطور پر پاکستان کے معمار ہیں، انہوں نے اپنی مجاہدانہ کاوشوں کے ذریعہ، پاکستان کے تخیل کو سچ کردکھایا،

---

[۱] تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد: ص:۹۹۔

علامہ عثمانیؒ خلافت کمیٹی کے بھی ایک اہم رکن رہے، ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۲۴ء میں جنگ بلقان کے زمانے میں انہوں نے ترکوں کے لئے چندہ جمع کرنے میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا تھا، مولانا عثمانی سولہ سال تک، جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے رکن رہے، جمعیۃ علماء کی صف اول کے رہنماؤں میں ان کا شمار ہوتا تھا، آخر میں ان کو متحدہ قومیت اور کانگریس کے ساتھ جمعیت کے تعاون کے مسئلہ پر جمعیۃ علمائے ہند سے اختلاف پیش آیا اور وہ مسلم لیگ میں شامل ہوگئے، اور ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۹۴۶ء میں جمعیۃ علمائے اسلام کے صدر منتخب کیے گئے، تقسیم ہند سے قبل رمضان ۱۳۶۶ھ مطابق ۱۹۴۷ء کو مولانا عثمانیؒ پاکستان تشریف لے گئے، اور آخر تک وہیں مقیم ہوگئے، پاکستان میں دستور ساز اسمبلی کے رکن اور دستور ساز کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے، پاکستان میں انہوں نے بہت سی دینی اور ملی خدمات انجام دیں، پاکستان کے اقتدار اعلیٰ پر ان کی علمی اور سیاسی خدمات کا خاص اثر تھا، قوم نے انہیں بجا طور پر "شیخ الاسلام" کا لقب دیا۔

آپ کا قلم بھی، علم وادب کا معدن تھا، وہ جس موضوع پر بھی حرکت کرتا، علم وفن کے موتی بکھیرتا، مسلم شریف کی عربی شرح فتح الملہم، ترجمہ شیخ الہند پر حاشیہ اور متعدد کتابیں، آپ کی تحقیقی کاوشوں کی شاہکار ہیں، ۲۱ر صفر ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو بھاول پور کے ایک مدرسہ کی اصلاح کے لیے تشریف لے گئے اور مختصر سی علالت کے بعد، داعی اجل کو لبیک کہا، اور اس طرح علم وادب، صحافت وسیاست کا یہ آفتاب محمد علی روڈ کے قریب کراچی کے افق میں ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔

(۳) حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھیؒ

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو، نہ ہارنے والے عزم، اور نہ تھکنے والی ہمت کے مالک، حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد خاص، تحریک ریشمی رومال میں شیخ الہند کے دست راست ہی نہیں؛ شہ دماغ بھی، انگریز دشمنی میں شیخ الہندؒ کے حقیقی جانشین۔

آپ مغربی پنجاب کے ضلع سیالکوٹ میں ۱۲۸۹ء میں پیدا ہوئے، آپ کے والد ہندو سے سکھ ہوگئے تھے، آپ نے ابتدائی تعلیم جام پور کے مڈل اسکول میں پائی، دورانِ تعلیم، اسلام کا مطالعہ شروع کردیا، بالآخر اسلام کی صداقت نے دل ودماغ کو کفروشرک کی ظلمت سے پاک کرڈالا، جامہ پور سے سندھ تشریف لے گئے وہاں ایک صاحب نسبت بزرگ، حافظ محمد صدیق صاحبؒ رہتے تھے، ان کی خدمت میں ایک مدت گزاری اور عملی طور پر اسلامی معاشرت کو اپنایا، مولانا سندھی اپنی ذاتی ڈائری میں لکھتے ہیں:

"حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت کا یہ اثر ہوا کہ اسلامی معاشرت میری طبیعت ثانیہ بن گئی"[۱]۔

۱۳۰۶ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور ۱۳۰۷ھ میں دورۂ حدیث میں شریک ہوگئے، مگر تکمیل کی نوبت نہیں آئی، کچھ عرصے کے بعد سندھ چلے گئے، ۱۳۱۵ھ میں پھر دیوبند تشریف لائے، اور اپنے استاذ حضرت شیخ الہندؒ سے کتب حدیث کی اجازت حاصل کی (مولانا سندھی ۱۳۰۶ھ میں ہفتم عربی میں دارالعلوم میں داخل ہوئے، اس زمانے میں مشکاۃ شریف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پڑھاتے تھے، اسی وجہ سے آپ کو تلامذہ میں شمار کیا گیا)۔

آپ حضرت شیخ الہندؒ کی سیاسی سرگرمیوں کا عنوان تھے، ۱۳۲۷ھ میں دارالعلوم میں جمعیۃ الانصار کا قیام انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا، مولانا سندھیؒ اس کے ناظم بنائے گئے، جمعیۃ الانصار کے دو بڑے جلسے جو مرادآباد اور میرٹھ میں ہوئے، مولانا ہی کی جدوجہد کا نتیجہ تھے، بعض وجوہ کی بناء پر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو دیوبند سے دلی بھیج دیا، وہاں آپ نے نظارۃ المعارف القرآنیۃ کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم فرمایا، ۱۳۳۳ھ میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا

---

[۱] تاریخ دارالعلوم، جلد:۲، ص:۶۵۔

سندھی رحمۃ اللہ علیہ کو افغانستان بھیجا، مولانا نے کابل میں کئی اہم سیاسی کارنامے انجام دیئے، کابل میں کانگریس کمیٹی قائم کر کے، اسے انڈین نیشنل کانگریس سے ملحق کیا، برطانوی قبضہ سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی تھی، اس کے ساتھ آپ نے ''حزب اللہ'' نام سے ایک فوج مرتب کی، افغانستان میں راجہ مہندر پرتاپ کی سربراہی میں جو آزاد حکومت قائم ہوئی، اس کے ایک اہم رکن رہے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی حجاز میں گرفتاری کے بعد روس چلے گئے، اور وہاں رہ کر سوشل ازم کا مشاہدہ کیا، ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۹۲۴ء میں ترکی کا سفر کیا اور وہاں سے ۱۳۴۳ھ میں حجاز چلے گئے، جہاں چودہ سال مقیم رہے، ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۹۳۷ء میں جب صوبوں میں کانگریس کی حکومت قائم ہوئی، تو یوپی کی حکومت نے مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ سے، برطانوی دور کی پابندیاں اٹھالیں اور ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۳۹ء کو ہندوستان واپس آئے۔

مولانا سندھیؒ اپنے وقت میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے فلسفہ کے سب سے بڑے داعی اور علمبردار تھے، قرآن، حدیث، فقہ اور تصوف سے متعلق علوم میں شاہ صاحب نے جو تجدید فرمائی ہے، مولانا سندھی اس کے عظیم شارح تھے، ''حکمت ولی اللہی'' کی روشنی میں کتاب وسنت کی تشریح اور عہد حاضر کے مسائل کا حل نکالنے کے لیے ہی انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بیت الحکمۃ کے نام سے ادارہ قائم کیا، اور بعض معرکۃ الآرا مضامین بھی لکھے، ۱۳۶۳ھ مطابق ۲۱/ اگست ۱۹۴۴ء کو دین پور میں جہاں آخر عمر میں آپ مقیم ہو گئے تھے، انتقال فرمایا، افسوس ہے کہ جس ملک کی آزادی کے لیے انہیں ۲۵/ سال جلاوطنی کی پر خطر زندگی گزارنی پڑی، اس ملک کو اپنی زندگی میں آزاد نہ دیکھ سکے[۱]۔

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھئے: تاریخ دار العلوم جلد: دوم، ص: ۶۵/ ۶۶/ ۶۷۔

(۴) حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

''حسین احمد'' ایک شخص نہیں، ایک تحریک، ایک دینی طوفان، ایک سیاسی ہلچل، مرد نہیں؛ مردِ آہن کہئے، چنگاری نہیں: شعلۂ جوالہ کہئے۔

فیض آباد کے ایک معزز گھرانے میں ۱۲۹۶ھ میں آپ نے آنکھیں کھولیں، ۱۳۰۹ھ میں دیوبند حاضر ہوئے، ابتدائی درجہ عربی میں داخل ہوئے، ۱۳۱۶ھ میں فراغت حاصل کی، آپ حضرت شیخ الہندؒ کے مخصوص تلامذہ میں تھے، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سے آپ نے متعدد کتابیں پڑھیں ہیں (مولانا محمد احمد صاحب ۱۳۰۳ھ سے مختلف کتابوں کا درس دے رہے تھے، اور ۱۳۱۳ھ میں مہتمم بنائے جانے کے بعد صحیح مسلم کا درس بھی آپ سے متعلق تھا، اسی اندازہ پر یہ بات لکھی جارہی ہے)

فراغت کے بعد والد ماجد کی معیت میں مدینہ منورہ ہجرت کر کے تشریف لے گئے، وہاں حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے اکتسابِ فیض کیا، ۱۷؍سال تک مسجد نبوی میں آپ نے درس حدیث دیا، شیخ الہندؒ کی معیت میں اسارت مالٹا کی اذیت برداشت کی، اور وہاں استاذ کی خدمت کا وہ نمونہ پیش کیا جو دورِ اول کی یاد تازہ کرتا ہے، مالٹا سے رہائی کے بعد، ہندوستان تشریف لائے اور سیاسیات میں شریک ہوگئے، متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، جمعیۃ العلماء کے صدر اور کانگریس کے قدآور قائدین میں تھے، ۱۳۴۶ھ میں حضرت کشمیریؒ کی علیحدگی کے بعد دارالعلوم دیوبند کی مسندِ صدارت پر فائز کیے گئے اور اخیر عمر تک اسی عہدہ پر قائم رہے، ۱۲؍جمادی الاول ۱۳۷۷ھ ۳؍بجے دن میں وفات پائی، اور قبرستان قاسمی میں آسودۂ خواب ہیں[۱]۔

(۵) مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ

بلند پایہ فقیہ، بیدار مغز قائد، فراست و ذکاوت کا پتلا، سنجیدگی و معاملہ فہمی میں بے نظیر، ایسے خوشنویس کہ انگلیوں کی بلائیں لیجیے، ایسے قانون داں اور ماہر زبان کہ جو

[۱] نقش حیات، الجمعیۃ دہلی کا شیخ الاسلام نمبر، تاریخ دارالعلوم جلد دوم وغیرہ۔

تحریر، قلم سے نکل گئی، بڑے بڑے ادباء کو بھی اس پر حرف گیری کا حوصلہ نہ ہوتا، اعلیٰ درجے کے خوش پوش، بدن پر شیروانی، پاؤں میں اعلیٰ قسم کی گرگابی، سر پر صاف ستھری گول ٹوپی وجہِ شناخت اور نشانِ امتیاز۔

۱۲۹۲ھ میں شاہ جہاں پور میں پیدا ہوئے، وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ قاسمیہ شاہی مرادآباد میں داخل ہوئے، اخیر میں دارالعلوم آئے اور ۱۳۱۴ھ میں فراغت حاصل کی، ۱۳۱۴ھ میں حضرت مولانا محمد احمد صاحب مہتمم بنائے گئے، اور اسی سال سے آپ صحیح مسلم کا درس بھی دینے لگے تھے، ممکن ہے مفتی صاحب نے دیگر کتابوں کے علاوہ صحیح مسلم بھی حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سے پڑھی ہو، دارالعلوم سے فراغت کے بعد مفتی صاحب مدرسہ عین العلم شاہ جہان پور میں مدرس مقرر ہو گئے، اسی زمانے میں انہوں نے فتوی نویسی کا آغاز کیا، اور قادیانیت کی تردید کے لیے ۱۳۲۱ھ میں ایک ماہنامہ ''البرہان'' جاری کیا۔

۱۳۲۱ھ کے اواخر میں آپ نے مولانا امین الدین دہلویؒ کے اصرار پر مدرسہ امینیہ کی صدارت کو رونق بخشی اور مدرسہ کی شہرت ملک گیر ہوئی، ۱۹۱۹ء میں آپ نے دوسرے علماء کے ساتھ مل کر جمعیۃ العلماء ہند قائم کی اور عرصۂ دراز تک آپ اس کے صدر رہے، سیاسی سرگرمیوں کے سلسلے میں آپ کو قید و بند سے بھی دوچار ہونا پڑا، مگر جیل میں بھی آپ کے علمی مشاغل جاری رہتے تھے، مفتی صاحب نے ایک مرتبہ حجاز اور دوسری بار مصر کے اجتماعات میں ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندگی کے فرائض انجام دیئے، فقہ و فتاوی میں آپ کو غیر معمولی دسترس حاصل تھی، آپ کے فتاویٰ کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ فتاوی مختصر ہوتے ہیں، اور زبان صاف اور واضح، آپ کو بجاطور پر ہندوستان کے مفتی اعظم کا لقب دیا گیا۔

آپ کے فتاوی کا مجموعہ، کفایت المفتی کے نام سے دستیاب ہے، تعلیم الاسلام جو آپ نے اسلامی مدارس کے بچوں کے لیے لکھی تھی بہت مشہور ہوئی، حضرت

مفتی صاحب ۱۳۵۵ھ سے ۱۳۷۲ھ تک دارالعلوم دیو بند کے رکن شوری رہے، ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ کوشب میں دہلی میں وفات پائی، اور وہیں مدفون ہوئے[1]۔

(۶) حضرت مولانا میاں سید اصغر حسین دیو بندیؒ

نمونۂ سلف، باصلاحیت عالم دین، متعدد کتابوں کے مصنف، ورع وتقوی ان کی گھٹی میں، راست گوئی اور حسن ظن ان کی سرشت، دیو بند کے ایک بزرگ خاندان کے چشم و چراغ، اور خاندانی تقدس کے مکمل طور سے امین ومحافظ، آپ ہیں حضرت مولانا میاں سید اصغر حسین صاحب دیو بندیؒ۔

آپ ۱۲۹۴ھ میں دیو بند میں پیدا ہوئے، دیو بند میں آپ کا خاندان بزرگی وشرافت میں ممتاز رہا ہے، ۱۳۱۰ھ میں درجۂ فارسی میں دارالعلوم میں داخل ہوئے، اور ۱۳۲۰ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی، آپ کے مشہور اساتذہ میں حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ ہیں، ۱۳۲۱ھ میں حضرت شیخ الہندؒ نے مدرسہ مسجد اٹالہ جونپور کی صدارت تدریس پر بھیج دیا اور ۱۳۲۷ھ تک وہاں درس دیتے رہے، ۱۳۲۸ھ میں جب دارالعلوم سے ماہنامہ ''القاسم'' کے اجراء کا فیصلہ ہوا تو آپ کو دیو بند بلایا گیا اور القاسم کے ساتھ متعدد اسباق بھی سپرد ہوئے، بیعت حضرت سید شاہ (سید محمد عبد اللہ شاہ م ۱۳۱۰ھ) سے ہوئے، اجازت حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے حاصل تھی، تین مرتبہ حج کی سعادت حاصل کی، آپ عالی نسبت بزرگ تھے، ورع، تقوی، زہد اور نیکی نے آپ کی خانقاہ کو مرجع خلائق بنا دیا تھا۔

آپ کی صفائی طبع کے تعلق سے اس واقعہ کا ذکر مناسب ہوگا کہ مغرب کے بعد آپ کے یہاں ایک خصوصی نشست ہوتی تھی، جس میں بعض اصحاب علم بھی شرکت فرماتے، بدقسمتی سے اس مجلس میں غیبت کا دروازہ کھل گیا، جس پر میاں صاحبؒ کو خاصی تشویش ہوئی، ارباب مجلس کو تنبیہ کی؛ مگر چند روزہ حفاظت کے بعد،

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے: الجمعیۃ دہلی کا مفتی اعظم نمبر۔

پھر وہی مرغوب غذا، زبانوں پر لوٹ آئی، حضرت میاں صاحب نے اس سلسلہ کو بند کرنے کے لیے عجیب حکیمانہ انداز اختیار کیا، شرکائے مجلس سے ارشاد فرمایا کہ آئندہ عربی میں گفتگو ہوگی، دوسرے روز مجلس جمی تو اہل علم عربی میں مشق وتمرین نہ ہونے کی بناء پر "کیف حالک؟ طیب، الحمدللہ" سے آگے نہ بڑھ سکے اور اس طرح گناہ بے لذت کا دروازہ بند ہوگیا، آخر زندگی میں اپنے متوسلین کے اصرار پر راندیر ضلع سورت گجرات تشریف لے گئے، وہیں بیمار ہوئے اور ۲۲ رمحرم ۱۳۶۴ھ بوقت اذانِ ظہر یہ عالم باعمل گجرات کی سرزمین میں ہمیشہ کے لیے روپوش ہوگیا[1]۔

(۸) حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

حکیم الاسلامؒ مولانا محمد طیب صاحب قاسمیؒ، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم کے پوتے، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کے فرزند اکبر، علامہ انور شاہ کشمیری کے تلمیذِ رشید، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفۂ اجل، بے مثال خطیب، سحر البیان واعظ، دارالعلوم کے عظیم معمار اور اس کے منہج وفکر کے عالمی نمائندہ، دارالعلوم کی شہرت ومقبولیت کا راز، علم وادب کا بحر بیکراں اور شرافت وخوش اخلاقی کا باغ بہار تھے۔

شرافت ونجابت، خوش خلقی وشگفتہ مزاجی آپ کی طبیعت ثانیہ تھی، ایسے حلیم و بردبار کہ دشمن بھی، دعا دینے پر مجبور، زبان اتنی شیریں کہ لفظوں کی درشتگی، تعبیرات کی سختی اور اسلوب کی کڑواہٹ سے ان کی زبان آشنا نہ ہوسکی، آپ ۱۳۱۵ھ میں پیدا ہوئے، تاریخی نام مظفر الدین رکھا گیا، سات سال کی عمر میں دارالعلوم میں داخل ہوئے، صرف دو سال میں تجوید وقرأت اور حفظ کی تکمیل کی، ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۸ء میں فراغت پائی، اور سند فضیلت حاصل کی۔

---

[1] مفصل حالات کیلئے دیکھئے "سوانح حیات حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب۔

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سے مشکاۃ شریف اور مسلم شریف پڑھی، حدیث میں آپ کے خاص استاذ، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ رہے، فراغت کے ساتھ ہی دارالعلوم کے مدرس مقرر ہوئے اور اپنی ذہانت وطباعی کی وجہ سے جلد ہی طلبہ میں بہت مقبول ہو گئے، ۱۳۴۳ھ میں نائب مہتمم مقرر ہوئے اور ۱۳۴۸ھ میں مہتمم بنائے گئے، جس پر تاحیات فائز رہے، آپ دارالعلوم دیوبند کے سب سے طویل العہد مہتمم تھے، آپ نے دارالعلوم کے گیسو کو، جس حکمت وخوش اسلوبی سے سنوارا ہے، اور جس اخلاص اور جدوجہد سے دارالعلوم کی عظمت کو فلک بوس بنایا ہے، وہ آپ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، تاریخ دارالعلوم میں آپ کے دور اہتمام کی ترقی پر کچھ اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے:

"مہتمم ہونے کے بعد آپ کو اپنے علم وفضل اور خاندانی وجاہت اور اثر کی بناء پر ملک میں بہت جلد مقبولیت اور عظمت حاصل ہو گئی، جس سے دارالعلوم کی عظمت وشہرت کو کافی فوائد حاصل ہوئے، چنانچہ دارالعلوم نے آپ کے زمانہ اہتمام میں نمایاں ترقی حاصل کی، ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۹۲۹ء میں جب آپ نے انتظام دارالعلوم کی باگ ڈور ہاتھ میں لی، تو اس کے انتظامی شعبے آٹھ تھے، جن کی تعداد اب ۲۳ر ہو چکی ہے، اس وقت دارالعلوم کی سالانہ آمدنی کا بجٹ ۵۰ر ہزار روپیہ سالانہ سے کچھ زائد تھا، آپ کے زمانے میں ۲۶ر لاکھ تک پہونچ گیا، ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۹۲۹ء میں ملازمین دارالعلوم کے عملے میں ۴۵ر افراد تھے اور اب ان کی تعداد دو سو تک پہونچ چکی ہے، اس وقت اساتذہ کی تعداد ۱۸ر تھی، اور اب ۵۹ر ہے، طلباء کی تعداد ۴۸۰ر تھی اور اب دو ہزار کے قریب ہے، اس طرح عمارتوں میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے، دارالتفسیر، دارالافتاء، دارالقرآن، مطبخ جدید، فوقانی دارالحدیث، بالائی مسجد، باب الظاہر، جامعہ طبیہ جدید، دو منزلہ دارالاقامہ، مہمان خانہ کی

عظیم الشان عمارت، کتب خانہ کے وسیع وعریض ہال، دارالاقامہ جدید، افریقی منزل، مطبخ کے قریب تین درسگاہوں کا اضافہ، یہ سب حضرت ممدوح ہی کے دورِ اہتمام کی تعمیرات ہیں[1]۔

واقعہ یہ ہے کہ پچاس سال کے عہد میں انہوں نے صرف چندے اور عمارتیں ہی نہیں بڑھائیں؛ بلکہ اپنی پر اثر زبان اور قلم کی تراوش سے دارالعلوم کے اعتبار کو بڑھایا، اس کے تعارف کی وسعتیں، دنیا کے ہر حصے میں پھیل گئیں، اکابر کو ''زندہ جاوید'' کیا، مسلک دیوبند کی جامعیت اور اعتدال نیز اس کی عالمگیریت کو پوری دنیا میں روشناس کرایا، دارالعلوم کا اہتمام حجلۂ عروسی نہیں؛ بلکہ کانٹوں کی سیج ہے، آپ کے عہد میں بھی سیاست کی آندھیاں آئیں، داخلی وخارجی شورشیں بلند ہوئیں، ہنگامہ آرائیاں ہوئیں اور سیاسی محاذ قائم کیے گئے؛ لیکن یہ قافلہ سالار، دارالعلوم کی شمع کو ہر حال میں فروزاں کیے رہا اور اس کی لوکو، زمانہ کے کسی طوفان سے متاثر نہیں ہونے دیا

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش، جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

اللہ تعالیٰ نے حضرت حکیم الاسلامؒ کو بے پناہ خصوصیات سے نوازا تھا، وہ خطابت وتقریر کے بادشاہ تھے، ان کا انداز خطابت اپنی نوعیت میں بالکل اچھوتا اور منفرد تھا، جس میں سمندر کی وسعت اور آبشار کا ترنم سمویا ہوا تھا، عام مقرروں کی طرح جوش وخروش، جذباتیت، ہاتھ پاؤں کے اشارات کی بہتات، الفاظ کی ادائے گی میں عجلت، لب ولہجہ میں اتار چڑھاؤ اور پرشکوہ الفاظ کی کثرت بالکل نہ تھی، مشکل سے مشکل مسئلہ کو انتہائی عام فہم بنا کر پیش کرتے، حکمتوں اور نکتہ سنجیوں کا تسلسل رہتا، رواں اور ٹھہر ٹھہر کر بولتے، ہاتھوں کے اشارے خفیف اور بہت کم، گھنٹوں بولتے، اور

---

[1] تاریخ دارالعلوم دیوبند، جلد: ۲، ص: ۲۳۶-۲۳۷۔

نشست بدلنے کی نوبت نہ آتی، حال ومقام اور مخاطب کا خاص لحاظ رکھتے، کہیں کہیں معمولی ظرافت بھی ہوتی[1]۔

حضرت حکیم الاسلام قلم کے بھی دھنی تھے، آپ کے تحقیقی رسالوں اور چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد ایک سو سے زائد ہے، بعض کتابیں انتہائی محققانہ اور اپنے موضوع پر منفرد ہیں، علماء دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج جو مسلک دیوبند کا مختصر اور انتہائی جامع تعارف ہے، آپ ہی کے گہربار قلم کا شاہکار ہے۔

آپ کو شعر سخن کا بھی بڑا لطیف ذوق تھا، اردو فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں اشعار کہتے تھے، اور خوب کہتے تھے، آپ کے کلام کا مجموعہ ''عرفان عارف'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، آپ میں مختلف مسالک ومذاہب کے لوگوں کو ساتھ لیکر چلنے، اور انہیں بامقصد راستے پر گامزن کرنے کی بے پناہ صلاحیت پائی جاتی تھی۔

آپ امت کے مسلکی انتشار اور آپسی تنازعات کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، ہندوستانی حکومت، مسلمانوں کے داخلی اختلافات کا فائدہ اٹھا کر، دستور میں دی گئی آزادی کو مسلسل پابندِ سلاسل کرتی جارہی تھی، مسلم پرسنل لا میں مداخلت کی بارہا کوششیں کی جاچکی تھیں، ظاہر ہے مسلم پرسنل لا میں مداخلت، دستور کی کھلی خلاف ورزی اور مسلمانوں کی ملی موت کا پیش خیمہ تھی۔

ایسے نازک موقع پر، حضرت حکیم الاسلامؒ ہی تھے، جو حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی رفاقت میں، مختلف مسلکوں کا متحدہ پلیٹ فارم بنانے کی تحریک لیکر اٹھے، اور ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' کے قیام کے تخیل کو شرمندۂ تعبیر کرڈالا، آپ بورڈ کے پہلے صدر رہے، اور مشکل حالات میں آپ کی حکیمانہ قیادت نے، ملک وقوم کی جڑیں مضبوط کیں۔

آپ ہی کے زیر اہتمام، دارالعلوم کا وہ صدسالہ اجلاس ہوا، جس نے

---

[1] دیکھیے: وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، تالیف: مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی، ص: ۲۸۰۔

دار العلوم کی مقبولیت اور شہرت کو چار چاند لگا یا، افسوس کہ اجلاس صد سالہ کے بعد ہی، دار العلوم میں ہنگامہ شروع ہو گیا، اور دار العلوم سے آپ کا رشتہ کاٹ دیا گیا، دار العلوم سے جدائی آپ کے لئے، سوہانِ روح ثابت ہوئی، حکیم الاسلام کی دار العلوم سے جدائی، معمولی واقعہ نہیں، دار العلوم اور حضرت حکیم الاسلامؒ کا امتزاج، پھول کے رنگ وخوشبو کا امتزاج تھا، پھول میں رنگ نہ ہو تو وہ بوڑھی بیوہ کا چیتھڑا ہے، اور اگر خوشبو نہ ہو تو ہر کشش ورونق سے خالی، کاغذ کا گلدستہ ہے۔

بالآخر اس غیر معمولی اور غیر متوقع صدمۂ جانکاہ کے زیر تاب، گلستان دار العلوم کا یہ عظیم باغبان اور ملت اسلامیہ کی عہد ساز شخصیت ۶؍شوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷؍جولائی ۱۹۸۳ء کو قبرستان قاسمی میں ہمیشہ کی لئے محوِ خواب ہو گئی۔

(۹) مفتیٔ اعظم حضرت مفتی محمد شفیع صاحب عثمانیؒ

دار العلوم دیوبند کے نابغۂ روزگار فاضل، اور پاکستان میں مسلک دار العلوم کے عظیم ترجمان، فقہ وفتاوی کی آبرو، سینکڑوں کتابوں کے مصنف، حضرت علامہ مفتیٔ اعظم مولانا محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ دیوبند میں ۱۳۱۴ھ میں پیدا ہوئے، ابتدا سے لے کر آخر تک پوری تعلیم دار العلوم دیوبند میں ہی حاصل کی، آپ ۱۳۳۶ھ میں دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سے آپ نے مشکاۃ اور مسلم شریف پڑھی۔

فراغت کے بعد دار العلوم میں ابتدائی مدرس ہوئے، اور ترقی کر کے درجۂ علیا تک جا پہونچے، ۱۳۵۰ھ میں دار العلوم میں منصب افتاء پر فائز کیے گئے۔

ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے، ۱۳۷۰ھ میں کراچی میں دار العلوم کے نام سے ایک مدرسہ قائم فرمایا، ابتداءً حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت تھے، ان کی وفات کے بعد حضرت تھانویؒ سے بیعت ہوئے، اور خلافت پائی، آپ نے پاکستان

میں قادیانیوں کا کامیاب تعاقب کیا، سینکڑوں کتابیں لکھیں، اکثر فقہ وفتاوی کے موضوع پر ہیں، آپ کی مشہور تفسیر معارف القرآن (آٹھ جلدوں میں) ہر مدرسہ کی زینت ہے۔ ۱۱ر شوال ۱۳۹۶ھ کی شب کو مولیٰ حقیقی سے جا ملے[۱]۔

(۹) حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ

علامہ بلیاویؒ تمام علوم وفنون پر کامل دست گاہ رکھتے تھے، علوم عقلیہ کے تو آپ بادشاہ تھے، آپ کا تاریخی نام غلام کبریا ہے۔ ۱۳۰۴ھ میں مشرقی یو پی کے شہر بلیا کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کا خاندان پنجاب کے ضلع جھنگ سے جونپور آیا اور پھر کچھ مدت کے بعد بلیا میں آباد ہو گیا، جون پور میں فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم مشہور طبیب مولانا حکیم جمیل الدین نگینوی سے حاصل کی اور معقولات کی کتابیں مولانا فاروق احمد چریا کوٹی اور مولانا ہدایت اللہ خاں (تلمیذ مولانا فضل حق خیر آبادی) سے پڑھیں، دینیات کی تعلیم کیلئے مولانا عبد الغفار کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا جو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ ۱۳۲۵ھ کے اواخر میں دار العلوم دیو بند میں داخل ہو کر اولاً ہدایہ اور جلالین وغیرہ کتابیں پڑھیں اور ۱۳۲۷ھ میں دار العلوم سے فارغ التحصیل ہوئے، علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے بخاری شریف اور مولانا احمد صاحبؒ سے مسلم شریف پڑھی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد اسی سال مدرسہ عالیہ فتح پوری کے مدرس دوم بنائے گئے، پھر عمری ضلع مراد آباد کے مدرسہ میں کچھ عرصہ تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔ ۱۳۳۱ھ میں آپ کو دار العلوم میں بلا لیا گیا۔ ۱۳۴۰ھ سے ۱۳۴۴ھ تک مدرسہ دار العلوم مئو ضلع اعظم گڑھ اور مدرسہ امدادیہ دربھنگہ (بہار) میں صدارتِ تدریس کی خدمات انجام دیں۔ ۱۳۴۴ھ میں آپ کو پھر دار العلوم دیو بند بلا لیا گیا۔

---

[۱] مشاہیر دار العلوم دیو بند ص: ۸۶/۸۷۔

۱۳۴۳ھ کی روودادِ دارالعلوم میں آپ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

''مولوی محمد ابراہیم صاحب تمام علوم میں کامل الاستعداد ہیں، معقول وفلسفہ کی تمام کتابیں نہایت خوبی سے پڑھاتے ہیں، فلسفہ ومنطق اور کلام کے انتہائی اسباق صدرا، شمس بازغہ، قاضی مبارک، حمد اللہ، امور عامہ کے علاوہ شرح مطالع، شرح اشارات وغیرہ پڑھاتے ہیں، طلباء کا بہت زیادہ میلان ان کی طرف رہتا ہے، نہایت خوش تقریر ہیں، غرض یہ ایک نہایت قابل قدر اور شہرت ووقعت حاصل کرنے والے مدرس ہیں''[1]۔

۱۳۶۲ھ میں پھر دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کی، اولاً جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مسندِ صدارت کو رونق بخشی، وہاں کے بعد کچھ عرصہ تک مدرسہ عالیہ فتح پوری میں صدارت تدریس کی خدمات انجام دیں اور بعد ازاں بنگال میں ہاٹ ہزار ضلع چاٹ گام کے مدرسہ میں صدر المدرسین رہے اور بالآخر ۱۳۶۶ھ میں مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی سفارش اور مجلس شوریٰ کی منظوری سے دارالعلوم دیوبند میں آگئے، ۱۳۷۷ھ میں حضرت مدنی کی وفات کے بعد آپ دارالعلوم کی مسند صدارت تدریس پر فائز ہوئے اور تادمِ واپسیں اس پر متمکن رہے۔ ان کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے، جو برِصغیر کے علاوہ ایشیاء اور افریقہ کے بہت سے ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

حضرت علامہ بلیاویؒ ہر علم وفن خصوصاً علم کلام وعقائد میں یگانۂ روزگار تھے، انہوں نے تفسیر وحدیث، عقائد وکلام اور دوسرے علوم کی جو نمایاں خدمات انجام دیں وہ اپنی مثال آپ ہیں، اُن کے درس وتدریس کی مدت ۱۳۲۷ھ سے ۱۳۸۷ھ تک ساٹھ سال ہوتی ہے۔ طلباء ان کے درس میں بڑے شوق اور انہماک سے شریک ہوتے تھے اور ان کے افادات عالیہ سے مستفید ہونے کے متمنی رہتے تھے، درس میں

---

[1] تاریخ دارالعلوم، ج:۲، ص:۱۰۴۔

اختصار کے ساتھ بڑی جامعیت کی شان تھی، درس کا انداز نہایت باوقار ہوتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ لطائف وظرائف دقیقہ سنجی اور بالغ نظری سے اہم مسائل کو حل کرنے میں خاص ملکہ اور کمال حاصل تھا۔ قصص وحکایات کو مسائل پر اس طرح منطبق کردیتے تھے کہ مسئلہ کے تمام پہلو واضح اور منقح ہوجاتے تھے، ان کے درس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ تلامذہ میں فن سے گہری مناسبت ہوجاتی تھی اوران پر علم و دانش کی راہیں کھل جاتی تھیں، وہ اپنے عہد میں عقائد وکلام اور منطق وفلسفہ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ حدیث میں روایت سے زیادہ درایت سے کام لیتے تھے۔ حضرت نانوتویؒ کے علوم پر اُن کی گہری نظر تھی، حضرت شیخ الہندؒ سے تلمذ کے علاوہ بیعت کا شرف بھی حاصل تھا۔

علامہ بلیاویؒ کی تصانیف میں رسالہ مصافحہ اور رسالہ تراویح اردو میں ہیں، ایک رسالہ انوار الحکمۃ فارسی میں ہے۔ یہ رسالہ منطق وفلسفہ کے مضامین پر مشتمل ہے۔ سلم العلوم پران کا عربی میں حاشیہ ضیاء النجوم ہے۔ میبذی اور خیالی پر بھی انہوں نے حواشی لکھے تھے جو افسوس ہے کہ ضائع ہوگئے۔ آخر میں جامع ترمذی پر حاشیہ لکھ رہے تھے جس کے پورے ہونے کی نوبت نہ آسکی۔

ان کی صحت عرصہ سے خراب ہوگئی تھی، ۲۴؍رمضان ۱۳۸۷ھ کی دوپہر کو ۸۴؍سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا، قبرستان قاسمی میں آسودۂ خواب ہیں[1]۔

(۱۰) مولانا مناظر احسن گیلانی صاحبؒ

حضرت مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ بہار کی مردم خیز سرزمین کے دُرِّ شاہوار تھے۔ ۹؍ربیع الاول ۱۳۱۰ھ کو اپنی نانیہال استھانواں میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن گیلانی میں اپنے چچا حکیم سید ابوالنصر سے پائی، اُن کے خاندانی

[1] ملاحظہ ہو: تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج:۲، ص:۱۰۳-۱۰۵۔

بزرگوں پر معقولات کا رنگ غالب تھا، ۱۳۲۴ھ میں انہیں مزید تعلیم کے لئے مولانا برکات احمد صاحب مرحوم سے پڑھنے کے لئے ٹونک بھیج دیا گیا، مولانا برکات احمد معقولات کے ایک نامور عالم تھے، سات سال تک ان سے معقولات کی چھوٹی بڑی کتابیں پڑھیں۔

مولانا گیلانیؒ نے اپنی تعلیم کی جو تفصیل لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹونک میں معقولات کی تعلیم کے بعد انہیں محسوس ہوا کہ علم وحقیقت کی دنیا صرف اتنی ہی نہیں ہے جو ان کے گردوپیش نظر آرہی ہے؛ بلکہ اس کے علاوہ بھی کچھ اور ہے جس تک رسائی حاصل کرنا ان کے لئے ضروری ہے، انہوں نے والدین سے اصرار کیا کہ وہ دیوبند جانا چاہتے ہیں، خاندانی بزرگوں پر چوں کہ معقولیت کا غلبہ تھا، اسی لئے بڑی مشکل اور اصرار کے بعد بالآخر انہیں دیوبند آنے کی اجازت دی گئی، انہوں نے جب دارالعلوم دیوبند میں قدم رکھا تو ان کے ذہن وفکر پر اپنے خاندان اور اپنے استاذ مولانا برکات احمد ٹونکی کی معقولیت کی گہری چھاپ لگی ہوئی تھی۔

۱۳۳۱ھ میں انہوں نے دورۂ حدیث میں داخلہ لیا اور ۱۳۳۲ھ میں دورۂ حدیث میں شریک رہ کر دارالعلوم سے کتبِ حدیث کی سند حاصل کی، دارالعلوم میں حضرت شیخ الہندؒ، حضرت شاہ صاحب، حضرت علامہ عثمانی رحمہم اللہ اور دوسرے اساتذہ کے علمی اور روحانی فیضان وتربیت سے اُن کی زندگی کا رخ معقولات کے بجائے تفسیر وحدیث اور سلوک ومعرفت میں تبدیل ہوگیا اور فکر ونظر کی وہ تمام بنیادیں متزلزل ہوگئیں جو خاندان، تعلیم اور گردوپیش نے اُن کے گرد چنی تھیں۔

مولانا گیلانی تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ مدت تک رسالہ "القاسم" اور "الرشید" میں معاون مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے، اس زمانے میں انہوں نے اپنے علمی اور تحقیقی مضامین والہانہ طرزِ نگارش سے علمی حلقوں میں نمایاں مقام حاصل کرلیا تھا، سوانح ابوذر غفاریؓ اور کائناتِ روحانی یہ دونوں کتابیں اُن کے اُسی دور کی یادگار ہیں۔

حضرت مولانا حافظ محمد احمدؒ کی سفارش سے مولانا گیلانی کا حیدر آباد میں جامعہ عثمانیہ میں تقرر ہوا، جہاں بالآخر وہ شعبۂ دینیات کے صدر مقرر ہوئے، انہوں نے تقریباً پچیس سال تک حیدر آباد میں علمی خدمات انجام دیں، ان کی تعلیم و تربیت سے جامعہ عثمانیہ کے بہت سے طلباء میں دین داری پیدا ہوگئی تھی، تلامذہ میں بعض نامور اہل قلم بنے۔

النبی الخاتم، الدین القیم، تدوین حدیث، ہزار سال پہلے، نظام تعلیم و تربیت، ان کی مشہور تصانیف ہیں، ان کے علاوہ سیکڑوں مقالات و مضامین ان کے قلم سے نکلے اور ملک کے بلند پایہ رسائل و جرائد میں شائع ہوئے، ان کا جو والہانہ اسلوب تحریر میں پایا جاتا ہے وہی والہانہ رنگ تقریر میں بھی تھا، وہ علم و فضل، معلومات، کثرتِ مطالعہ، دقتِ نظر، نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی میں نادرۂ روزگار تھے، اُن کی کتاب ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت اپنے موضوع پر معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے۔ ہندوستان میں قطب الدین ایبک کے عہد سے موجودہ دور تک مسلمانوں کے نظامِ تعلیم و تربیت کا انداز، نصاب تعلیم اور اس میں شامل کتابیں، طلبہ کے انتظام و نگرانی کی کیفیات اور دیگر اہم تعلیمی مسائل کو بڑے ہی خوبصورت انداز میں لکھا ہے، مختصر یہ ہے کہ اس موضوع کا کوئی گوشہ نہیں جس پر سیر حاصل بحث نہ ہو، کتاب موٴثر اور دلچسپ ہے۔

آخر میں جامعہ عثمانیہ سے وظیفہ یاب ہوکر اپنے وطن گیلان میں مقیم ہوگئے تھے، وہیں طویل علالت کے بعد ۲۵/شوال ۱۳۷۵ھ (۵/جون ۱۹۵۶) کو وفات پائی۔[1]

(۱۱) مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ

نامور محدث، مشہور مفسر، عالم باعمل اور دین کے پرجوش داعی حضرت مولانا ادریس کاندھلویؒ ۱۳۱۸ھ میں کاندھلہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم خانقاہ اشرفیہ تھانہ

[1] بحوالہ تاریخ دارالعلوم، ج:۲، ص:۱۱۸-۱۲۱۔

بھون میں ہوئی، پھر مظاہر علوم میں پڑھا اور دورۂ حدیث تک تعلیم حاصل کی، مزید تعلیم کا شوق دارالعلوم دیوبند میں لے آیا اور دوبارہ دورۂ حدیث شریف میں داخلہ لیا، ۱۳۳۷ھ تک تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے میں حضرت مولانا محمد احمد صاحب مسلم شریف پڑھایا کرتے تھے، آپ نے مسلم شریف حضرت مولانا سے پڑھی ہے، صلاح وتقویٰ کے آثار شروع ہی سے نمایاں تھے، حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز تلازمہ میں تھے۔

تفسیر وحدیث، کلام اور عربی ادب سے انہیں خاص شغف تھا، عربی اور فارسی میں برجستہ اشعار لکھنے کا انہیں اچھا ملکہ حاصل تھا، علم وفضل، زہد وتقویٰ اور اتباع سلف میں ان کا بڑا مقام تھا، تقویٰ اور خشیت الٰہی کے آثار نمایاں طور پر اُن کے چہرے سے محسوس ہوتے تھے، نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے، حق گوئی میں نہایت جری اور بے باک تھے، سچی بات بلا خوف لومۃ لائم، برملا کہنے میں انہیں کبھی تامل نہیں ہوتا تھا اور اس میں کسی کی رورعایت نہیں کرتے تھے، علم وعمل میں سلفِ صالح کا نمونہ تھے، علم سے اُن کے اشتغال کا یہ عالم تھا کہ تمام علوم وفنون میں استحضار تام رکھتے تھے، ممتاز عالم دین اور بلند پایہ اربابِ تدریس میں ان کا شمار تھا، درس وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف سے بھی کافی دلچسپی تھی، مشکوٰۃ شریف کی شرح التعلیق الصبیح کے نام سے انہوں نے آٹھ جلدوں میں لکھی ہے، ان میں سے پہلی چار جلدیں دمشق میں طبع ہوئی ہیں، علم حدیث میں ان کی ایک اور کتاب تحفۃ القاری فی حل مشکلات البخاری بھی ہے، معارف القرآن کے نام سے انہوں نے کئی جلدوں میں قرآن شریف کی تفسیر لکھی ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کی جملہ تصانیف کی تعداد سو کے قریب ہے، ہر وقت درس و تدریس اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہتے تھے، یہ ذوق یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ دنیوی ساز وسامان سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔

مقاماتِ حریری پر عربی میں حاشیہ لکھا ہے، جو صاحب درس وتدریس، علماء

اور طلباء میں بہت مقبول اور مشہور ہے، علم عقائد میں ''عقائد الاسلام'' اور سیرت نبوی میں کے موضوع پر ''سیرت المصطفیٰ'' آپ کی اہم تصانیف ہیں، عیسائیت اور قادیانیت کے رد میں بھی انہوں نے کئی محققانہ کتابیں لکھی ہیں۔

مدرسہ امینیہ دہلی سے انہوں نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا، مگر چند ماہ کے بعد دارالعلوم نے ان کو کھینچ لیا، مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھانے کا موقع ملا۔

۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء سے ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء تک دارالعلوم میں مدرس رہے، پھر حیدرآباد چلے گئے اور دس بارہ سال تک وہاں مقیم رہ کر درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا، ۱۳۵۸ھ میں انہیں دارالعلوم میں بلا لیا گیا اور تفسیر وحدیث کے اسباق ان کے سپرد کئے گئے، ان کا درس تفسیر وحدیث اہل علم میں مقبول ومشہور تھا، اس طرح ۱۸رسال تک انہوں نے دارالعلوم میں مسندِ تدریس کو رونق بخشی۔

۱۳۶۸ھ میں لاہور چلے گئے۔ وہاں جامعہ عباسیہ بہاولپور میں شیخ الجامعہ مقرر ہوئے اور ۱۹۵۲ء سے آخر تک جامعہ اشرفیہ میں بحیثیت شیخ الحدیث ۲۲رسال فرائض تدریس انجام دیتے رہے۔ لاہور میں ہر جمعہ کو ان کا وعظ ہوتا تھا، جس میں بڑے ذوق وشوق سے لوگ شریک ہوا کرتے تھے، وہ پاکستان کے ممتاز اور بلند پایہ عالم سمجھے جاتے تھے۔ ۷رجب ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء کو لاہور میں وفات پائی اور وہیں آسودۂ خواب ہیں[۱]۔

(۱۲) حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحبؒ

علمائے روزگار کا مخزن، فضلائے دہر کا معدن، نامور شخصیتوں کا مرجع حدیث میں علامہ کشمیریؒ کے پرتو اور سیاست میں مولانا حسین احمد مدنیؒ کے عکس جمیل۔

آپ کا وطن مالوف ہاپوڑ ہے، آپ کے آباء واجداد میں سید قطب اور سید

---

[۱] دیکھیے: تاریخ دارالعلوم، ج:۲:ص:۱۳۷-۱۳۹۔

عالم اپنے دوسرے دو بھائیوں کے ساتھ عہد شاہجہاں میں ہرات سے دہلی آئے، یہ حضرات اپنے زمانے کے ممتاز علماء میں سے تھے۔ شاہ جہاں نے اُن کے درس و تدریس کے لئے ہاپوڑ میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا، سید عالم کا سلسلۂ نسب ۲۶ر واسطوں سے حضرت امام حسینؓ پر منتہی ہوتا ہے۔

۱۳۰۷ھ-۱۸۸۹ء میں آپ کی ولادت اجمیر میں ہوئی، جہاں آپ کے دادا سید عبدالکریم محکمۂ پولیس میں تھانے دار تھے، چار سال کی عمر میں تعلیم کا آغاز ہوا، قرآن شریف والدہ ماجدہ سے پڑھا، فارسی کی تعلیم اپنے خاندان کے بزرگوں سے حاصل کی، عمر کے بارہویں سال اپنے خاندانی عالم مولانا خالد سے عربی صرف ونحو شروع کی، اسی دوران آپ کے والد ماجد کو اپنے آبائی مدرسہ کے احیاء کا خیال پیدا ہوا جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ انقلاب کی نذر ہو گیا تھا، چند سال اس میں تعلیم پانے کے بعد آپ کو گلاوٹھی کے مدرسہ منبع العلوم میں بھیج دیا گیا، وہاں مولانا ماجد علی سے مختلف کتابیں پڑھیں، بعد ازاں اپنے استاذ مولانا ماجد علی کے ساتھ دہلی چلے گئے، دہلی کے مدارس میں معقولات کی کتابیں پڑھیں، ۱۳۲۶ھ-۱۹۰۸ء میں دارالعلوم دیوبند میں آئے، حضرت شیخ الہندؒ نے امتحان داخلہ لیا، امتحان میں امتیازی نمبروں سے سرفراز ہوئے، حضرت شیخ الہندؒ کی ہدایت کے مطابق ایک سال کے بجائے دو سال میں دورۂ حدیث شریف کی تکمیل کی، دارالعلوم کے زمانۂ طالب علمی ہی میں طلباء کو معقولات کی کتابیں پڑھانے لگے تھے۔

۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد دارالعلوم میں مدرس مقرر ہوگئے، کچھ عرصے کے بعد اکابر دارالعلوم نے شوال ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء میں آپ کو مدرسہ شاہی مرادآباد میں بھیج دیا۔ مرادآباد میں تقریباً ۴۸ر سال قیام رہا، تقریباً نصف صدی کی اس طویل مدت میں بہت سے طلباء حدیث نے آپ سے اکتساب فیض کیا ہے[1]۔

---

[1] ایضاح البخاری، جلد اول، ص ۷-۱۲۔

مولانا ممدوح چوں کہ حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کے خاص تلامذہ میں سے تھے، اس لئے آپ کے درسِ حدیث میں دونوں جلیل القدر استادوں کے رنگ کی آمیزش پائی جاتی تھی۔ چناں چہ آپ کا درس بخاری نہایت مبسوط اور مفصل ہوتا تھا، جس میں حدیث کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث ہوتی تھی۔ فقہاء کے مذاہب کو بیان کرنے کے بعد احناف کے فقہی مسلک کی تائید و ترجیح کی وضاحت میں ایسے پرزور دلائل پیش فرماتے تھے جس کے بعد سامع کا ذہن بالکل مطمئن ہو جاتا تھا اور اس میں کوئی ادنیٰ خلجان باقی نہیں رہتا تھا، اثنائے درس میں صحیح بخاری کی مختلف شروح کے ساتھ ساتھ اپنے اساتذہ کے علوم و معارف بھی جابجا پیش فرماتے رہتے تھے، درسِ حدیث میں آپ کی تقریر مبسوط و مفصل ہونے کے علاوہ سہل اور دلنشین بھی ہوتی تھی۔ اس لئے کم استعداد کے طلباء کو بھی استفادہ کا پورا پورا موقع مل جاتا تھا، اندازِ بیان نہایت پاکیزہ اور شستہ ہوتا تھا، جس میں آپ کے جمالِ ظاہری کی تمام خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں، اس بناء پر آپ کے درسِ بخاری کو شہرت تام اور قبولِ عام حاصل تھا، چنانچہ ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء میں پونے تین سو کے قریب طلباء آپ کے درسِ حدیث میں شریک تھے اور کم و بیش ہر سال یہی تعداد دورۂ حدیث کے طلباء کی رہتی تھی۔

۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء میں حضرت مولانا مدنیؒ کی وفات کے بعد دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے اراکین نے دارالعلوم دیوبند کے منصب شیخ الحدیث کے لئے آپ کا انتخاب کیا، اس سے پہلے بھی دو مرتبہ حضرت مولانا مدنیؒ کی گرفتاری اور رخصت کے زمانے میں آپ دارالعلوم میں صحیح بخاری کا درس دے چکے تھے۔

تعلیمی مشاغل کے علاوہ ملکی و ملی سیاسیات سے بھی آپ کو تعلق تھا اور اس کے نتیجے میں قید و بند کی صعوبتوں کو بھی جھیلنا پڑا، حضرت مولانا مدنیؒ کی جمعیۃ علماء ہند کی صدارت کے زمانے میں دو مرتبہ نائب صدر رہے۔ بعد ازاں جمعیۃ علماء ہند کی مسندِ

صدارت پر فائز ہوئے اور تادمِ واپسیں صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

آخر عمر میں جب صحت نے جواب دے دیا تو بغرض علاج وتبدیل آب وہوا اُن کو مراد آباد لے جایا گیا، جہاں ان کے متعلقین قیام پذیر تھے، مگر وقت موعود آچکا تھا، کچھ عرصہ علیل رہ کر ۲۰/صفر ۱۳۹۲ھ (۵/اپریل ۱۹۷۲ء) کی تاریخ میں نصف شب کے بعد انتقال فرمایا اور علم وفضل کا یہ آفتاب جہاں تاب سر زمین مراد آباد میں ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔[1]

❀❀❀

[1] بحوالہ: تاریخ دار العلوم، ج:۲، ص:۱۰۵۔

بابِ ششم

کاروانِ دارالعلوم آغاز سے
فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ تک

یہ باب حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قاسمیؒ کی تحریر سے ماخوذ ہے۔

پہلی بحث: دارالعلوم کا قیام اور پس منظر

کائناتِ انسانی کے لئے اسلام میں ایک مکمل ضابطۂ حیات اور دستورِ زندگی ہے، زندگی کا کوئی گوشہ اور حصہ ایسا نہیں ہے جس کے لئے اس میں منضبط اور مرتب ہدایات نہ ہوں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں دنیا کی صلاح وفلاح کے لئے بہت سارے لازوال چشمے بہائے، وہیں آپؐ نے مسلمانوں کی تعلیم وتربیت اور سیرت سازی پر بھی خصوصی توجہ دی تاکہ دنیا امن وسلامتی اور صلح وآشتی کا گہوارہ باقی رہے، اور انسان جامۂ انسانیت کو تار تار کرنے کا گناہ مول نہ لے۔

اسلام میں تعلیم کی اہمیت

جن لوگوں کی اسلامی نظامِ زندگی پر گہری اور وسیع نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کی بسم اللہ ہی تعلیم وتعلّم، درس وتدریس اور کتاب وقلم سے ہوئی ہے۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی یہ نازل ہوئی:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَo خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍo اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُo الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِo عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ. (سورہ علق: ۱-۵)

اپنے رب کے نام سے پڑھو، جو سب کا بنانے والا ہے، اس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے بنایا، پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم سے علم سکھایا، سکھلایا آدمی کو جو وہ نہیں جانتا تھا۔

ابتدا میں جب خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا، تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو اپنے سینہ سے بار بار لگایا، جس سے آپ کا سینہ مبارک کھل گیا اور زبان مبارک پر یہ آیتیں جاری ہو گئیں۔

یہ پہلی وحی الٰہی اشارہ تھی کہ دنیا ظلمت وضلالت کی وادی سے نکل کر اس وقت تک شاہراہِ ہدایت ونور پر نہیں آسکتی جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ لکھنا پڑھنا نہ شروع کردے، اور تعلیم وتربیت، درس وتدریس اور کتاب وقلم کے ساتھ وابستہ نہ ہو جائے؛ کیوں کہ اس کی کامیابی کا راز کتاب وقلم اور تعلیم وتعلّم میں ہی مضمر ہے۔

جس دین میں تعلیم وتربیت کی یہ شان ہو، اور تحصیل علم کے لئے جبر واکراہ تک کی اجازت دی گئی ہو، اس دین قیم میں علم وفن کی اشاعت، کتاب وسنت کی تعلیم وترویج اور اخلاق واعمال کی پاکیزگی پر کس قدر ابھارا گیا ہوگا، اور اس دین پر ایمان لانے والوں میں عمل کا کیسا جذبہ وولولہ ہوگا، اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

قرآن پاک اور حدیث نبوی ﷺ میں تعلیم وتربیت کی بڑی اہمیت وفضیلت آئی ہے اور اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے ہر دور میں علم وفن اور کتاب وسنت کی تعلیم واشاعت پر اپنے ذہن وفکر اور مالی سرمایہ کا ایک بڑا حصہ خرچ کیا اور تعلیم وتربیت کے بے شمار ادارے قائم کئے، جہاں رہ کر ہزاروں لاکھوں افراد نے علم وعمل کی دولت حاصل کی اور اپنے ملک اور اپنی ملت کے لیے باعث صد افتخار بنے۔

مسلمانوں کی خدمتِ تعلیم کا اعتراف

مسلمانوں کی اس خدمت کا اعتراف غیروں نے بھی کیا ہے اور ساتھ ہی مدح وستائش کی ہے۔ مشہور فرانسیسی مصنف ڈاکٹر لیبان لکھتا ہے کہ:

''شہروں میں تعلیم وتربیت کے مرکز قائم کئے، تمام زبانوں کی کتابوں کو عربی زبان میں بدلا، پھر زبان سیکھی اور ہر علم کے امام بن گئے اور اس کو ترقی دی[۱]''۔

اس نے مزید لکھا ہے کہ:

''عام تعلیمی مدارس کے علاوہ بغداد، قاہرہ، طلیطلہ، قرطبہ وغیرہ بڑے بڑے شہروں میں علمی تحقیقات کے کارخانے، رسد خانے، عظیم الشان کتب خانے، غرض علمی تحقیقات کا پورا خزانہ موجود تھا[۲]''۔

مسلمانوں کے ذوقِ تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں رقمطراز ہے:

''عربوں نے جو مستعدی تحصیل علم میں ظاہر کی وہ فی الواقع حیرت انگیز ہے، جب وہ کسی شہر کو لیتے تو ان کا پہلا کام وہاں مسجد اور مدرسہ بنانا ہوا کرتا تھا[۳]''۔

خود اس ملک ہندوستان میں جب مسلمانوں کے قدم آئے تو ان کے ساتھ علم وعمل، عدل ومساوات اور رواداری وفیاضی بھی ساتھ آئی، جہاں اس ملک کو بہت کچھ انہوں نے عطا کیا وہاں علم وفن اور تعلیمی اداروں کی بھی کمی نہیں رکھی، خود انگریزوں نے لکھا ہے کہ حکومتِ برطانیہ سے پہلے صرف بنگال میں اسّی ہزار دینی مدارس تھے۔ ایک انگریز مصنف لکھتا ہے کہ:

''ہندوستان اسکولوں سے بھرا ہوا ہے، وہاں ہر اکتیس لڑکوں پر ایک اسکول ہے''۔

۱۔ تمدنِ عرب: ص ۳۹۷۔

۲۔ تمدنِ عرب: ص ۳۹۹۔ ۳۔ ایضاً: ص: ۳۹۹۔

سندھ کے متعلق مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ:

''وہاں مختلف علوم وفنون کے چار سو کالج تھے۔''

ہندوستان کا کوئی شہر اور صوبہ متعدد تعلیمی اداروں سے خالی نہیں تھا ہر جگہ درسگاہیں قائم تھیں جہاں بچے اور جوان تعلیم میں منہمک ہوتے تھے[1]۔

برصغیر انقلاب کی زد میں

لیکن ہندو پاک اور بنگلہ دیش پر ایک ایسا وقت آیا کہ یہاں سے دینی درسگاہیں اسلامی مدارس ومراکز کا نام ونشان تک مٹ گیا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے بہت پہلے ۱۷۱۷ء میں شاہ فرخ سیر نے انگریزوں کو تجارت کی اجازت دیدی اور ان کی تجارت کو مخصوص ٹیکسوں اور چنگیوں سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ پھر ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم ثانی نے اکیس لاکھ سالانہ معاوضہ لے کر بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی ان کے حوالہ کر دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۰۲ء میں لارڈ لیک نے دہلی پر حملہ کر کے اور شاہ عالم ثانی کو گرفتار کر کے یہ معاہدہ لکھالیا کہ:

''شاہ عالم کی حکومت شہر، قلعہ اور اطرافِ دہلی قطب مینار تک محدود رہے گی اور بقیہ ملک پر انگریزوں کا تسلط رہے گا اور اب مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت بادشاہ سلامت کی جگہ کمپنی کے ذمہ ہوگی۔''

علماء کا احساسِ ذمہ داری

انہیں حالات سے متاثر ہو کر خاندانِ ولی اللّٰہی کے چشم وچراغ سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (م ۱۲۳۹ھ) نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا اور اعلان کیا کہ مسلمانوں کے امام کا حکم قطعاً جاری نہیں ہے بلکہ عیسائی سرداروں کی حکمرانی ہے اور اس شہر دہلی سے کلکتہ تک نصاریٰ کی حکومت قائم ہے۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے تعلیمی ہند۔

اور یہی حالات تھے کہ آپ کے فیض یافتہ حضرت سید احمد بریلوی شہید (م ۱۲۴۶ھ) اور آپ کے برادرزادہ حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہید (م ۱۲۴۶ھ) نے مجاہدین کی ایک منظّم جماعت کے ساتھ برصغیر میں عدل و مساوات کی اسلامی حکومت قائم کرنے کی بھرپور جدوجہد کی اور اس راستہ میں جامِ شہادت نوش کیا۔

اس کے بعد بھی خاندانِ ولی اللّٰہی کے ایک نیر تاباں حضرت مولانا محمد اسحاق محدث دہلوی (م ۱۲۶۲ھ) اپنے نانا جان شاہ عبدالعزیزؒ کی اس مسندِ درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم کو آباد کیے رہے، جسے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) کے پدرِ بزرگوار حضرات شاہ عبدالرحیم (م ۱۱۳۱ھ) نے دہلی میں بچھائی تھی، اور جس کے غلغلہ سے پورا برصغیر پرُشور تھا، مگر حالات سے مایوس ہو کر وہ بھی ۱۲۵۸ھ میں راہ ہجرت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے اور ہندوستان سے نکل کر حجازِ مقدس میں پناہ لی۔

آپ کے بعد قال اللہ اور قال الرسول کا آوازہ، مجددی خاندان کے چشم و چراغ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجددیؒ (م ۱۲۹۶ھ) سے قائم تھا، اور آپ سے علم و عمل کے چشمے پھوٹ پھوٹ کر ملک کو سیراب کر رہے تھے، مگر انقلابِ زمانہ نے اس محدث کو بھی یہاں چین سے بیٹھنے نہ دیا اور ۱۲۷۲ھ میں آپ نے بھی یہاں سے ہجرت فرما کر حجازِ مقدس کی راہ لی، اس کا انجام یہ ہوا کہ برصغیر حدیث نبویؐ اور دینی تعلیمات کی اشاعت و ترویج سے محروم سا ہو گیا۔

انگریزوں کا مکمل تسلط

بالآخر اس پرآشوب دور کا شباب ۱۸۵۷ء (۱۲۷۵ھ) پر مکمل ہو گیا، اور پورے ملک پر انگریزوں کی حکمرانی قائم ہوگئی۔ مسلمانوں کا دہلی میں قتل عام ہوا، اور دہلی لاشوں سے پٹ گئی، علماء بے دریغ تہِ تیغ کئے گئے، پھانسیوں پر بے دردی سے لٹکائے گئے، جو بچ بچا گئے تھے ان کو گرفتار کر کے جزیرہ انڈمان میں قید کر دیا گیا، پھر اس کے بعد ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی، اوقاف و معافیات جن سے مدارس چلتے

تھے، نئی حکومت نے اپنے قبضہ میں کرلیا، ڈبلو ڈبلو ہنٹر نے لکھا ہے کہ:

''ہم نے ان کے طریق تعلیم کو بھی اس سرمایہ سے محروم کردیا جس پر اس کی بقا کا دارومدار تھا، اس سے مسلمانوں کا تعلیمی نظام اور ان کے تعلیمی ادارے یک قلم مٹ گئے۔''

تفصیل ملاحظہ کرنا ہو تو اس کے لئے ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' کا بغور مطالعہ کریں، پھر اندازہ ہوگا کہ اس ملک میں مسلمانوں کا کیا حال ہوگیا تھا۔

عیسائیت کا پرچار

انگریزوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ حکومت کے قدم جمتے ہی عیسائیت کی تبلیغ شروع کی اور وہ بھی اس طرح کہ:

''دیسی پادریوں کے علاوہ جن کا کوئی شمار نہیں، صرف نوسو ولایتی پادری تھے جو تندہی کے ساتھ عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف تھے، اس کے علاوہ ایک مکتی فوج تھی جس کے اسّی دستے ان کی پشت پناہی اور امداد کرتے تھے اور ان کے کام میں ہاتھ بٹاتے تھے[1]''۔

برطانوی پارلیمنٹ کے ایک رکن نے ۱۸۵۷ء کے بعد ایوان میں تقریر کی:

''خداوند تعالیٰ نے یہ دن ہمیں اس لئے دکھایا ہے تاکہ عیسیٰ مسیح کی فتح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرادے۔ ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت ہندوستان کے عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہئے اور اس میں کسی طرح کا تساہل نہیں ہونا چاہئے۔''

دارالعلوم کا قیام

یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہ وقت بڑا ہی صبر آزما تھا۔ ۱۸۵۷ء کے

---

[1] سیرت مولانا محمد علی مونگیری، ص: ۴۶۔

بعد جو چند علمائے ربانیین اور مشائخ عظام انگریزوں کی گرفت سے بچ گئے تھے اور جو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے حالات نے ان کو جھنجھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب میں آزاد مدارسِ دینیہ کے قیام کی اسکیم ڈال دی، تاکہ ان کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کے بقاء وتحفظ اور کتاب وسنت کی اشاعت وترویج کا سلسلہ جاری ہو سکے۔

چناں چہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (م ۱۲۹۷ھ) اور آپ کے رفقائے کار نے باہم مشورہ سے ''مدرسہ اسلامی عربی'' کے نام سے دیوبند میں ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو ایک عربی مدرسہ کی داغ بیل ڈال دی، یہ اس دورِ پرفتن کا سب سے پہلا دینی مدرسہ تھا جو بہت جلد ''ام المدارس جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند'' کے نام سے پوری دنیائے علم میں مشہور ومقبول ہو گیا اور بین الاقوامی حیثیت کا مالک بن گیا۔ پھر اس کے بعد مظاہر العلوم سہارنپور، منبع العلوم گلاؤٹھی، جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد اور دوسرے مدارس قائم ہوئے، آج اسلامی مدارس بحمداللہ ہزاروں کی تعداد میں برصغیر کے مختلف صوبوں اور اضلاع میں قائم ہیں اور دینی تعلیم کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کی بنیاد کی تفصیلات سوانح قاسمی میں ملیں گی، اس بناء میں خصوصیت سے حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب قدس سرہٗ، حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب قدس سرہٗ اور حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ قابل ذکر ہیں، جن کا ہاتھ ابتدا ہی سے تاسیس مدرسہ میں تھا۔ یہ حضرات خصوصیت سے حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے دست وبازو رہے ہیں اور بناءِ مدرسہ کے بعد بھی اس کے ذمہ دار مجلس کے رکن رکین کی حیثیت سے مدرسہ کے تمام امور میں عملاً شریک رہے ہیں، بعد میں حضرت اقدس مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس مجلس خیر کے رکن رکین ہوئے اور بالآخر حضرت نانوتویؒ کے ارشاد وایماء پر دارالعلوم کے عہدۂ اہتمام پر فائز ہوئے اور آپ کا عہدِ اہتمام خیر وبرکت کا سرچشمہ ثابت ہوا۔

دارالعلوم کی معنوی بناء کے لیے تو حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے آٹھ اصول تحریر فرمائے جو اس ادارہ میں تمام قوانین کے لئے اساس و بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں اور حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے آٹھ اصولِ عملی تجویز فرمائے جو اس ادارہ کے نظم وانتظام کی اساس و بنیاد ہیں۔ دونوں بزرگوں کے اصولِ ہشت گانہ درجِ ذیل ہیں جو اس دارالعلوم کی حکمتِ عملی اور نظم وانتظام کی اساس ہیں۔

اساسی اصولِ ہشت گانہ

از حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ بانیٔ دارالعلوم دیوبند

(۱) اصل اول یہ ہے کہ تامقدور کارکنانِ مدرسہ کی ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے۔ آپ کوشش کریں اوروں سے کرائیں۔ خیر اندیشانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے۔

(۲) ابقاءِ طعامِ طلبہ بلکہ افزائش طعامِ طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشانِ مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

(۳) مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو، اپنی بات کی پیچ نہ کی جائے۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفتِ رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا۔

القصہ تہِ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس و پیش میں اسلوبیٔ مدرسہ ملحوظ رہے، سخن پروری نہ ہو، اور اس لئے ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہارِ رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیتِ نیک اس کو سنیں، یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل وجان قبول کریں گے اور اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ مہتمم

امورِ مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے، خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد و صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو۔ اور نیز اس وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئے اور بقدرِ ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا، ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر ہر اہل مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔

(۴) یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسینِ مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علمائے روزگار خود بین اور دوسروں کے درپئے توہین نہ ہوں، خدا نخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

(۵) خواندگی مُقررہ اسی انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور اندازہ مشورہ سے تجویز ہو، پوری ہو جایا کرے، ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

(۶) اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں، تب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرطِ توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانۂ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجاء جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائیگا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی رہے۔

(۷) سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

(۸) تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ موجبِ برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندے سے امیدِ ناموری نہ ہو، بالجملہ حسنِ نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند نے اپنے مخلص بانیوں کے صدقہ میں ملک وملت اور دین ومذہب کی بڑی اہم خدمتیں انجام دی ہیں، یہ واضح رہے کہ دارالعلوم صرف ایک تعلیمی درسگاہ نہیں بلکہ ایک تحریک ہے، جہاں علم کی دولت کے ساتھ عملِ صالح اور اخلاقِ فاضلہ کی روح طلبہ میں پیوست کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔

دوسری بحث: دارالعلوم کا امتیاز اور مجموعی مذاق

بانیٔ دارالعلوم دیوبند حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے اپنے قلم فیض رقم سے جو اصولِ ہشت گانہ تحریر فرمائے ہیں ان میں یہ بھی صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ:

(۱) اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں اس وقت تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلتا رہے گا اور اگر کوئی آمدنی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانۂ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ، تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجاء جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہوجائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہوجائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی رہے۔

(۲) سرکاری شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے[۱]۔

بانیوں کے خلوص وللّٰہیت کا نتیجہ یہ ہے کہ دارالعلوم کے فضلاء اور اس کے فرزندوں نے یہاں سے نکل کر دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں چھوڑا جہاں ان میں سے کوئی نہ کوئی نہ پہنچا ہو اور اس نے وہاں ایمان واسلام کی شمع روشن نہ کی ہو، عقاید کی پختگی، معاملات کی صفائی اور اعمال واخلاق کی بلندی ان کا خاص مشن ہے۔

دارالعلوم کے اربابِ بست وکشاد نے بانی کی وصیت پر پورا پورا عمل کیا اور کبھی حکومت کی امداد قبول نہیں کی اور رجوع الی اللہ کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا، یہی

---

[۱] دیکھئے صد سالہ تاریخ دارالعلوم دیوبند۔

ذوق کم وبیش اس ادارہ کے فرزندوں میں بھی رہا اور انہوں نے بھی کبھی حکومت کے در پر جبہ سائی کو پسند نہیں کیا، بلکہ غیر ملکی حکومت کے خلاف صف آرا ہو کر اس وقت تک جنگ کرتے رہے جب تک وہ ختم نہ ہوگئی اور ملک آزاد نہ ہوگیا۔

دارالعلوم کا نصاب

دارالعلوم دیوبند کا نصاب خالص مذہبی اور دینی تجویز کیا گیا، اس کی وجہ خود بانی کی زبان سے سنئے، فرماتے ہیں:

"درباب تحصیل یہ طریقۂ خاص تجویز کیا گیا اور علومِ جدیدہ کو کیوں شامل نہ کیا گیا، من جملہ دیگر اسباب بڑا سبب اس بات کا ایک تو یہ ہے کہ تربیت عام ہو یا خاص اس پہلو کا لحاظ چاہئے جس طرف سے ان کے کمال میں رخنہ پڑا ہو، سو اہل عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم علومِ جدیدہ تو بوجہ کثرتِ مدارسِ سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علومِ قدیمہ کو سلاطین زمانہ سابق میں بھی ترقی نہیں ہوئی ہوگی، ہاں علومِ نقلیہ کا تنزل ہوا کہ ایسا تنزل بھی کسی کارخانہ میں نہ ہوا ہوگا، ایسے وقت میں رعایا کو مدارسِ علومِ جدیدہ کا بنانا تحصیل لاحاصل نظر آیا۔ دوسرے یہ کہ زمانہ واحد میں علومِ کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعثِ نقصانِ استعداد ہوتی[1]"۔

تحصیل علومِ جدیدہ کی ترغیب

لیکن آپ نے یہ بھی مشورہ دیا کہ یہاں سے فراغت کے بعد علومِ جدیدہ حاصل کرنے کی سعی کی جائے۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

"اس کے بعد طلبۂ مدرسہ ہذا کو مدارسِ سرکاری میں جا کر علومِ جدیدہ میں کمال پیدا کرنے کی سعی جاری رکھنی چاہئے[2]"۔

---

[1] روداد ۱۲۹۰ھ۔ [2] روداد ۱۲۹۰ھ۔

بعد میں دار العلوم دیو بند کے نصابِ تعلیم میں بقدرِ ضرورت علومِ جدیدہ کا بھی اضافہ کیا گیا، تا کہ یہ اس طرف سے بالکل نا آشنا نہ ہوں؛ لیکن زیادہ توجہ اور محنت علوم دینیہ پر کی گئی جو دار العلوم کا خاص موضوع ہے اور جو موجودہ دور میں توجہ کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔

دار العلوم کی دینی خدمات کا اعتراف

اس میں قطعاً شبہ نہیں ہے کہ دار العلوم دیو بند نے اپنے موضوعِ اصلی پر جو خدمت انجام دی ہیں وہ اس قابل ہیں کہ اس پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔ پاکستان کے ایک علمی رسالہ میں ایک صاحب نے لکھا تھا جو علومِ جدیدہ کے دلدادہ ہیں:

”متذکرہ بالا جدید مذہبی عقلیت کے مقابلہ میں نقل کی دفاع کا سب سے بڑا مرکز دیو بند بنا، جس نے قال اللہ وقال الرسول کے حصار میں محصور ہو کر مذہب کا تحفظ کیا“۔

”ہم پہلے بھی یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں کہ دیو بند ایک درس گاہ نہیں ایک عظیم تحریک بھی ہے، جس نے اس دور میں مؤثر رول ادا کیا اور جس سے متعدد علمی و عملی سوتے پھوٹے، چناں چہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے بعد شیخ الحدیث علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مبلغ ملت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ اور ان کے تمام علمی و روحانی، مذہبی و سیاسی اور دعوتی و تبلیغی سلسلوں کا اصل منبع دیو بند ہی ہے؛ حتیٰ کہ اوپر کی مثال کے مطابق حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کی اکثر دینی درسگاہوں، دینی و مذہبی تحریکوں کا تعلق بھی دیو بند کے ساتھ وہی ہے جو دنیا بھر کی مساجد کا خانہ کعبہ کے ساتھ ہے[1]“۔

---

[1] میثاق لاہور۔

مولانا محمد الحسنیؒ نے لکھا ہے:

''اس حقیقت سے کوئی ہوشمند اور منصف انسان انکار نہیں کر سکتا کہ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر دین خالص کی جس طرح حفاظت کی ہے اور اس کو بدعت، تحریف اور تاویل سے محفوظ رکھا ہے، اس سے ہندوستان میں اسلامی زندگی کے قیام وبقاء اور استحکام میں بیش قیمت مدد ملی ہے اور آج جو صحیح اسلامی عقاید، دینی علوم، اہل دین کی وقعت اور صحیح روحانیت اس ملک میں نظر آتی ہے اس میں بلاشبہ اس کا نمایاں اور بنیادی حصہ ہے[1]''۔

یہ واقعہ ہے کہ اگر ۱۸۵۷ء کے بعد دارالعلوم دیوبند کی تحریک نہ ہوتی تو شاید برصغیر میں اسلام کی صورت یا تو مسخ ومحرف ہو چکی ہوتی اور یا اس کا نام ونشان مٹ چکا ہوتا۔ جس طرح دارالعلوم نے برصغیر کو متاثر کیا اسی طرح بیرونی دنیا کو بھی اسلام پر باقی رکھنے کے لئے اس نے بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں۔

ان چند کلمات کے بعد دارالعلوم کے نظم وانتظام اور خدمات پر ایک نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔

دارالعلوم دیوبند کا مجموعی مذاق اور اس کی تربیت کا رُخ

۱۸۵۷ء کے بعد کے دور میں جب کہ مسلمانوں کی شوکت ہندوستان سے پامال ہو چکی تھی اور حالات میں یکسر انقلاب اور تبدیلی آ چکی تھی، دارالعلوم نے ان بدلتے ہوئے حالات میں جو سب سے بڑا کام کیا وہ یہ کہ مسلمانوں میں بلحاظِ دین ومذہب اور بلحاظِ معاشرت تبدیلی نہیں ہونے دی کہ وہ حالات کی رَو میں بہہ جائیں۔ پختگی اور عزیمت کے ساتھ انہیں اسلامی سادگی اور دینی ثقافت کے زاہدانہ ومتوکلانہ اخلاق پر قائم رکھا، مگر اس حکمت کے ساتھ کہ عوام کی حد تک اندرونِ حدود جائز

[1] پیامِ ندوہ۔

توسعات سے گریز نہیں کیا جو بدلتے ہوئے تمدن و معاشرت میں طبعی طور پر ناگزیر تھا، مگر خواص کی حد تک دائرہ وسیع نہیں ہونے دیا جس سے عام مسلمانوں میں اسلامی مدنیت کا سادہ نقشہ قائم رہا اور جدید تمدن و معاشرت میں اغیار کی نقالی کا غلبہ نہیں ہو سکا اور اسلامی غیرت و حمیت باقی رہ گئی، مرعوبیت اور احساسِ کمتری قلوب میں جمنے نہیں پایا، ضمیر کی حریت و آزادی کا پورا پورا تحفظ کیا اور اتباعِ اغیار کے بجائے سنتِ نبوی ؐ کو معیارِ زندگی بنانے کے جذبات قلوب میں اُبھارے، جس سے عام تمدن و معاشرت میں پرہیزگاری اور تقویٰ و طہارت کے دواعی اُجاگر رہے۔

بلحاظِ حقیقت یہ سب کچھ اس کا ثمرہ تھا کہ دارالعلوم اور اس کے پروردوں کے مسلک اور زندگی کے معاملات کی اساس و بنیاد فلسفہ اور عقلِ محض پر نہیں تھی بلکہ انبیاء علیہم السلام کے ڈالے ہوئے راستہ پر یعنی محبت و عشق پر تھی جو ایمان کا بنیادی جوہر اور غالب عنصر ہے۔ فلسفہ اختراعات اور آزادیٔ فکر کی راہ لے جاتا ہے اور عشق و محبت اتباع و ادب کی راہ چلاتا ہے۔ فلسفہ کی بنیاد چوں کہ عقلی اختراعات پر ہے اس لئے اگلا فلسفی پچھلے کی تحمیق اور تغلیط کو اپنا واجبی حق سمجھتا ہے اور نبوت کی بنیاد چونکہ وحی اور عشق و محبتِ خداوندی پر ہے اس لئے ہر اگلا پیغمبر پچھلے پیغمبر کی تصدیق و محبت کو جزوِ ایمان بتاتا ہے۔ اندرونی جذبات کا یہی فرق فلاسفہ اور انبیاء کے متبعین میں بھی ہے۔

پس دارالعلوم کے طرزِ تربیت اور تعلیم و تمدن کا اہم جزو چوں کہ وحیٔ الٰہی کے ساتھ ہمہ وقتی شغل و اشتغال اور **قال اللہ و قال الرسول** ہی کا تمام تر مشغلہ تھا اس لئے طبعی طور پر اس کے حلقوں میں ادب و اتباع اور عشق و محبت کی بنیادیں استوار ہوئیں اور ان کا اثر اوپر کی تعمیر یعنی دیانت، معاشرت اور عادت و عبادت میں آنا ناگزیر تھا اس لئے اس نے بدلتے ہوئے حالات پر پچھلوں کے نقشِ قدم کو برقرار رکھا اور زمانہ کی رَو میں عوام کو کلیتہً بہنے نہیں دیا اور اس کی اس عزیمت کی عظمت دوستوں

اور مخالفوں سب نے تسلیم کی۔

لیکن جن بزرگوں نے اس دور میں اپنے حسنِ نیت اور اخلاق سے ہندوستانی مسلمانوں کی عزتِ نفس اور زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ان کی مادی سربلندی کے لئے مساعی انجام دیں اُن سے کبھی آویزش نہیں کی، البتہ ان کے کسی اقدام سے اگر دین یا دینی ذوق اور دین کے کسی عقیدہ و عمل کو متاثر ہوتے دیکھا تو اس کا کھل کر مقابلہ کیا اور اس طرح امکانی حد تک دین میں آزاد فکری، آزاد روشی اور بے قیدی کی مداخلت کے راستے روکے۔

تیسری بحث: دارالعلوم اور دفاع عن الدین

دارالعلوم کی جماعت اپنے مسلک کی ہمہ گیری کی وجہ سے ہر فتنہ کی مدافعت کے لئے سینہ سپر رہی خواہ وہ فتنہ نقل و روایت کی راہوں سے آیا یا عقلیت پسندی کی بنیادوں سے اُٹھا۔ اس جماعت نے ہر دور میں اعلائے کلمۃ اللہ اور امر بالمعروف کا فرض ادا کیا اور اسی اسلوب اور اسی رنگ میں جس رنگ ڈھنگ میں کسی دینی فتنہ نے سر اُٹھایا، جاہل متصوفین کی جانب سے بدعات، محدثات اور شرکیہ حرکات کا فتنہ روایتی انداز میں اُبھرا تو اس نے روایتی ہی طور پر مقابلہ کیا اور فتنہ کی بے سر و پا اور بے سند روایتوں کی قلعی کھول کر شریعت و طریقت کی مستند نقول سے اس کا استیصال کیا اور مقابلہ میں نقل و روایات کا ایک بڑا ذخیرہ پیش کر دیا۔

مدعیانِ عقل و اجتہاد کی طرف سے آزادیٔ فکر، عدمِ اتباعِ سلف اور نیچریت کا فتنہ عقل کا سہارا لے کر دین میں داخل ہونے لگا تو اس نے عقلی دلائل پیش کر کے کامیاب مدافعت کی اور جس کے لئے حضرت بانیٔ دارالعلوم قدس سرہٗ نے ایک مستقل حکمت ہی مدوّن فرما دی جس کے سامنے فلسفہ کسی بھی روپ میں آیا تو اس نے فلسفہ کے اندازِ قد کو پہچان کر اس کے راستے روک دیئے۔

غرض بدعت پسندی، ہوا پرستی، دہریت نوازی بے قیدی، مطلق العنانی اور آزادیٔ افکار کی جڑیں دارالعلوم نے کھوکھلی کر کے عقل و نقل، روایت و درایت اور حکمت و دین کی جڑیں مضبوط کر دیں۔

دارالعلوم نے ملک کو کیا نفع پہنچایا

دارالعلوم نے اس نوعیت کے افراد پیدا کیے جنہوں نے تعلیم، تزکیہ، اخلاق، تصنیف، افتاء، مناظرہ، صحافت، خطابت، تذکیر، تبلیغ، حکمت اور طب وغیرہ میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ان افراد نے کسی مخصوص خطہ میں نہیں؛ بلکہ ہندو پاک کے ہر ہر صوبہ اور بیرونی ممالک میں قابل قدر کارنامے انجام دیئے۔ ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۸۲ھ تک سو سال کی مدت میں اگر دارالعلوم دیوبند کی ان خدمات کا جائزہ لیا جائے جو اس نے ہندو پاک میں انجام دیں تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں ملکوں کے ہر ہر حصہ میں اس نے اپنے ایسے فرزندانِ رشید پہنچائے جو اس خطہ میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور مخلوقِ خدا کو ظلمتِ جہل سے نکال کر انہوں نے نوعِ علم سے مالا مال کر دیا۔

چوتھی بحث: دارالعلوم کا سلسلۂ استناد اور مسلک

دارالعلوم کا سلسلۂ سند و استناد

دارالعلوم دیوبند کا سلسلۂ سند حضرت الامام شاہ ولی اللہ صاحب فاروقی قدس سرہ العزیز سے گذرتا ہوا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک جا پہنچتا ہے۔ شاہ صاحب اس جماعتِ دیوبند کے مورثِ اعلیٰ ہیں جن کے مکتب فکر سے اس جماعت کی تشکیل ہوئی، حضرتِ ممدوح نے اولاً اس وقت کے ہندوستان کے فلسفیانہ مزاج کو اچھی طرح پرکھا، پھر علومِ شریعت کو ایک مخصوص جامع عقل و نقل طرز میں پیش فرمایا، جس میں نقل کو عقل کے جامہ میں ملبوس کر کے نمایاں کرنے کا ایک خاص حکیمانہ انداز

پنہاں تھا۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ' بانیٔ دارالعلوم دیوبند نے ولی اللّٰہی سلسلہ کے تلمذ سے اس رنگ کو نہ صرف اپنایا جو انہیں ولی اللّٰہی خاندان سے ورثہ میں ملا تھا، بلکہ مزید تنور کے ساتھ اس کے نقش ونگار میں اور رنگ بھرا، اور وہی منقولات جو حکمتِ ولی اللّٰہی میں معقولات کے لباس میں جلوہ گر تھے، حکمت قاسمیہ میں محسوسات کے لباس میں جلوہ گر ہوگئے۔ پھر آپ کے سہل ممتنع اندازِ بیان نے دین کی انتہائی گہری حقیقتوں کو جو بلاشبہ علمِ لدنی کے خزانہ سے ان پر بالہامِ غیب منکشف ہوئیں، استدلالی اور لمیاتی رنگ میں آج کی خوگرِ محسوس یا حس پرست دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور ساتھ ہی اس خاص مکتبِ فکر کو جو ایک خاص طبقہ کا سرمایہ اور خاص حلقہ تک محدود تھا، دارالعلوم دیوبند جیسے ہمہ گیر ادارہ کے ذریعہ ساری اسلامی دنیا میں پھیلا دیا۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ولی اللّٰہی مکتبِ فکر کے تحت دیوبندیت در حقیقت قاسمیت یا قاسمی طرزِ فکر کا نام ہے۔

حضرت نانوتوی قدس سرہ' کے وصال کے بعد اس دارالعلوم کے سرپرست ثانی قطبِ ارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ' نے قاسمی طرزِ فکر کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کی تعلیمات میں فقہی رنگ بھرا، جس سے اصول پسندی کے ساتھ فروعِ فقہیہ اور جزئیاتی تربیت کا قوام بھی پیدا ہوا، اور اس طرح فقہ اور فقہاء کے سرمایہ کا بھی اس میراث میں اضافہ ہوگیا۔

ان دونوں بزرگوں کی وفات کے بعد دارالعلوم دیوبند کے اولین صدر مدرس جامع العلوم اور شاہ عبدالعزیز ثانی حضرت مولانا محمد یعقوب قدس سرہ' نے جو حضرت بانیٔ دارالعلوم سے سلسلۂ تلمذ بھی رکھتے تھے، دارالعلوم کی تعلیمات میں عاشقانہ، والہانہ اور مجذوبانہ جذبات کا رنگ بھرا جس سے یہ صہبائے دیانت سہ آتشہ ہوگئی۔

آپ کے وصال کے بعد دارالعلوم دیوبند کے سرپرستِ ثالث شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ' صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند جو حضرت

بانیٔ دارالعلوم قدس سرہ' کے تلمیذِ خاص بلکہ علم وعمل میں نمونۂ خاص تھے، ان تمام الوانِ علوم کے محافظ ہوئے اور انہوں نے چالیس سال دارالعلوم کی صدارتِ تدریس کی لائن سے علوم وفنون کو تمام منطقہ ہائے اسلامی میں پھیلایا اور ہزار ہا تشنگانِ علوم ان کے دریائے علم سے سیراب ہو کر اطراف میں پھیل گئے، اس لحاظ سے یوں سمجھنا چاہئے کہ شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ' جماعتِ دارالعلوم کے جدامجد ہیں، حضرت نانوتوی قدس سرہ' جدِ قریب، حضرت گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ اخ الجد اور حضرت شیخ الہندؒ بمنزلہ پدرِ بزرگوار ہیں۔

دارالعلوم کا مسلک

علمی حیثیت سے یہ ولی اللّٰہی جماعت مسلکاً اہل السنّت والجماعت ہے جس کی بنیاد کتاب وسنت اور اجماع وقیاس پر قائم ہے، اُس کے نزدیک تمام وسائل میں اولین درجہ نقل وروایت اور آثارِ سلف کو حاصل ہے، جس پر پورے دین کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ اس کے یہاں کتاب وسنت کی مرادات اقوالِ سلف اور اُن کے متوارث مذاق کی حدود میں محدود رہ کر محض قوتِ مطالعہ سے نہیں بلکہ اساتذہ اور شیوخ کی صحبت وملازمت اور تعلیم وتربیت ہی سے متعین ہوسکتی ہیں۔ اسی کے ساتھ عقل و درایت اور تفقہ فی الدین بھی اس کے نزدیک فہمِ کتاب وسنت کا ایک بڑا اہم جزو ہے، وہ روایات کے مجموعہ سے حنفی فقہ کی روشنی میں شارع علیہ السلام کی غرض وغایت کو سامنے رکھ کر تمام روایات کو اسی کے ساتھ وابستہ کرتا ہے اور سب کو درجہ بدرجہ اپنے اپنے محل پر اس طرح چسپاں کرتا ہے کہ وہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں دکھائی دیں، اس لئے جمع بین الروایات اور تعارض کے وقت تطبیقِ احادیث اس کا خاص اصول ہے، جس کا منشاء یہ ہے کہ وہ کسی ضعیف سے ضعیف روایت کو بھی چھوڑنا اور ترک کردینا نہیں چاہتا جب تک کہ وہ قابلِ احتجاج ہو، اسی بنا پر اس جماعت کی نگاہ میں نصوصِ

شرعیہ میں کہیں تعارض اور اختلاف نہیں محسوس ہوتا بلکہ سارے کا سارا دین تعارض اور اختلاف سے مبراہ کر ایک ایسا گلدستہ دکھائی دیتا ہے جس میں ہر رنگ کے علمی و عملی پھول اپنے اپنے موقع پر کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اسی کے ساتھ بطریق اہل سلوک جو رسمیات اور رواجوں اور نمائشی حال وقال سے بیزار اور بری ہے، تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن بھی اس کے مسلک میں ضروری ہے۔اس نے اپنے منتسبین کو علم کی رفعتوں سے بھی نوازا اور عبدیت و تواضع جیسے انسانی اخلاق سے بھی مزین کیا، اور اس جماعت کے افراد ایک طرف علمی وقار، استغناء (علمی حیثیت سے) اور غناءِ نفس (اخلاقی حیثیت سے) کی بلندیوں پر فائز ہوئے وہیں فروتنی، خاکساری اور ایثار و زہد کے متواضعانہ جذبات سے بھی بھر پور ہوئے، نہ رعونت اور کبر و نخوت کا شکار ہوئے اور نہ ذلتِ نفس اور مسکنت میں گرفتار۔

وہ جہاں علم و اخلاق کی بلندیوں پر پہنچ کر عوام سے اونچے دکھائی دینے لگے، وہیں عجز و نیاز، تواضع و فروتنی اور کسر نفسی کے جوہروں سے مزین ہو کر عوام میں ملے جلے اور ایک عام آدمی کی طرح رہے، جہاں مجاہدہ و مراقبہ سے خلوت پسند ہوئے وہیں مجاہدانہ اور غازیانہ اسپرٹ نیز قومی خدمت کے جذبات سے جلوہ آرا بھی ثابت ہوئے۔

غرض علم و اخلاق، خلوت و جلوت اور مجاہدہ و جہاد کے مخلوط جذبات سے ہر دائرۂ دین میں اعتدال اور میانہ روی ان کے مسلک کی امتیازی شان بن گئی، جو علوم کی جامعیت اور اخلاق کے اعتدال کا قدرتی ثمرہ ہے، اسی لئے اُن کے محدث ہونے کے معنی فقیہ سے لڑنے یا فقیہ ہونے کے معنی محدث سے بیزار ہو جانے یا نسبتِ احسانی (تصوف پسندی) کے معنی متکلم دشمنی یا علم کلام کی حذاقت کے معنی تصوف بیزاری کے نہیں؛ بلکہ اس کے جامع مسلک کے تحت اس تعلیم گاہ کا فاضل درجہ بدرجہ بیک وقت محدث، فقیہ، مفسر، مفتی، متکلم، صوفی (محسن) اور حکیم و مربی ثابت ہوا، جس

میں زہد وقناعت کے ساتھ عدمِ تقشّف، حیا وانکسار کے ساتھ عدمِ مداہنت، رأفت و رحمت کے ساتھ امر بالمعروف ونہی عن المنکر، قلبی یکسوئی کے ساتھ قومی خدمت اور خلوت در انجمن کے ملے جلے جذبات راسخ ہو گئے۔

ادھر علم وفن اور تمام اربابِ علوم وفنون کے بارے میں اعتدال پسندی اور حقوق شناسی نیز ادائیگی حقوق کے جذبات ان میں بطور جوہر نفس پیوست ہو گئے۔

بناء بریں دینی شعبوں کے تمام اربابِ فضل وکمال اور راسخین فی العلم خواہ محدثین ہوں یا فقہاء، صوفیا ہوں یا عرفاء، متکلمین ہوں یا اصولیین، امراءِ اسلام ہوں یا خلفاء، اس کے نزدیک سب واجب الاحترام اور واجب العقیدت ہیں۔ اس لئے جذباتی رنگ سے کسی طبقہ کو بڑھانا اور کسی کو گرانا یا مدح وذم میں حدودِ شرعیہ سے بے پرواہو جانا اس کا مسلک نہیں۔ اس جامع طریق سے دارالعلوم نے اپنی علمی خدمات سے (شمال میں) سائبیریا سے لیکر (جنوب میں) سماترا اور جاوا تک اور (مشرق میں) برما سے لے کر (مغربی سمتوں میں) عرب اور افریقہ تک علومِ نبویہ کی روشنی پھیلا دی جس سے پاکیزہ اخلاق کی شاہراہیں صاف نظر آنے لگیں۔

دوسری طرف سیاسی خدمات سے بھی اس کے فضلاء نے کسی وقت بھی پہلوتہی نہیں کی؛ حتیٰ کہ ۱۸۰۳ء سے ۱۹۴۷ء تک اس جماعت کے افراد نے اپنے اپنے رنگ میں بڑی سے بڑی قربانیاں پیش کیں جو تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ کسی وقت بھی ان بزرگوں کی سیاسی اور مجاہدانہ خدمات پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا، بالخصوص تیرھویں صدی ہجری کے نصفِ آخر میں مغلیہ حکومت کے زوال کی ساعتوں میں خصوصیت سے حضرت شیخ المشائخ مولانا حاجی محمد امداد اللہ صاحب قدس سرہ کی سرپرستی میں ان کے ان دو مریدانِ خاص حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور ان کے منتسبین ومتوسلین کی مساعیٔ انقلاب، جہادی اقدامات اور حریت واستقلالِ ملّی کی فدا کارانہ جدوجہد اور گرفتاریوں کے وارنٹ پر

ان کی قید و بند وغیرہ وہ تاریخی حقائق ہیں جو نہ جھٹلائی جاسکتی ہیں نہ بھلائی جاسکتی ہیں۔

جو لوگ ان حالات پر محض اس لئے پردہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ وہ خود اس راہِ سرفروشی میں قبول نہیں کیے گئے تو اس سے خود ان ہی کی نامقبولیت میں اضافہ ہوگا۔ اس بارہ میں ہندوستان کی تاریخ سے باخبر اربابِ تحقیق کے نزدیک ایسی تحریریں خواہ وہ کسی دیوبندی النسبت کی ہوں یا غیر دیوبندی کی، جن سے ان بزرگوں کی ان جہادی خدمات کی نفی ہوتی ہونا قابل اعتبار اور قطعاً نا قابل التفات ہیں۔

ان خدمات کا سلسلہ مسلسل آگے تک بھی چلا اور انہیں متوارث جذبات کے ساتھ ان بزرگوں کے اخلافِ رشید بھی سرفروشانہ انداز سے قومی اور ملی خدمات کے سلسلہ میں آگے آتے رہے، خواہ وہ تحریکِ خلافت ہو یا استخلاصِ وطن اور بروقت انقلابی اقدامات میں اپنے منصب کے عین مطابق حصہ لیا۔

مختصر یہ کہ علم و اخلاق کی جامعیت اس جماعت کا طرۂ امتیاز رہا اور وسعتِ نظری، روشن ضمیری اور رواداری کے ساتھ دین وملت اور قوم و وطن کی خدمت اس کا مخصوص شعار، لیکن ان تمام شعبہ ہائے زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت اس جماعت میں مسئلہ تعلیم کو حاصل رہی ہے۔

جب کہ یہ تمام شعبے علم ہی کی روشنی میں صحیح طریق پر بروئے کار آسکتے تھے اور اسی پہلو کو اس نے نمایاں رکھا، اس لئے اس مسلک کی جامعیت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ جامع علم و معرفت، جامع دیانت وسیاست، جامع روایت، جامع خلوت وجلوت، جامع عبادت ومدنیت، جامع حکم وحکمت، جامع ظاہر و باطن اور جامع حال وقال ہے، اس مسلک کو جو سلف و خلف کی نسبتوں سے حاصل شدہ ہے، اگر اصطلاحی الفاظ میں لایا جائے تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیناً مسلم، فرقتاً اہل سنت والجماعت، مذہباً حنفی، مشرباً صوفی، کلاماً اشعری، سلوکاً چشتی؛ بلکہ جامع سلاسل، فکراً ولی اللّٰہی، اصولاً قاسمی، فروعاً رشیدی اور نسبتاً دیوبندی ہے۔

اس سلسلہ میں چونکہ ''مسلکِ دار العلوم'' کے نام سے ہم نے ایک مستقل رسالہ لکھ دیا ہے اس لئے اس موقع پر اس کی زیادہ تفصیل کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، اس کے بعض جامع جملے اس تحریر میں لے لئے گئے ہیں، تفصیلات کے لئے اس رسالہ کی طرف مراجعت کی جاسکتی ہے۔

پانچویں بحث: دار العلوم کے اعلیٰ مناصب

دار العلوم میں اعلیٰ ذمہ دارانہ عہدے چار رہے ہیں:

(۱) سرپرستی۔ (۲) اہتمام۔ (۳) صدارتِ تدریس۔ (۴) افتاء۔

ان چاروں عہدوں کے لئے ہمیشہ ایسی ممتاز شخصیتوں کا انتخاب عمل میں آتا رہا ہے جو اہل اللہ، اہل دین و اہل تقویٰ اور جامع شریعت و طریقت ہوا کرتے تھے۔

دار العلوم کے سرپرست

دار العلوم کے سب سے پہلے سرپرست بانیٔ دار العلوم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ العزیز تھے، جن کا پر امن وبابرکت عہد آج تک احاطہ دار العلوم میں ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ ۱۲۸۳ھ سے ۱۲۹۷ھ (۱۸۷۹ء) تک سرپرست رہے۔ حضرت نانوتویؒ کی وفات کے بعد دوسرے سرپرست حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ مقرر ہوئے۔ آپ کے عہد کی برکات دار العلوم پر نورِ آفتاب کی طرح چھائی رہیں، جن سے ظلمتوں کو قرار پکڑنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ آپ ۱۲۹۸ھ سے تا حیات ۱۳۲۳ھ (۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۵ء) تک سرپرست رہے۔ آپ کے بعد ۱۳۲۴ھ (۱۹۰۶ء) میں باجماعِ اہل دار العلوم شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب نور اللہ مرقدہٗ سرپرست تسلیم کئے گئے، جن کے نورانی آثار سے آج تک دار العلوم کا احاطہ چمک رہا ہے۔ ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۴ء) میں جب آپ حجاز تشریف لے گئے تو حضرت اقدس مولانا عبد الرحیم صاحب رائے پوری

قدس سرہ کو سرپرست تسلیم کیا گیا۔آپ ۱۳۳۴ھ (۱۹۱۵ء) سے ۱۳۳۷ھ (۱۹۱۸ء) تک رہے، لیکن جب حضرت شیخ الہند مالٹا سے رہا ہو کر واپس تشریف نہ لائے تو پھر آپ ہی ۱۳۳۹ھ (۱۹۲۰ء) تک سرپرست رہے۔

آپ کے بعد ۱۳۴۴ھ (۱۹۲۵ء) میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ العزیز سرپرست ہوئے، آپ نے اپنی باطنی توجہات اور صرفِ ہمت کے ذریعہ دارالعلوم کے جہاز کو فتن وحوادث کے تھپیڑوں سے محفوظ رکھا، ۱۳۵۴ھ (۱۹۳۵ء) میں اپنے گوناگوں مشاغل اور اس وقت کے اندرونی حالات کی وجہ سے حضرت تھانوی قدس سرہ العزیز نے سرپرستی سے استعفیٰ دے دیا۔اس کے بعد سے آج تک سرپرست کے نام سے کسی شخصیت کا انتخاب عمل میں نہیں آیا۔

دارالعلوم کے مہتمم

اہتمام کے عہدہ پر بھی ہمیشہ اپنے وقت کے منتخب مخصوص حضرات کا انتخاب ہوتا رہا، سب سے پہلے مہتمم حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی تھے، آپ کا حلقۂ اثر دیوبند اور اطراف وجوانب میں بہت وسیع تھا، آپ اولاً محرم ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۷ء) سے رجب ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۸ء) تک مہتمم رہے۔ثانیاً ۱۲۸۶ھ (۱۸۷۰ء) تا ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۰ء) اور ثالثاً ربیع الاول ۱۳۰۶ھ (۱۸۸۹ء) تا شعبان ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۳ء) مہتمم رہے۔

آپ کے اہتمامِ اول کے بعد حضرت اقدس مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندیؒ عہدۂ اہتمام پر فائز ہوئے، آپ طریقت وحقیقت کے ایک بلند پایہ شیخ اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی دہلوی نوراللہ مرقدہٗ کے ارشد خلیفہ تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ ان پر فخر کیا کرتے تھے۔موصوف بہت سے اکابرِ دارالعلوم مثلاً حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ اور حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب سابق ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند وغیرہ کے شیخ طریقت تھے۔

دارالعلوم کی معنوی ترقیات میں حضرت ممدوح کی تربیت وصرفِ ہمت کا اسی طرح حصہ ہے جس طرح قطبِ علم عارف باللہ حضرت مولانا نانوتویؒ اور قطبِ الارشاد عارف باللہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کا تھا۔ آپ اولاً شعبان ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۸ء) اور ثانیاً ذی قعدہ ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۳ء) تا ربیع الاول ۱۳۰۶ھ (۱۸۸۹ء) دارالعلوم کے مہتمم رہے، آپ کے بعد تیسرے مہتمم حاجی محمد فضل حق صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ مقرر ہوئے، جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، اور ایک صالح ومتقی بزرگ تھے۔ آپ شعبان ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۳ء) سے ذیقعدہ ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۴ء) تک مہتمم رہے۔

آپ کے بعد ذی الحجہ ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۴ء) میں حضرت مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے چوتھے مہتمم ہوئے، آپ حضرت نانوتوی قدس سرہ کے رشتہ کے بھائی اور جہادِ شاملی کے ردیف کی حیثیت رکھتے تھے، نہایت ہی باخدا بزرگ اور صاحبِ دیانت وتقویٰ لوگوں میں تھے۔ آپ کے زمانۂ اہتمام کی انتہا جمادی الاول ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۵ء) ہے۔

آپ کے بعد جمادی الثانی ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۵ء) میں فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ ابن حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ دارالعلوم کے پانچویں مہتمم بنائے گئے، آپؒ کا عہد، سابقہ تمام عہدوں سے زیادہ طویل، پرشوکت اور پر ہیبت دور گذرا ہے، یہ دور چالیس برس تک ممتد رہا، اور اس چالیس سالہ مدت میں دارالعلوم نے نمایاں ترقی کی، جیسا کہ اس کی تفصیل آئندہ ابواب میں آرہی ہے۔

حضرت ممدوحؒ کی ذاتی وآبائی وجاہت نے بہت سے پیدا شدہ فتنوں کو دبا کر دارالعلوم کے حلقہ اثر کو وسیع تر بنایا، مالی امدادیں کثیر مقدار میں بڑھیں، بڑی بڑی عمارتیں مثلاً دارالطلبہ قدیم، دارالطلبہ جدید کا کچھ حصہ، دارالحدیث تحتانی، مسجد دارالعلوم، کتب خانہ، دارالمشورہ، قدیم مہمان خانہ اور مختلف احاطے ارضِ دارالعلوم پر نمایاں ہوئے، کارکنوں میں اضافہ ہوا، حاصل یہ کہ اس درس گاہ نے مدرسہ سے

دارالعلوم اور دارالعلوم سے ایک جامعہ کی صورت اسی زمانے میں اختیار کی جس کے ماتحت آج بہت سے اضلاع اور صوبجات کے بہت سے ادارے چل رہے ہیں۔

دارالعلوم کے صدر المدرسین

(الف) دارالعلوم دیوبند کی صدارتِ تدریس پر سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ فائز ہوئے جو اپنی جامعیتِ علومِ ظاہرہ و باطنہ کے سبب شاہ عبدالعزیز ثانی تسلیم کئے جاتے تھے۔ آپ ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۷ء) سے ربیع الاول ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۶ء) تک اس عہدے پر فائز رہے۔

(ب) حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے انتقال کے بعد ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۶ء) میں حضرت مولانا سید احمد صاحب دہلویؒ صدر مدرس مقرر فرمائے گئے جو علومِ منقولہ کے ساتھ علومِ معقولہ خصوصاً علم ہیئت و ریاضی میں امامِ وقت تسلیم کئے جاتے تھے۔ آپ ۱۳۰۷ھ (۱۸۸۹ء) تک صدارتِ تدریس پر فائز رہے۔

(ج) ۱۳۰۸ھ (۱۸۹۰ء) میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندیؒ دارالعلوم کے تیسرے صدر مدرس مقرر فرمائے گئے۔ آپ نے پچیس برس تک مسلسل حدیث اور تفسیر کلامِ ربانی کے علوم کے دریا بہائے اور تشنگانِ علوم اس بحر ذخار سے سیراب ہو کر دوسروں کو سیراب کرتے رہے۔ آپ ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۴ء) تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ آپ سے فیض یافتہ تمام اپنے دور کے بے نظیر محدث، مفسر، فقیہ، متکلم، ادیب اور ہر فن میں مہارتِ تامہ رکھنے والے تھے، اور یہ واقعہ ہے کہ آپ کے تلامذہ سے ہندو پاک اور دوسرے ممالک میں علم و عمل کو بہت فروغ حاصل ہوا۔

(د) ۱۳۳۴ھ (۱۹۱۵ء) میں بحر العلوم، محدثِ دوراں، علامہ عصر، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ قائم مقام صدر مدرس مقرر فرمائے گئے، آپ

شیخ الہند کے ممتاز تلامذہ میں شمار ہوتے تھے۔ پھر ۱۳۳۹ھ (۱۹۱۹ء) میں موصوف مستقل صدر مدرس ہوئے، آپ اپنے علم وعمل، زہد وتقویٰ، تبحر وتفقہ اور حفظ وروایت کے لحاظ سے یگانۂ روزگار تھے۔ آپ ۱۳۳۴ھ سے لیکر ۱۳۳۸ھ تک قائم مقام صدر مدرس اور ۱۳۳۹ھ سے اوائل ۱۳۴۶ھ (۱۹۲۶ء) تک صدر مدرس رہے۔

(۵) شوال ۱۳۴۶ھ (۱۹۲۶ء) میں استاذ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ مسند نشین صدارتِ تدریس ہوئے۔ آپ کا بھی حضرت شیخ الہندؒ کے ممتاز تلامذہ میں شمار ہے۔ آپ کے علم وفضل اور اخلاقِ فاضلہ سے ہزاروں تشنگانِ علوم نے ظاہری وباطنی تکمیل کر کے اپنی علمی وروحانی پیاس بجھائی۔ آپ جمادی الاول ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۸ء) تک اس عہدے پر فائز رہے۔

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی وفات کے وقت حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ دارالعلوم میں مسند صدارت تدریس کی زینت تھے۔

دارالعلوم کے مفتی

(الف) دارالعلوم دیوبند میں درس وتدریس کے علاوہ افتاء کا کام بھی ابتدا ہی سے ہوتا رہا۔ سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ جو دارالعلوم کے صدر المدرسین تھے وہی اس اہم کام کو بھی انجام دیتے رہے، چناں چہ آپ نے ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۰۱ھ تک اس خدمت کو بھی انجام دیا۔

(ب) اس کے بعد کسی مخصوص شخصیت کے ذمہ یہ کام نہیں رکھا گیا؛ بلکہ مختلف اساتذۂ کرام سے افتاء کا کام لیا جاتا رہا، چناں چہ ۱۳۰۲ھ سے ۱۳۰۹ھ تک اسی طرح کام چلتا رہا۔

(ج) استفتاؤں کی تعداد بڑھ کر غیر معمولی حد تک پہنچ جانے کے سبب باقاعدہ

ایک دارالافتاء کی بنیاد ڈالی گئی اور ۱۳۱۰ھ میں دارالافتاء قائم کر کے حضرت اقدس مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندی قدس سرہ، کو مفتی کا عہدہ سپرد کر دیا گیا۔ آپ کے زمانے میں دارالافتاء سے (۱۳۳۰ھ سے ۱۳۶۴ھ تک) ۱۶ برس کی مدت میں ۴۲۶۲۱ فتاویٰ روانہ کئے گئے۔ ۱۳۳۰ھ سے پہلے کا کوئی ریکارڈ محفوظ نہیں ملتا اسلئے ۱۳۱۰ھ سے ۱۳۲۹ھ تک انیس (۱۹) سال کے فتاویٰ کی تعداد سامنے نہیں آسکی۔

(د) ۱۳۴۷ھ میں حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ صدر مفتی اور حضرت مولانا مفتی ریاض الدین صاحبؒ مفتی کی حیثیت سے دارالافتاء کے ذمہ دار بن گئے، یہ دور ۱۳۴۸ھ تک رہا اور اس دور میں ۴۴۴۸ فتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے۔

(ہ) ۱۳۴۹ھ میں تنہا حضرت مولانا مفتی ریاض الدین صاحب کی ذمہ داری میں دارالافتاء آگیا اور اس دور میں ۲۴۵۳ فتاویٰ روانہ کئے گئے۔

(و) ۱۳۵۰ھ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ (سابق مفتی اعظم پاکستان وناظم اعلیٰ دارالعلوم کراچی) مفتیٔ دارالعلوم بنائے گئے۔ آپ اس عہدہ پر ۱۳۵۴ھ تک فائز رہے۔ آپ کے زمانے میں ۱۸۳۹۵ فتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے۔

(ز) ۱۳۵۵ھ میں حضرت مولانا محمد سہول صاحب بھاگلپوری مفتی مقرر فرمائے گئے، آپ ۱۳۵۷ھ تک مفتی رہے، آپ کے دور میں ۱۵۱۸۵ فتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے۔

(ح) ۱۳۵۸ھ میں حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب میرٹھی مفتی مقرر فرمائے گئے، آپ ۱۳۵۹ھ تک مفتی رہے، آپ کے دور میں ۱۵۱۸۵ فتاویٰ دارالعلوم سے روانہ کئے گئے۔

(ط) ۱۳۵۹ھ میں دوبارہ حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مفتی مقرر فرمائے گئے، اور ۱۳۶۱ھ تک آپ مفتی رہے، اس دوران ۶۸۷۱ افتاویٰ دارالعلوم سے روانہ کئے گئے۔

(ی) ۱۳۶۲ھ میں حضرت مولانا محمد فاروق صاحب انبہٹوی ابن حضرت مولانا صدیق احمد صاحب مفتی مالیر کوٹلہ، دارالعلوم کے مفتی مقرر فرمائے گئے، آپ ۱۳۶۳ھ تک مفتی رہے۔ آپ کے دور میں ۸۴۲۷ فتاویٰ روانہ کئے گئے۔

(ک) ۱۳۶۴ھ میں حضرت مولانا اعزاز علی صاحب مفتی مقرر فرمائے گئے، آپ ۱۳۶۶ھ تک مفتی رہے، اور آپ کے زمانے میں ۲۰۴۰۷ فتاویٰ دارالعلوم سے روانہ کئے گئے۔

(ل) ۱۳۶۷ھ میں حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہانپوریؒ مفتی مقرر فرمائے گئے۔ فتاویٰ میں آپ کی محنت وعرق ریزی اور شب وروز کا انہاک معروف اور زبان زد ہے۔ آپ کے زمانے میں ۱۳۸۲ھ تک ایک لاکھ ۳۷ ہزار ۵۳ فتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے۔

آپ کے بعد صدارتِ افتاء پر حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فائز ہوئے، آپ کے زمانے میں لاکھوں فتاویٰ دارالعلوم کے دارالافتاء سے جاری ہوئے۔

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کی وفات کے وقت شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہوی دارالعلوم کے صدر مفتی تھے۔

بابِ ہفتم

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب نانوتویؒ

دار العلوم دیو بند کے مسند اہتمام پر

مسند اہتمام ایک عظیم شرف

دار لعلوم دیو بند کو اللہ تعالیٰ نے جو مقبولیت اور ہر دلعزیزی عطا فرمائی ہے وہ خاص اللہ تعالیٰ کے فضل اور عنایات کی وجہ سے ہے، دنیا بھر کے مسلمان اور خاص طور سے برصغیر کے مسلمان دار العلوم سے اپنی نسبت پر فخر کرتے ہیں، دار العلوم کو ملت اسلامیہ کے علمی اور فکری ورثہ کا پاسبان سمجھتے ہیں، ملی مسائل میں انہیں دار العلوم کے موقف کا انتظار رہتا ہے، دار العلوم کے دار الافتاء سے جاری ہونے والے فتاوی امت کے لیے حرف آخر کی حیثیت رکھتے ہیں، جہاں تک تشنگانِ علوم اور طلبۂ علوم اسلامیہ کی بات ہے تو وہ دار العلوم کو اپنی راہِ طلب کی منزل اور شوق تحصیل کی معراج و منتہیٰ سمجھتے ہیں، دار العلوم میں تعلیم و تربیت کا کوئی بھی موقعہ کسی بڑی سعادت سے کم نہیں۔ اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنہیں بفضل خداوندی یہ قابل رشک موقع میسر آیا ہو۔

دار العلوم میں عہدۂ اہتمام سب سے بڑا اور پر وقار عہدہ ہے، اس عہدے پر شروع ہی سے وہ حضرات رہے ہیں جنہیں اللہ نے زہد، تقویٰ، راست گوئی کے ساتھ

بے پناہ علمی اور انتظامی صلاحیت، مؤمنانہ فراست اور مسلک دیو بند کی نبض شناسی نیز امت کے سفینہ کو کامیابی کے ساتھ ساحل مراد پر پہونچانے کا ملکہ بخشا تھا، فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے جن حضرات نے اس عہدے کو زینت بخشی، ان کا نام دیکھ کر ہی اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا حاجی سید فضل حق رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد منیر نانوتوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، اپنے علم و تقوی، زہد وورع اور انتظامی صلاحیت میں نمایاں مقام رکھتے تھے، ان حضرات کی انہی زبردست صلاحیتوں کی وجہ سے دار العلوم ایک عالمگیر ادارہ کی حیثیت سے مشہور اور متعارف ہوا، کچھ ادارہ کی عظمت اور کچھ شخصیت کی شہرت کے امتزاج نے دار العلوم کو ''اخلاص کا تاج محل'' اور ''دین متین کا قلزم عرفاں'' بنا دیا۔

یہ سچ ہے کہ دار العلوم کا مسند اہتمام خداوند کریم کا وہ عطیہ ہے جس پر جتنا بھی شکر کیا جائے کم ہے، یہ مرتبۂ بلند ان ہی لوگوں کے لیے زیبا ہے جنہیں جاہ و منصب کی طلب اور لالچ نہ ہو، قول و فعل کی یکسانیت ان کا شیوہ ہو، جنت کی کشش نے انہیں اپنا دیوانہ بنا رکھا ہو اور اصلاح امت کی فکر نے انہیں مضطرب اور بے چین کر رکھا ہو، اللہ کا شکر ہے کہ دار العلوم کو ہر زمانے میں ایسے معیاری اور برگزیدہ ارباب اہتمام میسر آئے جنہوں نے اپنے نیک کردار سے سلف کی یاد تازہ کی اور دار العلوم کی عظمت و وقار میں اضافہ فرمایا۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

تفویض اہتمام کا پس منظر

۱۳۱۱ھ میں حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ کی مصروفیات کے باعث حضرت حاجی صاحبؒ کی جگہ پر حضرت حاجی فضل حقؒ کو مہتمم مقرر کیا گیا، اس عہدہ کی عظمت

اور نازک ذمہ داریوں کی وجہ سے انہوں نے ایک سال کے بعد ہی استعفاء پیش کر دیا، اس کے بعد حضرت مولانا محمد منیر احمد نانوتویؒ کو مہتمم مقرر کیا گیا، ایک سال کے بعد وہ بھی مستعفی ہو گئے۔

اب ضرورت تھی کہ دارالعلوم کے اہتمام کے لیے کسی ایسی شخصیت کا انتخاب کیا جائے۔ جو مستقل مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ تجربہ کار، صاحبِ علم اور کامیاب منتظم بھی ہو اور جو دارالعلوم کے ابتدائی دور کی روایات کو نہ صرف یہ کہ برقرار رکھ سکے؛ بلکہ ان میں اپنی علمی اور عملی صلاحیتوں سے تازہ روح پھونک دے، یہ سب خصوصیات فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب ابن حضرت قاسم العلوم نانوتویؒ کی شخصیات میں بدرجۂ اتم موجود تھیں؛ کیوں کہ وہ عظیم باپ کے لائق و فائق فرزند تھے، انہوں نے ایک ایسے گھر میں آنکھیں کھولیں تھیں جہاں سے اسلامی تہذیب وثقافت کی بازیابی اور حفاظت دین کا دوررس منصوبہ تیار کیا گیا تھا، جس گھر کے بام ودر سے لگاتار صدائے حریت بلند کی جاچکی تھی، ملت اسلامیہ کی اصلاح اور اس میں اسلامی علوم کی روح پھونکنے کے لئے دارالعلوم دیوبند کی شکل میں عظیم ایمانی وعرفانی قلعہ کی خشت اول، اسی گھر کی ایمانی مٹیوں سے تیار ہوئی تھی، وہ اسی گھر میں پلے بڑھے، اسی ماحول میں ان کی نشوونما ہوئی، بانی دارالعلوم کے عبقری شاگردوں نے ان کے علمی وفکری تربیت کی، ان کے فکر وخیال کو صحیح سمت دی، مسلک دیوبند کی محوری شخصیت حضرت گنگوہیؒ نے ان کی قلبی اصلاح کی، حسن عمل کی چنگاری بھڑکائی اور ''ذوق ہُو'' سے آشنا کیا۔

بتایا جائے کہ دارالعلوم کے منصب اہتمام کے لئے کیا اس سے بہتر شخصیت اس وقت کوئی مل سکتی تھی؟ حضرت گنگوہیؒ کی نظر کہاں خطا کر سکتی تھی؟ آپ اس وقت دارالعلوم کے سرپرست تھے اور دارالعلوم کے نشیب وفراز سے واقف، آپ گنگوہ سے دیوبند تشریف لائے اور حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کو دارالعلوم دیوبند کا مہتمم عالی وقار مقرر فرمایا، یہ انتخاب دارالعلوم کے لئے کتنا موزوں اور مفید ثابت ہوا، اس کی

تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں:

''مدرسہ دیوبند کا اہتمام حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب قدس سرہ کے دست حق پرست میں تھا اور حضرت اقدس مولانا نانوتوی قدس سرہ کی حیات میں ہی مہتمم رہے، حضرت کے وصال کے بعد بھی عرصہ دراز تک اہتمام کے فرائض سرانجام دیتے رہے، ان کے تقدس اور اخلاق بزرگانہ کی وجہ سے تمام کارکنان دارالعلوم ان پر متفق تھے اور نظم اجتماعی اجماعی طور پر چل رہا تھا، حضرت مولانا رفیع الدین صاحب ممدوح نے جب مکہ مکرمہ کی طرف ہجرت فرمائی تو بعد کے دو اہتماموں کے بعد جو بہت قلیل مدت رہے، بالآخر ۱۳۱۳ھ میں حضرت گنگوہیؒ جو (اس دور میں دارالعلوم کے سرپرست اور پوری جماعت دیوبند کے سید الطائفہ تھے) دیوبند تشریف لائے دارالعلوم میں قیام فرمایا، باہر سے بعض ذی وجاہت افراد جیسے نواب محمود علی خاں صاحب رئیس چھتاری وغیرہ کو بھی دعوت دی اور اہتمام کی باگ ڈور حضرت فخر الاسلام مولانا محمد احمد صاحبؒ کے سپرد فرمائی جس سے بعض اختلاف جو قصبہ اور مدرسہ کے درمیان پیدا ہو گئے تھے بے اثر ہو گئے اور چند سال کے بعد کلیۃً منعدم ہو گئے اور دارالعلوم کی جانب میں یکجہتی اور قوت پیدا ہو گئی، حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ نزاعات کے ختم ہونے کی اس کے سوا کوئی صورت میرے دل میں نہیں آتی کہ اہتمام مولانا محمد احمد کے سپرد کر دیا جائے اور میں نے اس معاملہ کو گیارہ مرتبہ حق تعالیٰ کے سامنے پیش کیا، ہر دفعہ مجھے یہی جواب ملا کہ مدرسہ دیوبند کی ترقی مولانا احمدؒ کے ہاتھ پر مقدر ہے، ان پر مخالفت کا زور گھٹ گیا اور یہ حضرات بھی مخالفت سے

مایوس یا مطمئن ہو کر یکسو ہو گئے، یہ روایت مجھ سے مولوی محمود صاحب مرحوم رائے پوری نے بیان فرمائی، بالآخر حضرت گنگوہیؒ کے اس الہامی مقولہ کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہو گئے)[1]"۔

حضرت گنگوہیؒ کی تشریف آوری

عہدۂ اہتمام کے تقرر نیز جامعہ کے احوال وکوائف کا قریب سے جائزہ لینے کے لیے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی دیوبند تشریف آوری کا واقعہ "تاریخ دارالعلوم" میں کچھ اس طرح ہے:

"پچھلے چند سالوں میں اہتمام میں جو آئے دن تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں، ان سے دارالعلوم کے نظام میں اختلال پیدا ہو گیا تھا، حضرت مولانا گنگوہیؒ جو اس وقت دارالعلوم کے سرپرست تھے، دیوبند تشریف لائے اور ایک ہفتہ قیام فرمایا، دورانِ قیام کی جو کیفیت روداد میں درج ہے وہ یہ ہے کہ "چوں کہ اکثر مسلمانوں اور معاونین مدرسہ کو حضرت مولانا گنگوہیؒ کی تشریف آوری کا عرصے سے انتظار تھا، اس لئے اطراف و جوانب دہلی، مرادآباد، میرٹھ، مظفرنگر، سہارنپور وغیرہ سے علماء وصلحاء ودیگر اہل اسلام ذی وجاہت جوق درجوق تشریف لائے، نواب محمود علی خاں صاحب رئیس چھتاری (علی گڑھ) اپنے ہمراہ شیخ بشارت علی صاحب منصرم ریاست کو لائے تھے، غرض کہ ایک عجیب بابرکت اور پرشوکت مجمع اہل اسلام جمع ہو گیا تھا، نواب صاحب نے مدرسہ کے اندرونی و بیرونی حالات کی کماحقہٗ تحقیق فرمائی اور جملہ حساب وکتاب وکاغذات وکتب خانہ وغیرہ کی جانچ خود اور بواسطہ شیخ بشارت علی صاحب فرمائی اور موجوداتِ خزانہ کو بھی بہت تدقیق و

---

[1] پچاس مثالی شخصیات، ص ۸۸۔

جزرسی سے دیکھا، الحمد اللہ سب طرح درست پایا۔
اس کے بعد حضرت مولانا نے انتظامِ مدرسہ کی جانب توجہ فرمائی اور حسب اتفاق رائے چھ حضرات کو جو علم و عقل اور وجاہت ظاہری اور علمی و انتظامی لیاقت کے اعتبار سے ممتاز ہیں داخل اہل مشورہ کیا، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: مولوی میر احمد حسن صاحب امروہوی مدرس اول مدرسہ اسلامیہ امروہہ، نواب مولوی محی الدین خاں صاحب مرادآبادی، مہتمم مدرسہ اسلامیہ مرادآباد، مولوی عبدالحق صاحب پور قاضی وکیل ریاست رتلام، مولوی شاہ مظہر حسن گنگوہی قدوسی، حکیم محمد اسماعیل صاحب گنگوہی مقیم بمبئی المعروف بہ حکیم اجمیری، شاہ سعید احمد صاحب انبیٹھوی اتالیق ولی عہد ریاست مالیر کوٹلہ، نیز دارالعلوم کے مہتمم اور صدر مدرس کو بھی بحیثیت عہدہ اہل مشورہ میں شامل فرمایا[1]"۔

حضرت فخر الاسلامؒ کے دورِ اہتمام کی علمی ترقیات

حضرت فخر الاسلامؒ کا دور اہتمام دارالعلوم میں علمی ترقیات کے لحاظ سے دارالعلوم کا سب سے سنہرا دور ہے، بانیانِ دارالعلوم نے تاسیس دارالعلوم کے وقت اسلامی علوم کی نشأۃ ثانیہ اور غیر معمولی ترقی کا جو خواب دیکھا تھا وہ اسی دور میں شرمندۂ تعبیر ہوا، اس دور کی علمی ترقیات کا دراصل راز دارالعلوم کے مختلف شعبوں میں اصحاب فضل وکمال کا حسین اجتماع اور جھرمٹ تھا، دارالعلوم کی سرپرستی قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نور اللہ مرقدہ فرمارہے تھے، جو ہندوستان میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لیے کوشش کرنے والے علماء واکابرین میں سرفہرست رہے، اور جنہیں بے پناہ تفقہ فی الدین کی بناء پر حضرت نانوتویؒ نے "ابوحنیفۂ عصر" کا لقب عطا فرمایا تھا۔

---

[1] تاریخ دارالعلوم، ج:۱، ص:۲۰۳-۲۰۴۔

دوسری طرف دار العلوم کی مسند صدارت تدریس پر ایسی شخصیت جلوہ افروز تھی، جن کی شہرت وعظمت کا غلغلہ پورے عالم میں بلند ہے، جو خود دار العلوم کا پہلا شیریں اور ذائقہ دار پھل ہے اور ساتھ ہی دار العلوم کے لیے سرمایۂ ناز اور افتخار بھی، وہ شخصیت ہے شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کی، تیسری طرف دار العلوم کی مجلس شوریٰ میں ایسی نابغۂ روزگار اور ماہرین علوم شخصیات جمع تھیں، جن میں سے ہر فرد اپنی جگہ ایک انجمن ہے، حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور شیخ الارشاد حضرت مولانا عبدالرحیم رائے پوری، شیخ الادب حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ وغیرہ ایسے نام ہیں جو خود عظمت وعبقریت کا ایک نشان بن گئے ہیں، چوتھی طرف دار العلوم کی مسند تدریس پر ایسے لالہ وگل جمع تھے، جن کی دلنواز خوشبوؤں سے گلستان علم وفن مہک رہے تھے، الغرض یہ وہ دور تھا کہ جس طرف دیکھیے کمال ہی کمال، جس گوشے سے دیکھیے، لطف ہی لطف۔

اس دور کی علمی خصوصیات اور روحانی کیفیات کے بارے میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رقم طراز ہیں:

> ”اس وقت دار العلوم دیوبند ائمۂ فن علماء اور اولیاء واتقیاء کا ایک بے مثال گہوارہ تھا، ایک طرف نمونۂ سلف قدوۃ المشائخ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ صدر مدرس دار العلوم کا حلقۂ درس حافظ ابن حجر اور شیخ الاسلام نووی کے حلقۂ درس کی مثال تھی تو دوسری طرف شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا حلقۂ درس امام غزالی اور رازی کی یاد تازہ کرتا تھا، ایک طرف شیخ المشائخ مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحبؒ کا حلقۂ فتویٰ و درس حدیث وتفسیر اور اس کے ساتھ حلقۂ اصلاح وارشاد اور سالکانِ طریقت کی تربیت کا بے نظیر سلسلہ جاری تھا تو دوسری طرف یادگار سلف عالم ربانی حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ کا درسِ حدیث وفقہ اور

نہایت مفید عام تصانیف کا سلسلہ جاری تھا، اسی کے ساتھ عام اصلاح خلق کے لیے ارشاد و تربیت کا ایک بڑا حلقہ تھا جس سے ہزارہا بندگانِ خدا کی اصلاح ہوتی تھی اوران میں دینی انقلاب نمایاں نظر آتا تھا۔

شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب اور شیخ المعقول والمنقول حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی اور حضرت مولانا رسول خاں صاحب ہزاروی رحمۃ اللہ علیہم اس زمانے کے متوسط مدرسین میں شمار ہوتے تھے، رئیس المناظرین حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب اس وقت ناظم تعلیمات تھے، فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے صدر مہتمم تھے اور اس کے ساتھ ہمیشہ ایک سبق پڑھانے کا معمول تھا، نائب مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب تھے، جن کے عربی قصائد اور عظیم الشان تصنیف ''دنیا میں اسلام کیوں کر پھیلا؟'' ہر طبقے کے علماء میں قبول عام حاصل کر چکے ہیں، غرض ہر طرف بزرگان سلف کے نمونے اور پیکر علم وعمل ستاروں کی طرح درخشاں نظر آتے تھے، جن کے چہرے دیکھ کر خدا یاد آتا تھا، ان کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہیں کہ: ع

ایک محفل تھی فرشتوں کی، جو برخواست ہوئی![1]

اس دور کی کچھ نمایاں علمی ترقیوں کا تذکرہ درج ذیل ہیں:

کچھ نئے تعلیمی شعبہ جات کا قیام

حضرت فخر الاسلامؒ نے دارالعلوم کے ہمہ گیر مقاصد اور اہداف کو بروئے کار لانے کے لیے مجلس شوریٰ کے مشورے سے کئی نئے تعلیمی شعبہ جات قائم کیے، ذیل میں ایسے شعبوں کا مختصر تعارف درج ہے:

---

[1] تاریخ دارالعلوم، ج:۱،ص: ۲۵۰-۲۵۱۔

شعبۂ تجوید کا قیام

یہ بجائے خود ایک حقیقت ہے کہ علمائے دیو بند نے امت کا رشتہ قرآن کریم سے جوڑنے کی نمایاں کوششیں کیں، قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیریں لکھیں اور قرآن کریم کو ایک عملی کتاب کی حیثیت سے متعارف کرایا، اسی تناظر میں مسلم نونہالوں کو قرآن کریم کی تلاوت کے اصول وضوابط اور اس کے نشیب وفراز سے واقف کرانے کی ضرورت کئی سالوں سے محسوس کی جارہی تھی مگر قلت آمدنی کے باعث یہ شعبہ قائم نہیں کیا جاسکا تھا، ۱۳۲۱ھ میں مجلس شوریٰ نے بے سروسامانی کے عالم میں ہی اس شعبہ کے قیام کی تجویز منظور فرمائی، تاریخ دارالعلوم میں ہے:

"دارالعلوم میں عرصے سے تجوید وقراءت کی تعلیم جاری کرنے کی تجویز تھی اور متعدد مرتبہ اس کے لئے سعی کی جاچکی تھی؛ مگر خاص اس مد میں آمدنی نہ ہونے کے باعث شعبۂ تجوید کے اجراء میں کامیابی نہ ہوسکی تھی، اس سال میں ادھر تو مجلس شوریٰ نے توکلاً علی اللہ اس شعبے کے جاری کردینے کی تجویز منظور کی اور اُدھر غیب سے اللہ تعالیٰ نے یہ سامان پیدا کردیا کہ قاضی علیم الدین صاحب رئیس شاملی نے اپنی جائیداد دارالعلوم کے لئے وقف کردی جس کی آمدنی پچاس روپئے ماہانہ تھی، واقف نے اس آمدنی کو تجوید وقراءت کے لئے مخصوص قرار دیا، قاری عبدالوحید خاں الہ آبادی کو جو قاری عبدالرحمٰن مکی کے ارشد تلامذہ میں تھے دارالعلوم میں قراءت کی تعلیم پر مامور کیا گیا[1]"۔

شعبۂ تجوید کے نامور استاذ قاری عبدالوحید خاں الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ تاریخ دارالعلوم میں ان الفاظ میں درج ہے:

---

[1] تاریخ دارالعلوم، جلد:۱،ص:۲۰۸۔

''قاری عبدالوحید خاںؒ کے فیضانِ تعلیم کا حلقہ بڑا وسیع ہے، دارالعلوم میں تجوید کی تعلیم مدت سے لازمی ہے، اس لئے فضلائے دارالعلوم میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو تجوید وقراءت سے محروم اور قاری عبدالوحید صاحب یا ان کے تلامذہ سے مستفیض نہ ہوا[1]''۔

شعبۂ تجوید کا پہلا طالب علم

اس شعبہ کی ابتداء جس حال میں ہوئی، اس نے دارالعلوم کے آغاز کی یاد دلا دی، دارالعلوم کا آغاز ایک طالب علم اور ایک استاذ سے ہوا تھا، ٹھیک اسی طرح شعبۂ تجوید کا آغاز بھی ایک طالب علم اور ایک استاذ ہی سے ہوا، اور جس طرح دارالعلوم کے پہلے طالب علم نے علمی دنیا میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور لوگ انہیں ''شیخ الہند'' کہنے پر مجبور ہوئے، اسی طرح شعبۂ تجوید کے پہلے طالب علم نے بھی ایک دنیا کو اپنے علم وفضل سے متاثر کیا، وہ محض ایک حافظ اور قاری ہی بن کر نہ رہے؛ بلکہ قرآنی دعوت کی چنگاری اپنے سینے میں لیے، دنیا کے کونے کونے میں پہونچے، اور خوب فائدہ پہونچایا، دنیا انہیں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کے نام سے جانتی ہے۔

تاریخ دارالعلوم میں اس لطیفہ کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے:

''یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح دارالعلوم کا افتتاح ایک طالب علم اور ایک استاذ سے ہوا تھا، بالکل اسی طرح شعبۂ تجوید کا آغاز بھی ایک استاذ اور ایک طالب علم سے ہوا، یہ طالب علم جس نے دارالعلوم کی فضا میں سب سے پہلے قرآن مجید کو تجوید سے پڑھا، آگے چل کر اپنے عہد کا مشہور ترین قاری اور عالم بنا اور آج وہ حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے نام سے عالم اسلام میں روشناس ہیں[2]''۔

---

[1] تاریخ دارالعلوم ج:۱ص:۲۰۸۔ [2] ایضاً ج:۱ص:۲۰۸۔

شعبۂ تبلیغ کا قیام

سب جانتے ہیں کہ دارالعلوم کے قیام کا سب سے بڑا مقصد اسلام کی حفاظت اور اس کی تبلیغ اور دفاع تھا، بانیانِ دارالعلوم اور دارالعلوم کے فضلاء نے دین اسلام کے تحفظ و دفاع اور اس کی تبلیغ واشاعت میں جو سرفروشانہ خدمات انجام دی ہیں، وہ تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں، روزِ اول سے دارالعلوم کی چہار دیواری میں طلبہ میں جو روح پھونکی جارہی تھی اور جو اسپرٹ انہیں فراہم کیا گیا تھا، وہ یہی اسلام کی حفاظت واشاعت کی روح واسپرٹ تھی؛ البتہ اس کام کے لیے دارالعلوم میں باضابطہ ایسا کوئی شعبہ قائم نہیں کیا گیا تھا، دارالعلوم کے اساتذہ وطلبہ اپنی ذاتی دلچسپی سے یہ فریضہ انجام دیتے آرہے تھے۔

۱۳۲۵ھ میں جب آریہ سماج کی اسلام مخالف مہم نے زور پکڑا اور اس کی جارحانہ سرگرمیاں حد سے بڑھ گئیں تو مجلس شوری نے دارالعلوم میں شعبۂ تبلیغ کے قیام کی ضرورت محسوس کی اور اسی شعبہ میں ایسے علماء وفضلاء جمع کیے گئے جو باطل فرقوں کے مکر وفریب سے واقف ہو کر ان پر اسلام کو حقانیت ثابت کریں اور ان پر اللہ کی حجت مکمل کریں۔

آریہ سماج کی تردید کو پیش نظر رکھ کر ایسے علماء رکھے گئے جو سنسکرت سے واقف ہوں، تاریخ دارالعلوم میں اس شعبہ کے قیام پر یوں روشنی ڈالی گئی ہے:

> ”قیامِ دارالعلوم کے مقاصد میں ایک اہم مقصد اسلام کی تبلیغ واشاعت اور تحفظ و دفاع کا کام بھی شامل تھا، چناں چہ شروع ہی سے اس پر عمل بھی جاری تھا، مگر اب تک یہ کام رسمی قیود وضوابط سے آزاد تھا، اور اس کا دائرہ صرف مسلمانوں میں اقدامی تبلیغ کی حد تک محدود تھا، دارالعلوم کے اساتذہ اور طلباء حسب ضرورت اور تا بحدّ استطاعت بطور خود یہ خدمت انجام دیتے

تھے، ۱۳۲۵ھ میں جب آریہ سماج کی غیر معمولی جارحانہ سرگرمیاں بڑھ گئیں تو ضرورت ہوئی کہ تبلیغ کے لیے ایک مستقل شعبہ قائم کر کے تبلیغ کے دائرے کو اس کی ضروری حد تک وسیع کر دیا جائے، اس کے علاوہ دارالعلوم میں بھی ایسے طلباء تیار کیے جائیں جو وعظ و پند کے علاوہ تقریر و مناظرہ میں معترضین ومخالفین کا کما حقہ مقابلہ کر سکیں؛ چناں چہ اس کے لیے مختلف مذاہب سے واقفیت بہم پہنچانے کے لیے شعبۂ تبلیغ کا اجراء عمل میں لایا گیا، اور ایک مدت تک اس میں سنسکرت کے بعض فضلاء بطور معلم کے رکھے گئے[1]"۔

آریہ سماج کا یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ اس کی مدافعت کے لیے صرف "دفاعی انداز" کافی نہ تھا، اس کے لیے اقدامی طریق کار کے طور پر مبلغین کو آریہ مذہب سے براہ راست واقفیت پیدا کرانے کے لیے سنسکرت کا انتظام کیا گیا، مولوی ابورحمت صاحب میرٹھی جو سنسکرت میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے، ان کو بلا کر مبلغین کی تعلیم کا کام سپرد کیا گیا، اس زمانے میں اتفاق سے ڈاکٹر غلام محمد صاحب نے بھی اپنی خدمات پیش کیں، موصوف آریہ سماج کے تبلیغی مشن کے زبردست رکن اور سنسکرت کے نامور فاضل تھے، اور اسی زمانے میں اسلامی محاسن سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے، ڈاکٹر صاحب کی توجہ اور محنت سے بہت تھوڑے عرصے میں دارالعلوم کے طلبہ میں ایسے مبلغین کی جماعت تیار ہوگئی جو فنِ مناظرہ کے ساتھ سنسکرت میں بھی کافی دخل رکھتی تھی، اور مخالفین کے اعتراضات کا دنداں شکن جواب دینے کے علاوہ ان کے مذہب پر براہ راست حملہ آور ہو کر خود ان کو ہی مدافعت پر مجبور کر دیتی تھی، اس کا یہ اثر ہوا کہ زیادہ عرصہ نہ گذرنے پایا تھا کہ مخالفین کی سرگرمیاں سرد پڑ گئیں اور آریہ سماج کے مشن

---

[1] تاریخ دارالعلوم، ج ۱، ص: ۲۲۶۔

نے ملک میں جو ناگوار فرقہ وارانہ مذہبی فضا پیدا کر دی تھی وہ ختم ہو کر حالات سابقہ معمول پر لوٹ آئے[1]۔

ماہنامہ القاسم کا اجراء

۱۳۳۱ھ میں حضرت فخر الاسلامؒ کے دور میں ہی اس ماہنامہ کا اجراء ہوا، اس ضرورت کا احساس سب سے پہلے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو ہوا، جو اس وقت دار العلوم دیوبند کے نائب مہتمم تھے مگر اس وقت دار العلوم کا بجٹ اس قسم کے کسی اضافے کا متحمل نہیں تھا، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا ایثار اور للٰہیت دیکھیے کہ ۱۳۲۸ھ سے لگاتار تین سال تک وہ اپنے ذاتی مصارف سے یہ مجلّہ نکالتے رہے، اور بانی دار العلوم کے نام پر اس کا نام ''القاسم'' رکھا، ۱۳۳۱ھ میں اسے دار العلوم کی طرف سے اجراء کا فیصلہ کیا گیا، ماہنامہ ''القاسم'' علمی تاریخی اور تحقیقی مضامین پر مشتمل ہوتا تھا، ماہنامہ کے ذریعہ سے علمائے دیوبند کی علمی خدمات کا شاندار تعارف ہوا۔

اس ماہنامہ میں اکابر علماء کے مضامین شائع ہوتے تھے، خود حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمہ اللہ کی مشہور کتاب ''دنیا میں اسلام کیوں کر پھیلا'' مضامین کی شکل میں سب سے پہلے اسی ماہنامہ کی رونق ہوئی، تاریخ دار العلوم میں ہے:

> ''علمائے دیوبند کے علوم و معارف اور مضامین عام مسلمانوں تک پہنچانے اور عوام الناس کو دین کے صحیح عقائد و مسائل سے باخبر کرنے کے لیے ۱۳۲۸ھ میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ اور دوسرے اکابر علماء کی زیر نگرانی بانی دار العلوم کے نام پر ''القاسم'' کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا گیا، ''القاسم'' علمی اور تاریخی مضامین کی اشاعت کے علاوہ دار العلوم کے مقاصد اور اس کی دینی و علمی خدمات سے بھی عام مسلمانوں کو

[1] تاریخ دار العلوم، ج ۱، ص ۲۶۶۔

روشناس کرانے کا ایک بڑا ذریعہ تھا، اس لیے اس کا اجراء دارالعلوم ہی کی
جانب سے ہونا چاہیے تھا، مگر ابتدائی مصارف سے دارالعلوم کو بچانے کے
لیے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ اس کو اپنے ذاتی مصارف پر اس
وقت تک چلاتے رہے جب تک اس کی مالی حالت قابل اطمینان نہیں
ہوگئی، ''القاسم'' جس وقت جاری ہوا اس وقت دیوبند میں طباعت کا کوئی
انتظام نہ تھا، چنانچہ ابتدائی پرچہ احمدی پریس علی گڈھ میں چھپوایا گیا؛ لیکن
جب رفتہ رفتہ ان مشکلات پر قابو حاصل ہوگیا اور ''القاسم'' خود اپنے پیروں
پر کھڑا ہوگیا تو اس کا تعلق دارالعلوم سے کر دیا گیا''۔
یوں تو ''القاسم'' میں شائع ہونے والا ہر مضمون بجائے خود نہایت مفید، پُراز
معلومات اور اہم ہوتا تھا مگر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کا ایک
مخصوص عنوان ''دنیا میں اسلام کیوں کر پھیلا؟''، ''القاسم'' کے مضامین میں
امتیازی حیثیت رکھتا تھا، اس عنوان کے تحت مضامین کا ایک طویل سلسلہ
برسہا برس تک ''القاسم'' میں جاری رہا ہو جو حضرت ممدوح کی وفات کے
بعد ''اشاعتِ اسلام'' کے نام سے کتابی شکل میں چھپ گیا ہے، اس کی
افادیت اور قبول عام کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ نا تمام ہونے کے
باوجود اب تک متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں[1]''۔

ماہنامہ الرشید کا اجراء

۱۳۳۱ھ کے اوائل سے ماہنامہ ''القاسم'' دارالعلوم کی زیرِ نگرانی نکلنا شروع
ہوا، جب ماہنامہ ''القاسم'' کے مضامین کا حلقۂ اثر بڑھ گیا اور خود لکھنے والوں کی تعداد
میں بھی اضافہ ہوگیا تو فکرِ دیوبند کی دوسری مرکزی شخصیت ''قطب الارشاد حضرت
مولانا رشید احمد گنگوہیؒ'' کے نام سے ماہنامہ ''الرشید'' کے اجراء کا فیصلہ کیا گیا، ۱۳۳۱ھ

---

[1] تاریخ دارالعلوم، ج:۱،ص:۲۳۲-۲۳۳۔

میں ''القاسم'' کا تعلق براہ راست دارالعلوم سے کر دیا گیا تھا، اور ۱۳۳۲ھ میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی یادگار کے طور پر ایک دوسرے رسالہ کا اجراء ''الرشید'' کے نام سے عمل میں آیا، چونکہ ''القاسم'' کے معاونین کا حلقہ وسیع ہو چکا تھا، اس لیے ''الرشید'' کو شروع ہی سے دارالعلوم کے تحت نکالا گیا، اس سال کی روداد میں ''القاسم'' اور ''الرشید'' کی افادیت اور مضامین کے معیار کا تذکرہ مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے، جس سے فی الجملہ ان رسالوں کی علمی اور دینی حیثیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

''القاسم'' اور ''الرشید'' نے مسلمانوں کی جس قدر علمی خدمات انجام دی ہیں اور جس طرح صاف معلومات کے ذخائر بہم پہنچائے ہیں اور ہر ایک مسئلہ میں خواہ کسی علم کا ہو صحیح و بے لوث لکھا ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لیے مجلدات سنین سابقہ موجود ہیں، جس کا دل چاہے بنظر غور دیکھے اور اس کے ساتھ ان رسالوں کو بھی دیکھے جو علمی ہیں یا تاریخی و ادبی، انشاء اللہ روزِ روشن کی طرح وہ فرق جو ان دونوں رسالوں اور ان رسائل میں ہے واضح ہو جائے گا۔

ان دونوں رسالوں میں جس مضمون کے اوپر قلم اٹھایا گیا ہے، خواہ کسی فن میں ہو، محققانہ طرز کے ساتھ سلف کے ادب وشان اور ان کو واجب التعظیم، قابلِ اقتداء و تقلید سمجھنے کے ساتھ اٹھایا گیا ہے، رفتارِ زمانہ کی طرح یہ نہیں ہوا کہ مجتہد بن کر جس کی نسبت جو چاہا لکھ دیا، یا جس مسئلہ میں جو چاہے رائے قائم کر لی، ادبیات و تاریخیات میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ ہر واقعہ معیار تاریخ پر جچا تلا ہوا ہے، اسی کے ساتھ وہ نتائج وثمرات دکھلائے گئے جن کو دیکھ کر قوم بڑے بڑے فوائد اپنی معاشرت و تمدن اور تدین و مذہب میں حاصل کر سکتی ہے۔

پھر یہ بھی کم تعجب انگیز امر نہیں کہ باوجود ہر قسم کے مسائل کے، تحریر مضامین میں نہایت سلامت و اعتدال کا طریقہ قائم رکھا گیا ہے، بحمد اللہ کسی معترض کو اس کی گنجائش نہیں دی گئی کہ اس پر بے جا طور سے نکتہ چینی کر سکے اور یہ بھی نوبت شاید نہ آئی

اور آئی بھی ہو تو بہت ہی شاذ کہ کسی کو خواہ مخواہ ہی الجھنے کا موقع ملا ہو۔

دارالعلوم میں انگریزی تعلیم کی تجویز

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے دورِ اہتمام میں ہی ایک تجویز یہ پیش کی گئی کہ ایسے طلبہ کو جو کم از کم انٹر پاس ہوں اور دارالعلوم میں داخلہ لینا چاہیں ان کو دس پندرہ روپیہ ماہانہ وظیفہ دیا جائے، اسی طرح دارالعلوم سے فراغت کے بعد جو طلبہ انگریزی تعلیم حاصل کرنا چاہیں ان کے لیے بھی وظیفہ مقرر کیا جائے، یہ انقلابی تجویز تعلیم و تعلم کے تعلق سے دارالعلوم کے نقطۂ نظر کو واضح کرتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ علم کا کوئی بھی شعبہ ہو، اکابر دارالعلوم دیوبند کبھی بھی اس کے مخالف نہ رہے، ابتدائی دور میں انگریزی تعلیم سے جو علماء نے دوری بنائی اس کا ایک خاص پس منظر تھا، جو درج ذیل سطور سے واضح ہوگا۔

انگریزی تعلیم سے مسلمانوں کے اجتناب کا اجمالی پس منظر

ہندوستان کے علماء اور بالخصوص علمائے دارالعلوم کے خلاف یہ الزام شہرت پا گیا ہے کہ انھوں نے انگریزی تعلیم کے خلاف فتویٰ دے کر مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے باز رکھا، جس کی وجہ سے مسلمان دنیوی ترقی کے میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ گئے، یہ الزام صحیح نہیں ہے، علمائے کرام صرف ایسے نصابِ تعلیم کے مخالف تھے جو مسلمانوں کو الحاد اور بے دینی کی طرف لے جانے والا ہو، خود علی گڑھ میں یہ خطرہ محسوس کیا جا رہا تھا، چنانچہ اس کے سدباب کے لیے وہاں دینیات کا ایک مستقل شعبہ قائم کیا گیا، اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے داماد مولانا عبداللہ انصاری کو طلب کیا گیا تو دیوبند کی جانب سے فوراً اس پیش کش کو قبول کر لیا گیا، مولانا عبداللہ انصاری تاحیات اس منصب پر فائز رہے بعد ازاں ان کے فرزند مولانا احمد میاں

---

[1] تاریخ دارالعلوم، ج ۱، ص: ۲۳۴۔

انصاری اس منصب پر مامور کئے گئے یہ بھی دارالعلوم کے فاضل تھے، ظاہر ہے کہ مخالفت کی صورت میں یہ بات ممکن نہ تھی۔

حضرت مولانا نانوتویؒ نے ان طلباء کی نسبت جو مدارس عربیہ سے فارغ ہو کر سرکاری اسکولوں میں داخل ہونا چاہیں ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء کے جلسۂ انعام کی تقریر میں ایسے طلباء کی ان الفاظ میں حوصلہ افزائی فرمائی ہے:

''اگر طلباء مدرسہ ہذا مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ مؤید ہوگی[۱]''۔

بعض لوگوں کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ دارالعلوم کے نصاب تعلیم میں علوم جدیدہ کو کیوں شامل نہیں رکھا گیا؟

فرماتے ہیں:

''اگر یہ خیال سدِ راہ ہے کہ یہاں علومِ دنیوی کی تعلیم کا چنداں اہتمام نہیں تو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ مرض کا علاج چاہیے، جو مرض نہ ہو اس کی دوا کھانی فضول ہے، دیوار کے رخنے کو بند کرنا چاہیے بھٹے کا بھرنا لازم ہے، جو اینٹ ابھی گری نہیں اس کا فکر بجز نادانی کے کیا ہے، مدارس سرکاری اور کس لیے ہیں؟ ان میں علوم دنیوی نہیں پڑھائے جاتے تو اور کیا ہوتا ہے؟ یہ مدارس اگر قدر ضرورت سے کم ہوتے تو مضائقہ نہ تھا، مگر سب جانتے ہیں کہ سرکار کی توجہ سے شہر تو شہر گاؤں میں بھی مدارس جاری ہو گئے ہیں، ان کے ہوتے اور مدارس علوم دنیوی کا اہتمام کرنا اور علوم دینی سے غفلت کار عقل دور اندیش نہیں[۲]''۔

درحقیقت ہمارے اسلاف نے دوسری قوموں کے علوم وفنون کو اپنانے میں اس وقت بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی جب وہ نصف دنیا پر اپنی عظمت واقتدار کا پرچم

۱۔ روداد دار العلوم ۱۲۹۰ھ ص:۱۶۔ ۲۔ روداد دار العلوم ۱۲۹۲ھ ص:۱۳۰۔

لہرا رہے تھے، مسلمانوں نے ماضی میں نہ صرف ارسطو و افلاطون اور دوسرے یونانی حکماء کے فلسفے کو اپنا لیا تھا؛ بل کہ بقراط اور جالینوس کے طبی ذخیروں کے مالک بھی بن گئے تھے، اقلیدس اور بطلیموس کی تحقیقات ان کی زندگی کا دلچسپ مشغلہ بن گئی تھی، ہندوستان کی ریاضی بھی عربی سانچے میں ڈھل گئی تھی، اسی طرح عربی زبان میں ایک نئے ادب، تاریخ، فلسفہ و حکمت، طب ریاضی، ہیئت، نجوم، کیمیا اور طبعیات وغیرہ فنون کی بنیادیں پڑیں، جو آج تہذیب و تمدن کا مایہ ناز سرمایہ ہے، ان علوم کو مسلمانوں نے اس طرح اپنایا کہ وہ آج اجنبی محسوس ہونے کے بجائے اسلامی علوم معلوم ہوتے ہیں، علوم و فنون کے حاصل کرنے میں مسلمان ہمیشہ فراخ حوصلہ رہے ہیں، تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ مسلمانوں نے یونان اور ہندوستان کے علوم و فنون کو نہ صرف سیکھا ہے؛ بل کہ انھیں ترقی بھی دی ہے۔

علماء کی نسبت یہ ایک شدید غلط فہمی ہے، انگریزی تعلیم کو کبھی ناجائز اور حرام نہیں کہا گیا، بل کہ وہ تہذیب اور کلچر جو انگریزی تعلیم کے ساتھ لازمی قرار دیا گیا تھا اور اسی کو ترقی کا واحد ذریعہ سمجھا جاتا تھا، علماء کو صرف اس سے اختلاف تھا، مناسب ہوگا کہ یہاں اس الزام پر تاریخی حقائق کی روشنی میں غور کر کے دیکھا جائے کہ اس کی اصلیت کیا ہے؟ ٹھیک اسی زمانے میں جب کہ سرسید احمد خاں مرحوم کی تعلیمی تحریک کا آغاز تھا، فقہ حنفی کے قدیم تعلیمی مرکز فرنگی محل لکھنؤ کے یگانۂ روزگار عالم مولانا عبدالحی لکھنوی نے انگریزی تعلیم کے متعلق فتوی دیا تھا کہ:

> ”لغت انگریزی کا پڑھنا یا انگریزی لکھنا سیکھنا اگر بہ لحاظ تشبّہ کے ہو تو ممنوع ہے اور اگر اس لیے ہو کہ ہم انگریزی میں لکھے ہوئے خطوط پڑھ سکیں اور ان کتابوں کے مضامین سے آگاہ ہوسکیں تو کچھ مضائقہ نہیں، مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابتؓ کو یہود کا خط (عبرانی) سیکھنے کے لیے حکم فرمایا اور انھوں نے

تھوڑے ہی دنوں میں سیکھ لیا[۱]"۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے فتاویٰ میں انگریزی پڑھنے پڑھانے کے استفتاء کے جواب میں تحریر ہے کہ:

"انگریزی زبان سیکھنا درست ہے، بشرطیکہ کوئی معصیت کا مرتکب نہ ہو اور نقصانِ دین اس سے نہ آئے[۲]"۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دور میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کا فتویٰ بھی یہی تھا کہ "انگریزی پڑھنا جائز ہے" غرض کہ علمائے کرام نے کسی زمانے میں بھی نفس تعلیم انگریزی سے کبھی اختلاف نہیں کیا؛ بل کہ حصول معاش اور علم و آگاہی کے لیے صراحتاً اس کے جواز کا فتویٰ دیا، جیسا کہ خود عہد نبوت میں حضرت زید بن ثابتؓ کی مثال سے صاف واضح ہے، البتہ جس صورت میں طالب علم کے اعتقاد و ایمان پر اس کا اثر پڑتا ہو اور غیر اسلامی تہذیب، غیر اسلامی اخلاق اور عقائد کے اختیار کر لینے کا ذریعہ بنتا ہو، صرف اس کو نا جائز بتلایا گیا تھا۔

واقعہ دراصل یہ ہے کہ انگریزی زبان سے مسلمانوں کے اجتناب کے متعدد اسباب تھے، سب سے پہلا سبب تو یہ تھا کہ ایک طرف تو مسلمانوں کے دلوں میں حملہ آور انگریزوں کے خلاف۔ جنھوں نے انھیں حکومت وسلطنت سے محروم کر دیا تھا۔ شدید غصہ تھا، وہ ان کی ہر چیز کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے، انگریزوں کے علوم اور تہذیب وتمدن کی نسبت مسلمانوں میں معاندانہ جذبات کا موجود ہونا بالکل قدرتی بات تھی، انھوں نے مغل سلطنت کا چراغ اپنی آنکھوں کے سامنے گل ہوتے ہوئے دیکھا تھا، شاہی خاندان کے خاک وخون میں تڑپنے کا منظر وہ آنکھوں سے دیکھ چکے تھے، انھوں نے معمولی معمولی شبہات پر ہزاروں مسلمانوں کو تہ تیغ ہوتے ہوئے دیکھا

---

۱ مجموعۂ فتاویٰ مولانا عبدالحیٔ، ج:۲، ص:۲۰۔

۲ فتاویٰ رشیدیہ، ج:۱، ص:۶۴۔

تھا، ہزاروں مسلمان گھرانے نانِ شبیہ کو محتاج ہو گئے تھے، اور ہزاروں شریف خاندان بے کسی اور مفلسی کے عالم میں مارے مارے پھر رہے تھے، انھوں نے وہ سب کچھ لٹتے ہوئے دیکھا جس کو وہ اخلاق اور تہذیب انسانیت کا حاصل سمجھتے تھے، اور جس کے بغیر ان کی زندگی بے لطف ہو گئی تھی، ان کی عظمت اور عزت جاتی رہی تھی، ان کو ہرگز ہرگز گوارہ نہ تھا کہ وہ اپنے نونہالوں کو انگریزی تعلیم دلائیں، اور انگریزوں سے سروکار رکھیں، اس زمانے میں غدر کے سنگین نتائج اور اس کے ردعمل کو نفسیاتی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، اسلام اور عیسائیت میں جو کش مکش یورپ اور مشرق وسطیٰ میں صدیوں سے چلی آ رہی تھی اب وہ ان کے خیال میں ہندوستان تک پہنچ گئی تھی، اس لیے مسلمانوں کے دل و دماغ میں یہ بات راسخ ہو گئی تھی کہ عیسائیت اور عیسائی حکومت کو گوارہ کرنا اسلام اور مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا، اس لیے انھوں نے اس نئی تہذیب و تمدن سے مکمل بائیکاٹ کا فیصلہ کیا اور ہر اس چیز کو جو انگریزوں سے وابستہ تھی اسلام اور مسلمانوں کے لیے خطرے کا نشان سمجھنے لگے، ظاہر ہے کہ ان کا ایسا سمجھنا حالات کا قدرتی ردعمل تھا، جس کے لیے ان کو معذور سمجھنا چاہیے۔

دوسری طرف انگریز بھی اپنا اصل سیاسی حریف مسلمانوں ہی کو سمجھتے تھے، ہر چند ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندو مسلمان دونوں قوموں کے افراد شامل تھے اور دونوں قوموں نے مل کر بقدر استعداد اس جنگ میں حصہ لیا تھا، مگر انگریز کی نظر میں اس کا اصل مدمقابل مسلمان ہی تھا، اس لیے انگریزوں نے قابو یافتہ ہونے کے بعد اسی کو اصل باغی سمجھ کر زیادہ سے زیادہ اپنے ظلم و استبداد کا نشانہ بنایا، ملک کی ہر بلندی اور آسودہ حالی سے مسلمانوں کو پست اور ناکارہ بنا دیا تاکہ حکومت اور سربلندی کا خواب ان کے دماغوں سے نکل جائے، یہ زخم ایسا گہرا لگایا گیا تھا جو چند روز میں مندمل ہونے والا نہ تھا۔

اسی کے ساتھ ہندوستان میں پادریوں کو تبلیغ عیسائیت کی نہ صرف اجازت تھی؛ بل کہ حکام کی پشت پناہی بھی ان کو حاصل تھی، اسکولوں اور کالجوں کے مدرسین عموماً پادری ہوتے تھے، انجیل کا درس لازمی تھا، اس چیز سے نہ صرف علماء کو اختلاف تھا؛ بل کہ کوئی عامی سے عامی مسلمان بھی ایسی حالت میں اپنی اولاد کو اسکولوں میں بھیجنے پر آمادہ نہیں ہوسکتا تھا۔

مولانا فضل حق خیر آبادی جن کو فتویٰ جہاد ۱۸۵۷ء کے جرم میں ''کالے پانی'' کی سزا دی گئی تھی لکھتے ہیں کہ:

''انگریزوں نے تمام باشندگانِ ہند کو نصرانی بنانے کی اسکیم بنائی، ان کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو کوئی مددگار اور معاون نصیب نہ ہو سکے گا، اس لیے اطاعت کے سوا سرتابی کی جرأت نہ ہو سکے گی، انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں کا باشندوں سے اختلاف تسلط و قبضے کی راہ میں سنگِ گراں ثابت ہوگا، اس لیے پوری جان فشانی اور تن دہی کے ساتھ مذہب وملت کے مٹانے کے لیے طرح طرح کے مکرو حیلے سے کام لینا شروع کیا، انھوں نے بچوں اور نافہموں کی تعلیم اور اپنی زبان ودین کی تلقین کے لیے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے اور پچھلے علوم ومعارف کے مٹانے کی پوری کوشش کی[۱]''۔

پہلے حکومت ایک محدود ادارہ ہوتی تھی جس کا تعلق زیادہ تر ملک کے نظم ونسق فوج، پولیس اور محاصل ومالیات سے ہوتا تھا، زندگی کے بہت سے شعبے اس کے دائرۂ عمل اور حلقۂ اثر سے خارج تھے، اہل ملک اپنے نظام تعلیم، تہذیب وتمدن اور اخلاق و معاشرت میں آزاد ہوتے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انقلاب سلطنت سے ضروری نہ تھا کہ تعلیم وتہذیب میں بھی انقلاب آئے؛ لیکن برطانوی نظام حکومت کا ڈھانچہ اس

۱۔ الثورۃ الہندیۃ، ص: ۳۵۶-۳۶۷۔

سے مختلف تھا، اس کا دائرہ عمل ملک وقوم کی پوری زندگی پر محیط اور اس کے حدود اختیارات زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھے، انگریزی تہذیب وکلچر انگریزی تعلیم کے ساتھ لازم وملزوم بن گئے تھے اور انھیں کو ذریعہ ترقی وتہذیب سمجھا جاتا تھا علماء صرف اس چیز کے خلاف تھے۔

جدید تعلیم سے مسلمانوں کے اجتناب میں کچھ تو انگریزی سیاست کے قصد و ارادے کو دخل رہا ہے، تاکہ مسلمان حکمرانی کے قابل نہ رہ سکیں، دوسرے خود مسلمانوں نے بھی اپنی اولاد کو بے دینی کے اندیشے سے اسکولوں میں داخل کرنے میں پس وپیش سے کام لیا ہے۔

یہ تھے وہ اسباب جو مسلمانوں کے لیے انگریزی اسکولوں اور کالجوں کی طرف جانے میں مانع ہوئے، چناں چہ جب پادریوں کی سرگرمیوں کو ان کی مسلسل ناکامیوں نے سرد کردیا اور انجیل کی تعلیم اسکولوں کے نصاب سے خارج کردی گئی، ادھر اسی کے ساتھ ساتھ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، رفتہ رفتہ قدرتی طور پر مسلمانوں کے دلوں سے انگریزوں اور انگریزی تعلیم کے خلاف نفرت کم ہوتی گئی، اور مسلمان انگریزی تعلیم پر متوجہ ہونے لگے۔

یہ ہے اس الزام کی حقیقت جس نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے دور رکھا، درحقیقت انگریزی تعلیم سے نفرت مسلمانوں کی قومی غیرت اور نفسیاتی ردعمل کا نتیجہ تھی، اور علماء بھی ان ہی میں شامل تھے، مگر اس کے باوجود علماء نے وقت کے تقاضے کو پہنچانا اور پوری بصیرت اور دوراندیشی کے ساتھ انگریزی تعلیم کے جواز کا فتویٰ دینے سے کبھی گریز نہیں کیا۔[1]

حضرت فخر الاسلام مولانا محمد احمد صاحب قاسمیؒ نے دار العلوم میں انگریزی تعلیم کو ایک خاص شکل میں نافذ کرنے کی تجویز پیش کی اور شوریٰ نے اسے منظور بھی

---

[1] بحوالہ تاریخ دار العلوم، ج:۲، ص:۳۰۲-۳۰۸۔

کرلیا، اور اسی خاص شکل کی وضاحت تاریخ دارالعلوم کے الفاظ میں یہ ہے:

''اس سال (۱۳۳۱ھ) کی روداد میں دارالعلوم کی جانب سے ایک تجویز یہ پیش کی گئی کہ ایسے طلباء جو کم از کم انٹر پاس ہوں اور دارالعلوم میں داخلہ لینا چاہیں ان کو دس پندرہ روپیہ ماہانہ کے وظائف دیئے جائیں، اسی طرح دارالعلوم سے فراغت کے بعد جو طلبہ انگریزی تعلیم حاصل کرنا چاہیں ان کے لئے بھی وظائف مقرر کئے جانے کی ضرورت ہے، روداد کے الفاظ یہ ہیں کہ ''دونوں صورتوں میں مسلمانوں کے لئے بہت سے فوائد ہیں۔'' افسوس ہے کہ اس مد میں عطیات نہ ہونے کی وجہ سے یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا[1]''۔

کتابوں کی فراہمی

کتابیں علم وفن کے لیے روح کا درجہ رکھتی ہیں، دارالعلوم کے اندر ابتداء میں کتابوں کی تعداد بہت کم تھی، حضرت فخر الاسلامؒ کے دور میں طلبہ کی تعداد بڑھ جانے کی وجہ سے دارالعلوم میں کتابوں کی شدید کمی کا احساس کیا گیا، ذمہ دارانِ دارالعلوم نے عامۃ المسلمین کو اس کی طرف متوجہ کیا، اور کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ دارالعلوم میں جمع ہوا، تاریخ دارالعلوم میں اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا گیا ہے:

''جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے دارالعلوم کے کتب خانہ کی ابتدا تو ۱۲۸۳ھ ہی میں ہو چکی تھی، جس میں وقتاً فوقتاً کتابوں کا اضافہ ہوتا رہا، ابتداءً درسیات اور متعلقہ شروح وغیرہ سے آغاز ہوا تھا، پھر رفتہ رفتہ درسیات کے علاوہ عام کتابیں بھی فراہم کی جاتی رہیں۔ ۱۳۱۹ھ کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال تک مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا معتد بہ ذخیرہ فراہم ہو چکا تھا،

---

[1] تاریخ دارالعلوم، ج:۱،ص:۲۰۹۔

چنانچہ روداد میں لکھا ہے کہ بفضلہ مدرسہ میں ذخیرۂ کتبِ درسیہ وغیر درسیہ اس قدر جمع ہوگیا ہے کہ ضروریات مدرسہ کو ہر طرح سے کافی ہے، یعنی جس قدر کسی جماعت میں طلبہ ہوتے ہیں ان سب کو ایامِ درس تک مدرسہ سے کتابیں مل سکتی ہیں، ہر فن کی ضروری کتابیں، شروح وحواشی موجود ہیں، بعض نایاب کتابیں بھی جمع ہوگئی ہیں مجموعی حیثیت سے یہ بڑا عالی شان کتب خانہ ہے مگر بایں ہمہ مصنفات اسلامی کے وسیع اور بے انتہا ذخیرے کو ابھی مکمل ہونے میں بہت سے مراحل باقی ہیں، اگر یہ کتب خانہ مکمل ہوگیا تو مسلمانوں کی اولوالعزمیوں اور فیاضیوں کی قیامت تک قائم رہنے والی یادگار ہوگی، مولوی عابد حسین صاحب آنریری مجسٹریٹ جونپور مسلمانوں کے شکریہ کے مستحق ہیں، انہوں نے اپنا بیش قیمت کتب خانہ جو بعض نادر کتابوں سے معمور ہے، دارالعلوم کو عطا فرمادیا ہے۔

اسی سال میں نواب سلطان جہاں بیگم نے ازراہِ علم دوستی تین سو روپے سالانہ کا چندہ دارالعلوم کے لئے مقرر کیا، ریاست بھوپال ماضی میں اپنی علم پروری کی وجہ سے خاص شہرت وعظمت کی مالک رہی ہے۔ آئندہ سالوں میں بھوپال کے چندے کی مقدار ڈھائی ہزار تک پہنچ گئی تھی جو سقوط ریاست تک برابر جاری رہی[۱]"۔

ارباب فضل وکمال کا جھرمٹ

دارالعلوم کی علمی ترقیوں میں سب سے بڑا دخل علوم وفنون کے ماہرین کا حسین اجتماع رہا ہے، فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا دور اہتمام جو ۱۳۱۳ھ سے لے کر ۱۳۴۷ھ تک تقریباً ۳۵ سال کے عرصے پر محیط ہے،

---

[۱] تاریخ دارالعلوم، ج ۱/ص ۲۰۶-۲۰۷۔

اصحاب علم وفضل اور ماہرین علوم شریعت کے اجتماع کا حسین نظارہ پیش کرتا ہے۔

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ جب مسند اہتمام پر رونق افروز ہوئے تو دارالعلوم کی سرپرستی کا شرف حضرت گنگوہیؒ کو تھا، حضرتؒ سے اللہ تعالیٰ نے احیاءِ سنت اور تحفظ شریعت کا جو کام لیا ہے، وہ رہتی دنیا تک یاد رکھے جانے کے قابل ہے۔

اسی طرح دارالعلوم کی مجلس شوریٰ میں ماہرین علوم وفنون کا حسین کہکشاں نظر آتا تھا جن میں بطور خاص حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ، حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ اور حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ قابل ذکر ہیں، حضرت گنگوہیؒ کے بعد حضرت حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ دارالعلوم کی سرپرستی فرمارہے تھے۔

دارالعلوم کا عہدۂ صدارت تدریس پر حضرت شیخ الہندؒ کی ذات گرامی جلوہ افروز تھی، جسے ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا درشاہوار نہ کہیے تو کیا کہیے اسی دور میں مسند صدارت تدریس پر حضرت شیخ الہندؒ کے بعد بالترتیب علامہ انور شاہ کشمیری اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ جلوہ افروز ہوئے ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ علم وفن کا ماہ تمام تھے، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ جیسا مدبر اور منتظم دارالعلوم کے اہتمام کی نیابت کررہا تھا، اب انتظام اور تعلیم دونوں شعبوں میں ایسی عبقری شخصیات کے دلکش اجتماع سے دارالعلوم کی ترقیات اگر باوج ثریا'' پہنچ جائے تو حیرت کیوں کیجئے۔

طلبہ کی تعداد میں اضافہ

اس دور اہتمام میں حسن اہتمام اور حسن انتظام کی وجہ سے دارالعلوم طلبۂ علوم اسلامیہ کی نگاہوں کا مرکز بن گیا، اور ہر سال طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا، یہ طلبہ اپنے ظاہری اعتبار سے کمزور تھے مگر حسن نیت اور اخلاص سے ان کے دل منور

تھے، وہ علم دین کی خاطر دنیا کی ہر مشقت برداشت کر لیتے مگر علم دین سے اپنا رشتہ نہ توڑتے، ۱۳۳۵ھ کی روداد کے حوالے سے تاریخ دار العلوم میں لکھا ہے کہ:

”۱۳۳۵ھ کا تعلیمی سال شروع ہونے پر غیر معمولی طور سے طلباء کا رجوع وہجوم ہوا، اتنی کثرت طلباء کی گذشتہ کسی سال میں نہیں ہوئی، بالخصوص اوپر کے درجوں میں مستعد اور شائق طلباء کی بہت زیادہ کثرت ہوئی، دورۂ حدیث کی جماعت میں اس قدر طلباء کسی زمانے میں نہیں ہوئے تھے، ترمذی شریف، اور مسلم شریف میں طلباء کی تعداد ۹۰ر تک پہنچ گئی، تعلیم نہایت اطمینان وسکون اور پابندی والتزام سے جاری ہے، ہر ایک انتظام اپنے اپنے موقع پر مکمل نظر آتا تھا، دار العلوم کی یہ حالت دیکھ کر بے اختیار خداوندِ عالم کا شکر ادا ہوتا ہے کہ اس نے علوم دین کی اس بے قدری کے زمانے میں دار العلوم کو ایسی مقبولیت وشہرت نصیب فرمائی اور مسلمانوں میں علوم دین کی تحصیل کا ایسا ذوق وشوق پیدا فرما دیا کہ دنیا کی دولت و عزت کو پس پشت ڈال کر اسلام کی ترقی، مسلمانوں کی رہ نمائی اور تعلیم کی اشاعت میں اپنی عمریں بسر کرنا چاہتے ہیں اور کسی سے صلہ وستائش کے طالب نہیں؛ بل کہ اس کے برعکس ہدفِ ملامت بن کر ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہیں۔

لیکن عین اس وقت جب کہ تعلیم پورے شباب پر ہورہی تھی دیوبند میں وبائی امراض نمودار ہوئے اور چند طلباء، مرض کا شکار ہوگئے، اگرچہ طلباء میں تشویش اور پریشانی ضرور پیدا ہوگئی مگر تعلیم کا سلسلہ بدستور جاری رہا؛ لیکن جب مرض کی شدّت بہت بڑھ گئی تو دار العلوم میں مجبوراً تعطیل کرنی پڑی، مدرسین میں سے اکثر موسمی امراض میں مبتلا ہوئے، کئی مہینے تک دار العلوم بالکل بند رہا، یہ ناگہانی افتاد ایسی تھی جس سے باوجود انتظام تعلیم کے مکمل ہوجانے اور کار تعلیم کے اعلیٰ پیمانے پر جاری

ہونے کے حرج واقع ہوا، لیکن بحمد اللہ بالآخر سابقہ حالت عود کر آئی، مدرسین وطلباء ہمت کے ساتھ کام میں مصروف رہے اور پوری جدو جہد سے تیاری کرتے رہے، خداوند عالم کے فضل وکرم اور مدرسین وطلباء کی مستعدی سے یقین کامل تھا کہ جو حرج باسباب خاص ظہور ہوا ہے اس کی تلافی باحسن وجوہ ہو جائے گی، چناں چہ جب تعلیمی سال کے ختم پر سالانہ امتحان ہوا تو ۵۷۷ طلباء میں ۵۵۱ حاضر اور شریک امتحان ہوئے، ۲۶ غیر حاضر اور بیمار تھے، حاضرین میں باوجود حرج شدید کے صرف چھ طلباء ناکام رہے، اور ۵۴۵ نے کامیابی کے نمبر حاصل کیے، یعنی کامیابی کا اوسط فی صدی تقریباً ۹۹½ رہا جو کامیابی کا اعلیٰ ترین درجہ شمار ہوتا ہے[1]۔

دارالعلوم کا اثر جنوبی اور مشرقی افریقہ میں

گذشتہ اوراق سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ دارالعلوم کو شروع ہی سے دنیائے اسلام میں علمی مرکزیت حاصل ہو گئی تھی، اور اس کی شہرت کا آوازہ ایشیا سے گذر کر یورپ اور افریقہ تک پہنچ گیا تھا، اسی طرح اس کی فیض رسانی کا دائرہ بھی صرف ہندوستان کی سرزمین تک محدود نہیں تھا، رودادوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم میں جس طرح ہندوستان کے مختلف صوبوں اور مقامات کے طلباء موجود تھے، اسی طرح کابل وایران، بلخ و بخارا، چین اور روس اور شام و حجاز کے لوگ قرآن وحدیث کے علم کی تحصیل کے لیے دیوبند کا سفر اختیار کرتے تھے، اگر ایک طرف امام بخاریؒ کے ہم وطن اپنے قدیم ترکے کو حاصل کر کے بخارا لے جانے میں سرگرم تھے تو دوسری طرف موصل وحجاز اور خاص مدینہ طیبہ تک دارالعلوم کا فیض وسیع ہوتا گیا اور اس کے مصارف بڑھتے گئے، اسی طرح اس کے حامیوں اور مددگاروں کا حلقہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، اور وقتاً فوقتاً ہندوستان

[1] تاریخ دارالعلوم، ج ۱/ص ۲۴۵-۲۴۶۔

کے علاوہ دوسرے ممالک کے اہل خیر مسلمان اس کی امداد و اعانت میں حصہ لیتے رہے، چناں چہ ۱۳۲۸ھ کے عظیم الشان جلسہ دستار بندی کے موقع پر جنوبی افریقہ کے اہل خیر مسلمانوں نے معقول رقم ارسال فرمائی تھی، اس وقت سے یہ سلسلہ برابر بڑھتا گیا، جنوبی افریقہ کے مقامات ڈربن، ناٹال، ٹرانسوال، اسٹینگر وغیرہ میں دارالعلوم کے بہت سے ہمدرد اور معاون پیدا ہو گئے، اور یہ سلسلہ جو جنوبی افریقہ سے شروع ہو کر تھا مشرقی افریقہ تک جا پہنچا۔

حضرت فخر الاسلام کے دور کی تعمیری ترقیات

۱۵ر محرم ۱۲۹۳ھ مطابق ۳۰ر مئی ۱۸۶۶ء بروز جمعرات جب دارالعلوم کا افتتاح عمل میں آیا تو دارالعلوم کے پاس نہ کوئی عمارت تھی اور نہ ظاہری ساز و سامان، یہ کارنامہ جو ہندوستان میں اسلام کی بقاء اور مسلمانوں کے تحفظ کی سمت سب سے بڑا قدم تھا، انتہائی سادگی کے عالم میں چھتہ کی قدیم مسجد کے صحن میں انار کے ایک چھوٹے سے درخت کے سائے میں چند اللہ کے نیک اور مخلص بندوں کی موجودگی میں انجام پایا، مدرسہ کا کل سرمایہ اخلاص اور اللہ پر بھروسہ تھا، ملا محمود حسن دیوبندیؒ جو دیوبند کے مشہور عالم دین تھے، اسی مدرسہ کے پہلے استاذ تھے، اور محمود حسن نام کا ایک بچہ اسی مدرسہ کا پہلا طالب علم، اب اسے اتفاق کہیے یا کچھ اور کہ استاذ اور شاگرد دونوں کا نام "محمود" (پیارا، اچھا) تھا، الغرض دارالعلوم کی کل کائنات یہی ایک استاذ اور ایک طالب تھے نہ کوئی عمارت اور نہ طلبہ کی جماعت۔

کچھ سالوں کے بعد، چھتہ مسجد کی جگہ تنگ پڑنے لگی تو یہ مدرسہ قاضی مسجد منتقل ہو گیا، کچھ ہی عرصے کے بعد قاضی مسجد بھی تنگ دامانی کا گلہ کرنے لگی تو جامع مسجد دیوبند میں کچھ کمرے اور دالان بنائے گئے اور ۱۲۹۰ھ میں یہ مدرسہ جامع مسجد منتقل کیا گیا۔

دارالعلوم کے عظیم اہداف کو بروئے کار لانے کے لیے بانی دارالعلوم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے آبادی سے باہر ایک کشادہ عمارت بنانے کی ضرورت پر زور دیا جسے اکابرین نے پسند فرمایا، چھتہ مسجد سے متصل زمین کا ایک ٹکڑا خرید لیا گیا، چندے جمع ہونا شروع ہوئے، بالآخر ۱۲۹۲ء میں اکابرین کے ہاتھوں دارالعلوم کی پہلی عمارت جسے ''نودرہ'' کہا جاتا ہے تعمیر ہوئی، تاریخ دارالعلوم میں اس عمارت کے سنگ بنیاد اور مبشرات کو بڑے دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے:

> ''جلسہ تقسیم اسناد کے بعد مجمع جامع مسجد سے اٹھ کر اس جگہ پہنچا جہاں دارالعلوم کی عمارت کے لیے بنیاد رکھی جانے والی تھی، سنگ بنیاد حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ کے دست مبارک سے رکھوایا گیا، اس کے بعد ایک ایک اینٹ حضرت نانوتویؒ حضرت گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ نے رکھی، یہ نام تو روداد میں مذکور ہیں، ارواح ثلثہ کی روایت میں مزید دو نام حضرت میانجی منے شاہؒ اور حضرت حاجی محمد عابدؒ کے بھی لکھے ہیں:
>
> اس موقع کی ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ جب بنیاد رکھی جا چکی تو سب لوگوں نے دارالعلوم کی بقاء وترقی کے لیے نہایت خضوع وخشوع کے ساتھ بارگاہِ ایزدی میں دعا کی، حضرت نانوتویؒ نے فرمایا کہ ''عالم مثال میں اس مدرسہ کی شکل ایک معلق ہانڈی کے مانند ہے، جب تک اس کا مدار توکل اور اعتماد علی اللہ پر رہے گا یہ مدرسہ ترقی کرتا رہے گا''۔

اس واقعے کو حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ذیل کے اشعار میں نظم کیا ہے:

اس کے بانی کی وصیت ہے کہ جب اس کے لیے
کوئی سرمایہ بھروسے کا ذرا ہو جائے گا

پھر یہ قندیلِ معلق اور توکل کا چراغ
یہ سمجھ لینا کہ بے نور و ضیا ہو جائے گا
ہے توکل پر بنا اس کی تو بس اس کا معین
ایک گر جائے گا، پیدا دوسرا ہو جائے گا

''حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے تعمیر کا مادۂ تاریخ ''اشرف عمارت'' سے نکالا، آٹھ سال کی مدت میں ۲۳۰۰۰ روپیے کے صرفہ سے یہ عمارت ''نودرہ'' کے نام سے بن کر تیار ہوئی، اس عمارت کے دو درجے ہیں، ہر ایک درجے میں نو، نو دروازے ہیں، اس کا طول ۲۶ رگز اور عرض ۱۲ رگز ہے، دارالعلوم کی یہ سب سے پہلی عمارت ہے، نودرے کی یہ عمارت سادہ ہونے کے باوجود شاندار ہے، روداد میں لکھا ہے کہ ''اس عمارت میں سادگی اور استواری کو مقدم رکھا گیا ہے، اس کا نقشہ منجانب اللہ قلوب پر الہام ہوا تھا''۔

حضرت مولانا رفیع الدینؒ نے (جن کے زمانۂ اہتمام میں یہ عمارت تعمیر ہوئی) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرما رہے ہیں کہ: ''یہ احاطہ تو بہت مختصر ہے'' یہ فرما کر خود عصائے مبارک سے ایک طویل وعریض نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ ان نشانات پر تعمیر کی جائے، چناں چہ اسی کے مطابق بنیاد کھدوا کر تعمیر شروع کرائی گئی،

نودرے کی تعمیری خصوصیات کی نسبت روداد میں لکھا ہے:

''اس کی تعمیر میں ہندوستان اور انگریزی عمارتوں کا لطف موجود ہے، اس کی پشت پر ایک عمدہ تالاب اور جانبِ جنوب سبزہ زار اور بجانب شمال باغ مدرسہ ہے، اور وسط صحن میں ایک مختصر اور نفیس چمن نہایت خوش نما جنگلے کے بیچ میں شگفتہ ہے، اور جنگلے کے چاروں طرف گملوں میں ہر قسم

کے مختلف الالوان پھولوں کے درخت موجود ہیں''۔

دار العلوم کا یہ مقام احاطۂ مولسری کے نام سے موسوم ہے، اسی احاطے میں وہ تاریخی کنواں ہے جو نو درے کے ساتھ بنا تھا، یہ کنواں بڑا بابرکت سمجھا جاتا ہے، اس کا پانی نہایت شیریں اور ٹھنڈا ہے، مشہور عالم و مصنف مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اس کنویں کے پانی کی نسبت اپنا یہ تأثر بیان کیا ہے کہ ''اتنا لذیذ'' اتنا خوش گوار، اتنا شیریں، صاف و سبک اور خنک پانی میں نے اس سے پہلے نہیں پیا تھا۔

حضرت مولانا رفیع الدینؒ ہی نے ایک دوسرے خواب میں یہ بھی دیکھا تھا کہ کنواں دودھ سے بھرا ہوا ہے اور آنحضرتؐ پیالے سے دودھ تقسیم فرما رہے ہیں، بعض لوگوں کے پاس چھوٹے برتن ہیں اور بعض کے پاس بڑے، ہر شخص اپنا اپنا برتن دودھ سے بھروا کر لے جا رہا ہے، مولاناؒ نے برتنوں کے چھوٹے بڑے ہونے کی یہ تعبیر دی کہ اس سے ہر شخص کا ''ظرف علم'' مراد ہے[1]۔

حضرت فخر الاسلامؒ کے دور کی تعمیریں

حضرت فخر الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے دور تک دار العلوم میں صرف ایک عمارت تھی، جسے ''نو درہ'' کہا جاتا ہے ''نو درہ'' میں صرف درسگاہیں تھیں، اور اسباق ختم ہونے کے بعد طلبہ اسی میں قیام کرتے تھے، طلبہ کے لیے کوئی عمارت یا بلڈنگ نہیں تھی، حضرت فخر الاسلامؒ نے طلبہ اور دار العلوم کی ضرورت کو سامنے رکھ کر جو تعمیری اقدامات کیے وہ درج ذیل ہیں:

دار الطلبہ کی تعمیر

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے دور اہتمام میں سب سے پہلے

---

[1] تاریخ دار العلوم، ج:۱،ص:۱۸۳-۱۸۶۔

دارالطلبہ کی تعمیر ہوئی، دارالعلوم کی طرف سے چندے کی اپیل کی گئی، یہ اپیل نتیجہ خیز ثابت ہوئی، مسلمانوں نے اس کارِ خیر میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، نواب شاہ جہاں بیگم والیٔ بھوپال نے دارالطلبہ کی تعمیر کے لیے ایک گراں قدر رقم عنایت فرمائی، اور اس عمارت کی تعمیر میں خاص طور سے حیدرآباد کے مسلمانوں نے دل کھول کر حصہ لیا، تاریخ دارالعلوم میں ہے:

"دارالعلوم میں بیرونی طلبہ کے قیام کے لئے کمروں کی تعمیر کی غرض سے حیدرآباد میں دارالعلوم کے ہمدردوں نے بڑی گرم جوشی کا اظہار کیا، مولوی شوکت حسین صاحب" مددگار صوبے دار ورنگل، حیدرآباد میں اس تحریک کے روحِ رواں تھے، انہوں نے دارالعلوم کی اپیل پر اپنی جدوجہد سے سات ہزار روپئے چندہ کر کے کمروں کی تعمیر کے لئے بھیجے، اس زمانے میں موصوف نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ میں ایک طویل مضمون لکھا تھا، جس میں انہوں نے بڑے موثر انداز میں یہ بتلایا تھا کہ دارالعلوم کی امداد کیوں ضروری ہے؟ ذیل میں اس مضمون کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت دارالعلوم کے متعلق ملک میں کیا خیالات پائے جاتے تھے۔ موصوف لکھتے ہیں:

"اب بحث طلب یہ امر ہے کہ چندہ جو جمع ہوگا اس سے آیا کوئی جدید بنیاد کسی مدرسہ کی علیحدہ اٹھائی جائے گی یا کسی جمی جمائی بنیاد پر ہی عمارت بڑھائیں؛ لیکن جہاں تک غور کیا، ہمارا خیال یہ ہے کہ بہ نسبت کسی جدید بنیاد کے بنی بنائی بنیاد پر ہی کیوں نہ قبضہ کیا جائے، ورنہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ہونے کا تو پھر وہی خرابہ ہوگا جو ہوتا چلا آیا ہے، جس نے قومی ایوان کی اینٹ سے اینٹ بجادی ہے، پھر نہ معلوم کہ سرمایہ کی مقدار بھی کب اس درجہ کو پہنچے کہ ہم اپنا نقشہ اپنی خواہش کے موافق جما سکیں اور کچھ معلوم نہیں

کہ کل تک کیا ہونے والا ہے، قوم کی بے پرواہی اور چندے کی مشکلات بھی کھلی ہوئی باتیں ہیں، تو واقعی حصول مدعا کی صورت جہاں تک ہے وہ اس میں پائی جاتی ہے کہ جیسے جیسے رقم ملتی جائے وہ کسی بھی ایک جمے جمائے مدرسہ پر ہی لگائی جائے تاکہ بالفعل وہی ایک مدرسہ دم بدم ترقی اور فروغ پاکر قوم کے لئے سرمایۂ عزت اور فخر ہوسکے تو وہ ایک مدرسہ دیوبند ہے، جس کو ہم نے اس ارادے کے لئے منتخب کرلیا ہے، ہم نے اقطاعِ ہند کے موجودہ مذہبی مدارس پر ایک نظر کی؛ لیکن یہی ایک مدرسہ دیوبند ایسا پایا جو بہت غنیمت کہا جاسکتا ہے اور ۳۰-۳۲ سال سے بجائے خود روز بروز کچھ نہ کچھ ترقی ہی کرتا چلا آتا ہے اور اپنی قدامت اور استقلال اور فائدہ رسانی کے خیال سے تمام مدارسِ مذہبی ہندوستان میں اس وقت شایانِ صدارت سے تو یہی ہے، بندگانِ عالی کے خزانہ شاہی سے بھی یہی مدرسہ ہے جس کو سر آسمان جاہ بہادر کی وزارت کے زمانے سے بارہ سو روپے سالانہ نذر کیا جاتا ہے۔

الحاصل زمانۂ دراز سے باوجود ایک غیر مستقل اور جزوی آمدنی کے یہ مدرسہ ہمیشہ سے کچھ نہ کچھ ترقی یافتہ حالت ہی کے ساتھ قائم چلا آتا ہے اور یہ بے شک کسی مقبول دعاء ہی کا اثر ہے کہ اب تک ایک مختصر مکان بھی مدرسہ نے بطورِ خود تعمیر کرلیا ہے، کچھ کتب خانہ بھی ہوگیا ہے، جہاں تک ہوسکتا ہے طلبہ کو بھی بھوکوں مرنے نہیں دیتا اور جیسے کچھ بھی ہوں ہر سال حافظ، مولوی اور عالم بناتا ہی رہتا ہے"۔

غرض کہ ہندوستان میں اس وقت یہی ایک مدرسہ ہے جو تمام مدارس کے مقابل ہر ایک پہلے سے ممتاز اور ہماری کوششوں اور تائید سے مستفیض ہونے اور فائدہ پہنچانے کی قابلیت رکھنے والا نظر آتا ہے[1]۔

---

[1] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ ۱۸ ستمبر، ۱۸۹۷ء۔

روداد میں تعمیرات کی تفصیل یہ بیان کی گئی ہے کہ بہت سے حجرے طلبہ کے لئے مدرسے کے متصل ایک علیحدہ تیار ہوگئے ہیں جو دارالطلبہ کے نام سے موسوم ہیں، اس کے علاوہ دروازہ کلاں کے اوپر اس کے گرد وپیش میں دفتر اور مہمان خانہ وغیرہ کی عمارتیں مکمل ہوگئیں ہیں، ان پر بارہ ہزار روپے صرف ہوئے ہیں، اس خوشی میں مستری اور مزدوروں کو شیرینی بانٹی گئی۔ حضرت مولانا محمد ذوالفقار علی صاحبؒ رکن مجلس شوریٰ نے اس موقع پر حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"یہ موقع نہایت خوشی اور شکر کا ہے کہ جس طرح اس ناچیز قصبہ کو محض بتائیدایزدی تعلیم علوم دین کی عزت حاصل ہوئی، اسی طرح یہ بھی مسرت ملی کہ ایسی عالی شان، خوش وضع اور مستحکم عمارت بلا تجویز کسی نقشے اور تخمینے کے یہیں کے ایک معمار کے ہاتھوں تیار ہوئی ہے، جس کو بڑے بڑے ذی علم اور صاحب تجربہ انجینئر بھی دیکھ کر پسند کرتے اور اظہارِ خوشنودی فرماتے ہیں[۱]"۔

کتب خانہ کی تعمیر

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے دور میں دارالطلبہ کے بعد کتب خانہ کی تعمیر عمل میں آئی، وجہ یہ تھی کہ کتب خانہ کی موجودہ عمارت سے قبل کتب خانہ نودرہ کے جانب جنوب کے کمروں میں تھا؛ لیکن کتابوں میں روز افزوں اضافہ ہوجانے کے سبب یہ عمارت ضرورت کے لئے ناکافی ہوگئی تھی، اس لئے پچھلے چند سالوں سے کتب خانہ کے لئے ایک وسیع عمارت کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی، دارالعلوم کے ہمدردوں میں نواب یوسف علی خاں رئیس مینڈھو نے اس اہم ضرورت کی جانب توجہ فرمائی، اور سات ہزار روپئے کی گراں قدر رقم کتب خانہ کی تعمیر

۱۔ روداد مجلس شوریٰ، ۱۳۱۸ھ، ص ۱۴۹، ۱۵۰، تاریخ دارالعلوم، ج:۱، ص: ۲۰۴-۲۰۶۔

کے لئے دارالعلوم کو عطا کی، اسی لئے تکمیل تعمیر کے بعد اس دور میں اس کا نام کتب خانۂ یوسفی پڑ گیا تھا جو بہت عرصہ تک چلا، نواب صاحب ممدوح کے بعد میرٹھ کے چند اہل خیر حضرات نے بھی کتب خانہ کی تعمیر میں حصہ لیا۔ ۲ر صفر المظفر ۱۳۲۴ھ کو ایک بڑے مجمع میں اس عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا گیا، یہ عمارت دو منزلہ ہے، نیچے دارالصنائع وغیرہ ہیں اور اوپر کی منزل میں کتب خانہ ہے جس میں فرش سے چھت تک الماریاں لگی ہوئی ہیں[1]۔

مسجد قدیم کی تعمیر

اس وقت تک دارالعلوم کے احاطہ میں مسجد نہ تھی، طلباء قرب وجوار کی مساجد میں نماز پڑھتے تھے، اس میں طلباء کے اوقات کا حرج بھی ہوتا تھا اور دقّتیں بھی پیش آتی تھیں، اس کے علاوہ خود دارالعلوم کی حیثیت کا بھی تقاضا تھا کہ اس کے احاطے میں مسجد ہو، یہ تجویز عرصے سے سامنے تھی، چناں چہ ۱۳۱۶ھ میں دارالطلبہ کی تعمیر کے مجوزہ نقشہ کے ساتھ اس اہم ضرورت کا بھی اعلان کیا جا چکا تھاں مگر "کل امر مرھون باوقاتھا" کے مطابق اب تک اس کی نوبت نہ آسکی تھی کہ رجب ۱۳۲۵ھ میں میرٹھ کے ایک "اہل خیر" حاجی فصیح الدین صاحب نے سبقت کی اور ابتدائی ضرورتوں کے لئے ڈیڑھ ہزار روپیہ پیش کردیا، جس سے صدر دروازے کے شمال میں مسجد کے لیے زمین کا ایک قطعہ خرید لیا گیا۔

زمین خریدے جانے کے ٹھیک ایک سال بعد اللہ نے مسجد کی تعمیر کا بھی انتظام کرادیا، راندیر (ضلع سورت) کے ایک مخیّر تاجر حاجی غلام محمد اعظم صاحب نے مسجد کے مجوزہ تخمینے کے مطابق انیس ہزار روپے عطا فرمائے، ۴ر ربیع الاوّل ۱۳۲۷ھ کو مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا گیا، روداد میں سنگِ بنیاد کی تقریب کی نسبت تحریر ہے:

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تاریخ دارالعلوم، ج:۱، ص:۲۱۴۔

''طلباء کے عام مجمع میں بزرگانِ دین نے بنیاد رکھی، اور پھر ہر ایک طالب علم نے اپنے اپنے ہاتھ سے اینٹیں رکھیں اور نہ صرف اینٹیں رکھیں؛ بلکہ اس دیوار کی کل بنیاد جو بہت ہی گہری تھی، طلباء نے خود اپنے ہاتھوں سے بھری، طلباء کے ساتھ کُل مدرسین وارا کینِ مدرسہ نہایت ذوق وشوق سے خود اینٹیں اپنے سروں اور ہاتھوں پر لاتے تھے، اور بجائے معماروں کے تعمیر کرتے تھے، حضرت مولانا حکیم مسعود احمد صاحبؒ خلف الصدق حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ، جناب مولانا شاہ عبدالرحیم صاحبؒ رائے پوری، حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ صدر المدرسین اور حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ بھی دیگر طلباء کے ساتھ اینٹیں اور گارہ اٹھانے میں شریک تھے، سبحان اللہ طلباء کا جوشِ مسرت کے ساتھ سنتِ خلیل اللّٰہی میں مشغول ہونا، اور ساتھ میں اشعارِ رجزیہ اور تعمیر بیت اللہ کے وقت کی حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی دعائیں پڑھنا عجیب موثر اور پُر جوش سماں تھا، شرقی دیوار کی بنیاد حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ و حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ و حضرت حافظ قمر الدین صاحبؒ و جناب مولانا احمد صاحبؒ رامپوری و مولانا سعید الدین صاحبؒ و جناب مولانا عبد الحق صاحبؒ پور قاضوی و جناب مولانا ظہور علی صاحبؒ وکیل سرکار بھوپال نے اپنے مبارک ہاتھوں سے رکھی، غرض کہ اس وقت بہت ہی اچھا مجمع علماء وصلحاء کا موجود تھا، **والحمدلله على ذلك**۔

مسجد کے دو درجے مسقف ہیں، مشرقی بیرونی دیوار پتھر کی ہے جس میں نہایت نفیس نقش ونگار بنے ہوئے ہیں، مینار بھی منقش پتھر کے بنائے گئے ہیں، صحن کے آخری حصے میں سنگین حوض ہے، روکار سنگِ مرمر کا کتبہ نصب ہے، جس میں مندرجہ ذیل اشعار، رشحۂ فکر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کندہ ہیں:

در مدرسہ مسجدے بِنَا شد | ایں مژدہ ز دوستاں شنیدم
بر لوحِ جبینش اسمِ اعظم | خواندم چو بصحنِ اورسیدم
در سجدۂ شکر چُوں فتادم | در گوش رسید ایں نشیدم
مقرون شدہ عبادت و علم | در مدرسہ خانقاہ دیدم [1]

دارالحدیث کی تعمیر

فخرالاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے دورِ اہتمام کی سب سے دلکش اور جاذب عمارت دارالحدیث کی ہے، تاریخ دارالعلوم میں اس پر کچھ اس انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے:

''جس طرح دارالعلوم دیوبند کو یہ شرف وامتیاز حاصل ہے کہ ہندوستان بھر میں یہ پہلی درسگاہ ہے جو عین زوالِ علم کے وقت مسلمانوں کے عام چندے سے قائم ہوئی، اسی طرح اس کو یہ تقدم وفضیلت بھی حاصل ہے کہ دارالعلوم کا دارالحدیث، ہندوستان میں پہلی عمارت ہے جو اس نام سے عالمِ وجود میں آئی، اس میں شک نہیں کہ اسلامی عہد کے ہندوستان میں جا بجا مدارس موجود تھے، اور ایک ایک ذرّہ علم کی روشنی سے منور تھا؛ لیکن مدارس کی اس کثرت و بہتات کے باوجود ہندوستان میں کوئی عمارت دارالحدیث کے نام سے اس سے پیشتر نہیں بنی، ہندوستان کی سرزمین پر یہ پہلا موقع تھا کہ دارالحدیث کے نام سے ایک بڑی عمارت بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔

دارالعلوم میں دارالحدیث کا سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب میں ۲۰ ربیع الآخر ۱۳۳۰ھ کو ایک عام جلسہ منعقد کیا گیا، جس میں ملک کے مختلف مقامات کے لوگوں نے کثرت سے شرکت کی، طلبہ نے باصرار مزدوروں

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ دارالعلوم، ج:۱ ص:۲۱۶-۲۱۹۔

کے بجائے نہایت ذوق وشوق کے ساتھ والہانہ انداز میں خود بنیاد کھودی، حضرت تھانوی، حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور حضرت مولانا عبدالرحیم نور اللہ مرقدہم نے سنگِ بنیاد رکھا، حضرت تھانویؒ نے مجمع سے فرمایا کہ: ''سب صاحب ایک ایک دو دو اینٹ اپنے ہاتھ سے رکھ دیں، نہ معلوم حق تعالیٰ کے یہاں کس کا خلوص قبول ہو جائے'' چناں چہ تمام شرکائے جلسہ نے دو دو اینٹیں رکھیں[1]۔

بنیاد دارالحدیث میں طلباء کی مخلصانہ ہمّت

دارالحدیث کے لیے بنیاد تیار کرنے میں طلباء نے جس مخلصانہ ہمّت ومحبت اور جوش عمل کا مظاہرہ کیا وہ طلباء کی زندگی کا ایک ایسا واقعہ ہے جسے بھلایا نہیں جاسکتا، اس سال کی روداد میں مذکور ہے کہ:

''جلسہ دارالحدیث کے دن سنگِ بنیاد تو رکھ دیا گیا تھا مگر بنیاد تعمیر کرنے کے لیے پہلے کنکریٹ کٹوانا ضروری تھا، اس کے علاوہ کسی قدر بنیاد بھی کھدنی باقی رہ گئی تھی، ابھی کنکریٹ ڈال کر کوٹنا ہی شروع کیا گیا تھا کہ زور وشور کی ایک طوفانی بارش ہوگئی اور قریبی تالاب پانی سے بھر گیا، حتی کہ دارالحدیث کی بنیادیں تک پانی سے لبریز ہوگئیں، یہ قطعۂ زمین تالاب ہی کا ایک حصہ تھا، جو ۱۳۲۸ھ میں اٹوایا گیا تھا، مٹی چونکہ ابھی پختہ نہ ہوئی تھی اس لیے گر گئی، اور بنیاد کا حال دَلدَل کا سا ہوگیا، اس کے علاوہ درس گاہوں تک پانی کے پہنچ جانے سے عمارتوں کو بھی خطرہ لاحق ہوگیا، ادھر تو یہ حالت تھی اور اُدھر مزدور بالکل نہیں ملتے تھے، بارش کے تواتر سے یہ احتمال بھی نہ تھا کہ پانی دو چار روز میں خشک ہو جائے گا، ڈال لگوا کر پانی نکلوانا شروع کیا؛ مگر

---

[1] تاریخ دارالعلوم، ج:۱،ص:۲۲۶۔

سارے دن میں بہت تھوڑا سا پانی نکل سکا، بالآخر نماز عصر کے بعد طلباء نے کمر ہمت باندھی، بالٹیاں لے کر کھڑے ہو گئے اور ایک گھنٹے میں تمام پانی نکال کر تالاب میں ڈال دیا، پانی نکل جانے پر معلوم ہوا کہ ابھی ایک سخت مرحلہ باقی ہے، بنیاد میں نصف قد آدم دلدل ہو گئی تھی، اس موقع پر مدرسین و طلباء کی محنت و جانفشانی کا منظر قابل دید تھا، کئی سو طلباء لگے ہوئے تھے اور قطاریں بنا کر آناً فاناً میں گارے کی بالٹیاں بھر بھر کر تالاب میں پہنچا رہے تھے، رجزیہ اشعار پڑھتے جاتے تھے، اور ہر ایک، دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی سعی میں لگا ہوا تھا، اس مقابلے اور مسابقت میں اور بھی لطف تھا، طلباء نے دو جماعتیں بنا کر کام کو نصف نصف تقسیم کر لیا تھا، جو کام مہینے بھر میں مزدوروں سے ہونا مشکل تھا وہ طلباء نے دو دن میں کر دیا، کنکریٹ کی کٹائی میں بھی طلباء نے حصہ لیا، یہ کام بھی تنہا معماروں اور مزدوروں سے شاید ایک ماہ میں بھی ختم نہ ہوتا، لیکن طلباء نے اس جدوجہد سے کنکریٹ، اینٹ اور چونا موقع پر پہنچایا کہ ایک ہفتے میں بنیادیں اوپر آ گئیں، الغرض جیسی مقدس اور متبرک تعمیر تھی ویسے ہی مخلص ہاتھوں سے بنیاد تعمیر ہوئی اور طلباء کی یہ آرزو کہ ''دارالحدیث کی بنیاد ہم کھودیں گے'' اب مع شے زائد ہو گئی[1]۔

عالم اسلام میں ماضی میں جو دارالحدیث بنائے گئے ان کے بنانے والے سلاطین اور فرماں روا تھے، اس دارالحدیث کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تعمیر میں غریب عوام کا ہاتھ کارفرما رہا ہے اور انھیں کی معمولی معمولی امدادوں سے یہ عظیم الشان عمارت عالم وجود میں آئی ہے۔

بارگاہِ نبوت میں دارالحدیث کی مقبولیت

دارالحدیث کی تعمیر سے قبل مختلف حضرات نے عالم خواب میں دیکھا کہ موقع

[1] روداد دارالعلوم، ۱۳۳۰ھ۔

تعمیرِ دار الحدیث پر دار العلوم کے اکابر مرحومین جمع ہیں اور خود اپنے ہاتھوں سے سامان تعمیر اٹھا کر لا رہے ہیں اور تعمیر میں مصروف ہیں، اسی زمانے میں ریاست ٹونک میں سرونج کے رہنے والے ایک صاحب سید یوسف علی ٹونک میں دار الحدیث کے لیے چندہ جمع کر رہے تھے، انھوں نے ایک نہایت مبارک خواب دیکھا، جو انہی کے الفاظ میں درج ہے، موصوف لکھتے ہیں:

”گذشتہ نصف شب کے بعد میں نے بعالم خواب دیکھا کہ میں بسواریٔ ریل ٹونک جا رہا ہوں، ایک کفِ دست ریگستانی مقام میں یکا یک ریل ٹھہر گئی، ایک شخص میرے پاس آئے اور کہا اترو! حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تشریف فرما ہیں، میں بکمالِ شوق ان کے ہمراہ ہو گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک جگہ چند مکان سر کی اور دو تین خیمے ایستادہ ہیں۔ میں پہلے سر کی والے مکان میں گیا، وہاں چند حضرات تشریف فرما تھے، ان میں سے ایک صاحب نے جو کسی قدر فربہ اندام اور کچھ سیاہ فام تھے، پیشانی پر سجدہ کا نشان تھا، کرتہ کی گھنڈی کھلی ہوئی تھی اور چند مجلد چرمی کتابیں ان کے پاس رکھی ہوئی تھیں، مجھ سے فرمایا کہ: ”اول حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں جاؤ!“ میں نے عرض کیا کہ کیا حضور مجھ کو خیمے کے اندر بلوائیں گے؟ فرمایا ہاں! میں سلام کر کے خیمہ مبارک پر پہنچا، دروازہ پر یاد نہیں کہ پردہ تھا یا نہیں، مجھ کو باریابی نصیب ہوئی، حضور نے مسکرا کر میری جانب دستِ مبارک بڑھایا، میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر دستِ مبارک کو بوسہ دیا اور روتا رہا، بیٹھنے کا حکم صادر ہوا، میں بیٹھ گیا، ہنس کر فرمایا تم نے کس قدر چندہ وصول کیا ہے؟ میں نے عرض کیا ۶۲/ روپیہ، ارشاد ہوا، سرونج کا اہتمام زکریا کے ذمے ہے! میں نے عرض کیا: وہ میرا بھائی ہے، فرمایا کہ اس اہتمام کا بار زکریا کو لینا چاہیے، پھر ارشاد ہوا کچھ پڑھو! میں نے

سورۂ فاتحہ سنائی، فرمایا کہ قرآن شریف صحیح پڑھا کرو۔

حضور کے قریب دو صاحب اور تھے، ایک پورے قد آور جوان، خوبصورت چہرہ، سرخ و سپید رنگ، داڑھی سینہ تک، بال سیاہ وسفید، دوسرے صاحب لانبے، لاغر جسم، ان کا پورا حلیہ یاد نہیں رہا"۔

اس خواب کو نقل کر کے موصوف لکھتے ہیں کہ:

"قبل ازیں مجھ کو دو مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی؛ لیکن خاص صورت مبارک میں اس مرتبہ کی زیارت چندہ دارالحدیث کے ساتھ جس کی بابت میں کوشاں ہوں خاص ہے"[۱]۔

دارجدید کی بنیاد

دارجدید کی پرشکوہ عمارت جو ہر آنے جانے والے کی توجہ کا مرکز اور اپنی شاندار تعمیری انداز کی وجہ سے اسلامی معماری کا ایک شاہکار ہے، اس کی بنیاد بھی فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ ہی کے دور میں رکھی گئی، تاریخ دارالعلوم میں اس کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا گیا ہے:

"پچھلے آٹھ دس سال سے دارالعلوم میں مسلسل ہر سال طلبہ کا بکثرت اضافہ ہوتا جارہا تھا، چناں چہ ۱۳۳۷ھ میں طلباء کی تعداد ۱۶۱ ۳ رتھی مگر اس سال میں یہ تعداد: ۷۰۱ رتک پہونچ گئی تھی، دارالاقامہ کے کمرے اس تعداد کے لیے بالکل ناکافی تھے، اس لیے نصف سے زائد طلباء شہر کی مختلف مساجد اور متفرق مکانات میں رہتے تھے، اس صورت میں نہ تو طلباء کو یکسوئی اور اطمینان حاصل تھا اور نہ ان کی نگرانی اور تربیت خاطر خواہ طریق پر ہوسکتی تھی، علاوہ ازیں جو طلباء دارالاقامہ میں رہتے تھے ان کی تعداد بھی

[۱] ملاحظہ ہو تاریخ دارالعلوم، ج:۱، ص:۲۲۶-۲۲۹۔

دارالاقامہ کی وسعت کے لحاظ سے زیادہ تھی، لہٰذا جگہ کی تنگی کے باعث اکثر پریشانی لاحق رہتی تھی، اس لیے مزید کمروں کی تعمیر کی ضرورت بشدت محسوس کی جارہی تھی، دارالحدیث کے شمالی، غربی اور جنوبی اطراف میں ایک وسیع دارالاقامہ بنائے جانے کی تجویز زیرغور تھی، خدا کا شکر ہے کہ اس سال میں امرتسر کے بعض ارباب خیر کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی، اور انکے عطیات سے اس مجوزہ وسیع دارالاقامہ کی بنیاد رکھی گئی، یہ کمرے جو سنین مابعد میں وقتاً فوقتاً بنائے گئے ہیں ہندوستان کے مسلمانوں کی دینداری علوم دین سے اعتناء اور دینی کاموں میں فیاضانہ امداد کی قابل قدر یادگار ہیں، یہ کمرے اس قدر وسیع اور کشادہ ہیں کہ ہر ایک میں آٹھ تک طلباء بآسائش رہ سکتے ہیں، کمروں کے سامنے برآمدے ہیں اور آگے نہایت وسیع اور پر فضا صحن ہے، جس کے تین سمتوں میں دارالاقامہ اور مشرقی جانب دارالحدیث کی نہایت عظیم الشان اور سربہ فلک وہ عمارت ہے جو ہندوستان کی سرزمین میں اپنی نوعیت کی پہلی تعمیر ہے، صحن وسیع اور کشادہ ہے جس میں قسم قسم کے چھوٹے بڑے پھول دار درختوں کی چمن بندی کی گئی ہے اور روشن بنا کر ایک خوش نما پائین باغ کی شکل دے دی گئی ہے، دار کے بالمقابل بعد میں مغربی جانب باب الظاہر تعمیر کیا گیا ہے، جو افغانستان کے بادشاہ محمد ظاہر شاہ کی دارالعلوم سے وابستگی کی ایک ایسی یادگار ہے جو تاریخ کے دامن میں ہمیشہ محفوظ رہے گی[1]۔

ریلوے اسٹیشن پر مسجد کی تعمیر

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ ہی کے دور میں دارالعلوم کے زیر انتظام ریلوے اسٹیشن پر مسجد کی تعمیر ہوئی، تاریخ دارالعلوم میں ہے:

---

[1] دیکھیے: تاریخ دارالعلوم، ج:۱،ص:۲۵۵۔

”دیو بند میں دار العلوم کی مرکزیت کی وجہ سے مسلمانوں اور اہلِ علم کی بکثرت آمد ورفت رہتی ہے، جس کا ذریعہ اس وقت صرف ریلوے تھی، پختہ سڑک بہت بعد میں تعمیر ہوئی ہے، اسٹیشن پر مسجد نہ ہونے کے سبب سے سخت دقت پیش آتی تھی، دیو بند کے بعض حضرات نے متعدد مرتبہ مسجد کی تعمیر کا ارادہ کیا، یہاں تک کہ تعمیر کے ابتدائی مراحل بھی طے ہوگئے، مگر ہر مرتبہ کچھ ایسے اسباب پیش آتے رہے کہ تعمیر شروع نہ ہوسکی، قدرت کی جانب سے یہ سعادت دہلی کے تین صاحبِ خیر اور حقیقی بھائی شیخ محمد ابراہیم، شیخ محمد یعقوب اور شیخ محمد یٰسین صاحبان کے لیے مقدر ہو چکی تھی، ان حضرات کی توجہ اور سرمایے سے اسٹیشن پر ایک خوشنما مسجد تعمیر ہوگئی، مسجد کا احاطہ کافی وسیع ہے، اردگرد پختہ چہار دیواری ہے، جس میں پُر فضا باغیچہ لگا ہوا ہے، امام ومؤذن کے لیے کمرہ ہے، احاطہ کے باہر مسجد کے مصارف کے لیے چند دوکانیں بھی بنائی گئی ہیں، پانچ ہزار روپے مسجد کی تعمیر پر صرف ہوئے، یہ مسجد دار العلوم کے زیر انتظام ہے[1]“۔

کچھ انتظامی اقدامات

اس دور میں دار العلوم کی مجلس شوریٰ نے متعدد انتظامی اقدامات کیے:

مجلس شوریٰ کے لیے کچھ اربابِ فضل وکمال کا انتخاب

۱۳۲۰ھ میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت مولانا عبد الرحیم رائے پوریؒ کو مجلس شوریٰ کا رکن بنایا گیا۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کا نیابتِ اہتمام کیلئے انتخاب

تاریخ دار العلوم میں ہے:

---

[1] تاریخ دار العلوم، ج:۱،ص:۲۴۱۔

''۱۳۲۴ھ میں اس وقت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے دار العلوم کے مالیے کو بڑھانے اور اس کو بڑے پیمانے پر ترقی دینے کی ایک عظیم الشان اسکیم تیار کی مگر اس کے لئے دائرۂ اہتمام میں ایک ایسے شخص کے تعاون اور خدمات کی ضرورت تھی جو ذی علم، صائب الرائے، بیدار مغز اراعلیٰ درجہ کی انتظامی صلاحیت کا مالک ہوتا کہ اسکیم کو بارآور بنانے میں مدد دے سکے اور انتظامی امور میں اہتمام کا ہاتھ بٹائے، مجلسِ شوریٰ نے اہتمام کی درخواست پر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کا انتخاب کیا، جو حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے فرزندِ رشید تھے اور ان جملہ اوصاف سے بدرجۂ اتم متصف تھے جو اس اہم منصب کے لئے ضروری ہیں[1]''۔

حضرت تھانویؒ کی سرپرستی

حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کی وفات کے بعد سے اب تک سرپرستی کے لیے کسی مقدس اور بااثر شخصیت کا انتخاب نہ ہو سکا تھا، اس اہم منصب کو پُر کرنے کے لیے مجلس شوریٰ نے مولانا سعید الدین صاحب رکن مجلس کی تحریک پر متفقہ طور پر حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو سرپرستی کے لیے تجویز کیا، حضرت ممدوح ابتداً اپنی کثیر مصروفیتوں کے سبب سے آمادہ نہ تھے، مگر جب مجلس اور اہتمام کی جانب سے زیادہ اصرار ہوا تو بالآخر آپ نے قبول فرمالیا۔

علامہ کشمیریؒ اور حضرت مدنیؒ مسند تدریس پر

۱۳۲۷ھ میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ دار العلوم کے مدرس بنائے گئے، تاریخ میں ہے:

''حضرت العلامہ محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا

---

[1] تاریخ دار العلوم، ج:۱، ص:۲۱۴۔

حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ جو سنینِ ماضیہ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کر چکے تھے، تدریس کے لیے اعزازی طور پر بلا معاوضہ اپنی خدمات چند سالوں کے واسطے پیش کیں، چناں چہ حسبِ خواہش دونوں حضرات کو تدریس کا کام سپرد کر دیا گیا، حضرت مولانا مدنیؒ پچھلے چند سالوں میں حرمِ نبوی میں درس دے چکے تھے، جس نے حضرت ممدوح کی شخصیت کو بہت جلد چار چاند لگا دیے تھے[۱]"۔

مسند صدارت تدریس کے لیے علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا انتخاب

۱۳۳۳ھ میں جب حضرت شیخ الہند بیت اللہ کے لیے دیوبند سے روانہ ہوئے تو آپ نے اپنی جانشینی کے فخر وامتیاز سے حضرت شاہ صاحب کو ہی شرف فرمایا اور اس طرح سے حضرت شاہ صاحبؒ ۱۳۳۳ھ سے ۱۳۴۵ھ تک دارالعلوم میں بحیثیت صدر مدرس وجانشین حضرت شیخ الہند درس حدیث دیتے رہے، اور بقول حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند:

"شیخ الہند کی ہجرت کے بعد علمی پیاسوں کو یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ علم کے ایک بحرِ ذخار سے محروم ہو گئے ہیں؛ بل کہ انہیں معلوم ہوا کہ اگر سمندر سامنے نہیں رہا تو سمندر سے نکلا ہوا ایک عظیم الشان دریا ان کے سامنے ہے جو اپنی بعض امتیازی خصوصیات کے ساتھ بدل الغلط نہیں؛ بل کہ بدل صحیح ہیں، جس سے بلا تأمل علوم کے پیاسے سیراب ہونے لگے، اور آبِ حیات سے قدیم و جدید سیرابی میں انہیں کوئی زیادہ فرق محسوس نہ ہوا[۲]"۔

حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ نے حضرت الامام الکشمیری کی صدارت تدریس پر شاندار تبصرہ فرماتے ہوئے لکھا ہے:

---

۱ تاریخ دارالعلوم، ج:۱، ص:۲۲۱۔ ۲ حیات انور، ص:۲۰۹۔

"(شیخ الہند کی جانشینی) ایک ایسا قبا تھا، جو بلا کسی قطع و برید کے حضرت شاہ صاحبؒ کے قامتِ موزون پر راست آرہا تھا[1]"۔

مطبخ کا اجراء

۱۳۲۸ھ میں مطبخ کا اجراء کیا گیا، دارالعلوم کے آغاز سے اب تک بیرونی طلبہ کے کھانے کا انتظام یہ تھا کہ کچھ طلبہ کا کھانا شہر میں مقرر ہو جاتا تھا، اہل شہر حسب قدرت ایک ایک دو دو طالب علموں کے کھانے کی کفالت کرتے تھے، کچھ طلبہ کو دارالعلوم سے خورونوش کے لیے نقد وظیفہ دیا جاتا تھا، جس سے ان کو بطور خود اپنے کھانے کا انتظام کرنا پڑتا تھا، یہ دوسری صورت طلبہ کے لیے بہت زیادہ تکلیف دہ اور پریشان کن تھی، اس لیے عرصے سے یہ ضرورت بشدّت محسوس کی جارہی تھی کہ طلبہ کو نقد وظائف کے بجائے پکا ہوا کھانا دیا جائے، اس سلسلے میں گذشتہ چند سالوں سے قرب وجوار کے اضلاع سے غلہ بھی بطور چندہ آنے لگا تھا، چناں چہ محرم ۱۳۲۸ھ سے مطبخ کے قیام سے نہ صرف ان طلبہ کو سہولت ہوگئی جن کو نقد وظیفہ ملتا تھا؛ بلکہ جو طلبہ اپنے خوردونوش کی خود کفالت کرتے تھے ان کے لیے بھی یہ آسانی ہوگئی کہ وہ بسہولت مطبخ سے قیمتاً اپنے کھانے کا انتظام کرلیں، جہاں سے ان کو نہایت کفایت اور عمدگی سے مقررہ وقت پر کھانا دستیاب ہو جاتا تھا[2]۔

۱۳۳۳ھ تنخواہوں میں اضافہ

تنخواہوں کے بارے میں دارالعلوم کا طرز ابتداء تاسیس سے نہایت سادہ رہا ہے، شان ونمود کے لیے گراں قدر مشاہرے مقرر کرنا کبھی پسند نہیں کیا گیا، اسی کے ساتھ خود دارالعلوم کے اساتذہ اور کارکنوں نے بھی تنخواہ کی نسبت ہمیشہ یہ بات ملحوظ رکھی ہے کہ وہ دارالعلوم پر صرف اسی قدر تنخواہ کا بار ڈالیں جس میں سادہ معاشرت اور

---

[1] الانور ص ۵۳۹۔

[2] دیکھیے: تاریخ دارالعلوم، ج:۱، ص:۲۲۵۔

قناعت وکفایت کے ساتھ گذر بسر کیا جا سکے، چناں چہ سب سے پہلے صدر المدرسین حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مشاہرہ صرف چالیس روپے ماہانہ تھا، چناں چہ روداد میں مذکور ہے کہ:

''دارالعلوم میں مشاہروں کی مقدار اس کی عظمت وشان او مدرسین کے کمال وشہرت نیز ان کی کفایت مایحتاج، ہر ایک کے لحاظ سے ہمیشہ کم رہی ہے، مولانا یعقوب صاحبؒ کو بایں عظمت وکمال صرف چالیس روپے ملتے تھے، مولانا سید احمد کو ۳۵/روپے، دارالعلوم کی شان اور ان حضرات کی وقعت و عظمت کو خیال کر کے ان مشاہروں کو خیال کرلیا جائے جس تنگی اور عسرت کے ساتھ یہ بزرگواران مشاہروں میں گزر اوقات کرتے تھے اس کا حال سب پر واضح ہے اور ہم نے خود مشاہدہ کیا ہے، یہ بزرگوار دیوبند سے باہر جانا گوارہ فرماتے تو کس منصب پر اور کتنے مشاہرے پر تشریف لے جاتے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب کو بھوپال بلایا گیا تھا، آپ نے انکار فرمادیا، لیکن مولانا سید احمد صاحب بھوپال تشریف لے گئے تو تقریباً ڈیڑھ سو روپے ماہوار مقرر ہوئے[1]''۔

لیکن اسی کے ساتھ دارالعلوم نے کبھی یہ پسند نہیں کیا کہ اس کے کارکن معاشی پریشانیوں میں سرگرداں رہیں اور ان کا فراغ خاطر مفقود ہو جائے، چنانچہ جب کبھی ایسی صورت پیش آئی تو دارالعلوم نے اس پر فوری توجہ کی اور بروقت مشاہروں میں حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے اضافہ کر کے اپنے کارکنوں کے لیے سکونِ خاطر اور اطمینان قلب کے ساتھ کام کرنے کا موقع بہم پہنچایا، چناں چہ سالِ رواں میں صدر المدرسین کا مشاہرہ پچاس روپے کے بجائے پچھتّر کیا گیا اور اسی نسبت سے دوسرے کارکنوں کی تنخواہوں میں اضافہ عمل میں آیا۔

---

[1] روداد ۱۳۳۴ھ، ص: ۳۸۔

۱۳۴۰ھ میں اضافہ مشاہرات اور بعض تغیرات

دارالعلوم میں ہمیشہ (جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے) تنخواہوں کا معیار بہت ہی کم اور معمولی رہا ہے اور ہمیشہ یہاں کے کارکنوں اور اساتذہ نے اپنی خدمات کے معاوضے میں حق تعالیٰ کی خوشنودی اور ایثار کو ترجیح دی ہے مگر انسانی ضرورتوں سے بھی کلیۃً قطع نظر نہیں کیا جا سکتا، اس لیے جب جنگِ عمومی کے سبب شدید گرانی پیدا ہوگئی اور مابعد جنگ بھی اس کے اثرات بدستور باقی رہے تو تنخواہوں میں اضافہ کا مسئلہ ناگزیر ہوگیا، چنانچہ اس تناسب سے اضافہ عمل میں آیا کہ صدر مہتمم صاحب کے سابقہ مشاہرے ۸۵/روپے میں ۴۰/روپے کا اور صدر مدرس صاحب کی تنخواہ ۷۰ روپے میں ۳۰/روپے کا اضافہ کیا گیا، اور اسی طرح علیٰ قدر مراتب تمام مدرسین اور ملازمین کی تنخواہیں بڑھائی گئیں۔

اس موقع پر مجلس شوریٰ نے تنخواہوں میں اضافہ کی ضرورت کی تجویز پاس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "جناب مہتمم صاحب نے دربارہ مشاہرات حضرات مدرسین و ملازمین دارالعلوم جو تجویز تحریر فرمائی ہے وہ بالکل مناسب ہے، تجویز مذکور میں جو وجوہ تحریر کی گئی ہیں ان کی بابت موجودہ حالاتِ زمانہ پر نظر کرنے سے کوئی وجہ عدم تسلیم نہیں ہو سکتی، تمام دنیا کے ہر ایک طبقے و گروہ میں معاوضۂ خدمت کی قیمت بہت زیادہ ہوگئی ہے، لہٰذا حضرات مدرسین اور دیگر ملازمین دارالعلوم بھی اضافہ کا استحقاق رکھتے ہیں"۔
>
> "مجلس شوریٰ حضرات مدرسین کا شکریہ ادا کر کے نہایت امتنان کے ساتھ ان حضرات کے ایثار کا اعتراف کرتی ہے، حضرات مدرسین نے محض بوجہ اللہ تعالیٰ خدمتِ تدریس دارالعلوم کو اپنا دینی و قومی فریضہ جان کر دوسری جگہ باوصف اضعافاً مضاعفا تنخواہ پر بلائے جانے کے باوجود دارالعلوم کو نہیں

چھوڑا، بالخصوص حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ صدر مدرس کا ایثار خاص شکریے کے قابل ہے کہ حضرت موصوف نے دارالعلوم کی قلیل رقم پیش کردہ کو قبول فرما کر دوسری جگہ اضعافاً مضاعفاً (کئی گنا زیادہ) مشاہرہ پر جانے سے بالکل انکار فرما دیا ہے، حضرت موصوف کا شکریہ بالخصوص ارکان مجلس شوریٰ پر اور بالعموم عام ہمدردانِ دارالعلوم؛ بلکہ تمام اہلِ اسلام پر واجب ہے''۔

''جناب مہتمم صاحبؒ نے اپنی یاداشت کے ساتھ جملہ ملازمین متعلقہ دارالعلوم کی فہرست مرتب فرمائی ہے؛ لیکن اس میں کسی جگہ خود مہتمم اور نائب مہتمم کے نام کا اندراج نہیں ہے، یہ بھی ایک طرح کا ایثار ہے جو حضرات موصوفین کا ہمیشہ سے شعار چلا آرہا ہے لیکن جہاں تک نظر دوڑائی جائے یہی نظر آئے گا کہ دارالعلوم میں ترقیات مالی وانتظامی جس قدر ہوئی ہیں وہ حضرات موصوفین کی جدوجہد اور کوشش بلیغ کا نتیجہ ہے، لہٰذا ان حضرات کی خدمات کا دراصل کوئی معاوضہ نہیں ہوسکتا اور مجلس شوریٰ معاوضہ تجویز کرنے سے بالکل قاصر ہے؛ مگر تاہم اس موقع پر دونوں حضرات کا اضافہ تجویز نہ کرنا مجلسِ شوریٰ کی ایک سخت کوتاہی اور نہایت ناسپاسی اور ناقدری خیال کی جائے گی، نظر براں اس فہرست میں ہر دو حضرات کے لیے بھی اضافہ درج کیا جاتا ہے[۱]''۔

دستور اساسی میں ترمیم اور مجلس انتظامیہ کا قیام

۱۳۴۴ھ میں دارالعلوم میں کچھ اختلافات رونما ہوئے، اور اس کے منفی اثرات بڑھتے چلے گئے تو ان حالات پر قابو حاصل کرنے کے لیے یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ اہتمام کے اختیارات کو نسبۃً وسیع کردیا جائے، اس کے لیے قدیم دستور اساسی میں تغیر وتبدل کیا گیا، حضرت سرپرست صاحب کی سہولت کی غرض سے

---

[۱] تاریخ دارالعلوم، ج:۱،ص:۲۶۰-۲۶۱، وروداد مجلس شوریٰ منعقدہ ربیع الاول ۱۳۴۰ھ۔

مجلس شوریٰ کا اجلاس دیو بند کے بجائے تھانہ بھون میں منعقد ہوا۔

دستور اساسی میں ترمیم و تنسیخ کے ساتھ مجلس شوریٰ نے اپنے کاموں میں امداد و اعانت اور تخفیف کار کے پیش نظر ''مجلس عاملہ'' کے نام سے ایک ذیلی مجلس قائم کی، جس کے ارکان کی تعداد پانچ مقرر کی گئی، مجلس انتظامیہ کے اراکین کے انتخاب میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا کہ یہ ایسے راکین پر مشتمل ہو جو دیو بند کے قرب و جوار میں مقیم ہوں تا کہ ماہانہ اجلاسوں میں بسہولت شرکت کر سکنے کے علاوہ وقتاً فوقتاً دار العلوم کا معائنہ بھی کرتے رہیں[1]۔

حضرت فخر الاسلام کے دور میں دار العلوم آنے والے وفود

دار العلوم کو اللہ تعالیٰ نے عجیب و غریب ہر دلعزیزی اور مقبولیت عطا فرمائی ہے اس کا ایک ہلکا اندازہ یہاں آنے والے وفود اور زیارت کے لیے آنے والی شخصیات سے کیا جا سکتا ہے، دنیا کی نامور شخصیتوں نے دار العلوم کی زیارت کے لیے اپنے شدید اشتیاق کے اظہار کیا، بڑے بڑے علماء، حکمران، سیاح اور دانش وران نے دار العلوم کی زیارت کا شرف حاصل کیا، اور اپنے قلبی تأثرات اور گہرے احساسات کا اظہار کیا، یہ سلسلہ بہت پرانا ہے، حضرت مولانا احمد صاحب کے دور اہتمام میں زائرین اور وفود کی آمد میں کثرت سے اضافہ ہوگیا، یہاں چند وفود کا تذکرہ اور ان کے تأثرات درج کیے جاتے ہیں:

سر جیمس ڈگس لیٹوش گورنر صوبہ متحدہ کی آمد

سر جیمس ڈگس لیٹوش گورنر صوبہ متحدہ ۱۳۲۲ھ میں دار العلوم دیکھنے کے لئے آئے، یہ آمد ان کی ذاتی دلچسپی اور دار العلوم کی بڑھتی ہوئی شہرت اور مقبولیت کا نتیجہ تھی، دار العلوم نے کبھی بھی حکومت کے افراد سے قرب اور تعلق کو مناسب نہیں سمجھا؛ بل کہ

---

[1] تاریخ دار العلوم، ج:۱،ص:۱۷۱۔

حکومت سے بیزاری اور مکمل طور سے اللہ پر توکل اور اعتماد دار العلوم کے اصول کا زرین حصہ ہے، خیر ڈاکٹر سر جیمس نے دار العلوم کی مختلف عمارتوں، درسگاہوں اور کتب خانہ کو دیکھا، سب سے زیادہ کتب خانہ کو پسند کیا، قرآن مجید کے قلمی نسخے نکلوا کر دیکھے، اساتذہ اور طلبہ سے بات چیت کی، اُن کا وطن پوچھا اور طلب علم کی غرض و غایت دریافت کی، طلبہ نے بتلایا کہ ہمارا نصب العین احیائے دین اور خدمت ملک وملت ہے۔ غیر ملکی طلبہ سے دور دراز مقامات سے آنے کا سبب معلوم کیا، انہوں نے بتلایا کہ ہمارے یہاں آنے کا سبب دار العلوم کی بے نظیر تعلیمی خوبی ہے، اس علمی کشش نے ہمیں یہاں کھینچا ہے، قرآن مجید کی درسگاہ میں ایک بچہ سے سورۂ رحمٰن کا ایک رکوع پڑھوا کر سنا، عصرانہ کے بعد گورنر نے جلسہ گاہ میں سپاس نامہ کے جواب میں شستہ اردو میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"مجھے مدرسہ کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، یہاں ہر جگہ سے طلبہ آتے ہیں، یہ اس مدرسہ کی ہردل عزیزی کا ثبوت ہے، میں نے یہ بھی سنا کہ یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ معاش سے پریشان نہیں ہیں، یہاں علم کے علاوہ تہذیب، اخلاق، راست بازی اور صداقت سکھائی جاتی ہے، آپ صاحبانِ مدرسہ کی ترقی میں کوشاں ہیں، یہ اچھی علامت ہے، ترقی کی یہی صورت ہوا کرتی ہے، جب کسی کام میں نئی ضرورتیں پیدا نہ ہوں تو خیال کیا جاتا ہے کہ ترقی رک گئی ہے، مجھ سے ایک نالے کی بابت کہا گیا ہے کہ جو مدرسہ کے قریب سے گزرتا ہے میں اس پر غور کروں[1]"۔

وہ گندا نالہ جس کی طرف دار العلوم نے توجہ دلائی تھی بعد میں ایک دوسرے گورنر کے حکم سے ہٹا دیا گیا، یہ نالہ نودرے کے عقب سے گزرتا تھا، اس کی وجہ سے دار العلوم کی عمارتوں کو آگے بڑھانے میں رکاوٹ پیدا ہو رہی تھی۔

---

[1] تاریخ دار العلوم، ج:۱، ص:۲۰۹۔

گورنر کی تقریر کے بعد مولانا سید احمد امام شاہی مسجد دہلی اور مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی دہلی نے علم حدیث اور ادب عربی میں کامیاب ہونے والے دو طلبہ کو ایک سال تک دس روپے ماہانہ وظیفہ دینے کا اعلان کیا۔

پریسیڈنٹ ریاست بھاول پور کی آمد اور ان کے تأثرات

مولوی رحیم بخش پریسیڈنٹ ریاست بھاول پور دارالعلوم کے خاص معاونین میں تھے، موصوف نے دارالعلوم کو دیکھ کر جو اظہار خیال فرمایا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اقتباس ذیل میں پیش کر دیا جائے، موصوف لکھتے ہیں:

''میں نے آج دیوبند کے عربی کالج کا معائنہ کیا اور جو کچھ میں نے دیکھا اس سے میں ہر طرح مطمئن ہوا، فی زمانہ ہندوستان میں بہت سے ایسے مدارس اور کالج موجود ہیں جن میں صرف عربی ہی پرانے طریقے پر پڑھائی جاتی ہے؛ لیکن بہت باتوں میں یہ کالج اپنی نظیر نہیں رکھتا، اس کے ثبوت میں میں چاہتا ہوں کہ اس کالج کی گذشتہ تاریخ پر ایک عمیق نظر ڈال کر اس کے متعلق چند مشہور واقعات کا بالاختصار بیان کر دوں''۔

''یہ کالج ہندوستان کے بڑے حکماء اور مقدس اشخاص کی کوششوں کا نتیجہ ہے، جس کا منشاء یہ ہے کہ خالص مذہب اہل السنّت والجماعت کے ان اغراض و فوائد کو ہندوستان میں محفوظ رکھے جن کی نسبت سالہا سال سے داخلی اور خارجی طور پر زوال کا قوی اندیشہ تھا، جو مضامین اس کالج میں سکھلائے جاتے ہیں وہ متعدد اقسام اور مختلف انواع کے ہیں، کالج کی کل مدتِ تعلیم آٹھ سال کی رکھی گئی ہے، جس میں املاء صرف ونحو، عروض فلسفہ، منطق، تاریخ، کلام، فقہ، ریاضی، قانونِ شریعت، علم الٰہی اور ہر ایک خیالی ودماغی سائنس شامل ہیں، لیکن اگرچہ یہ سب علوم جو کالج کی روداد میں

درج ہیں باہم نہایت مختلف ہیں، تاہم ان سب کا ایک خاص مقصد ہے جو سب میں اشتراک رکھتا ہے، یہ سب علوم عربی زبان میں سکھلائے جاتے ہیں جس کی بڑی غرض یہ ہے کہ طلباء کو کافی طور پر عربی کی استعداد حاصل ہو اوراس کے بعد وہ لوگ دماغی درس تدریس، قانونِ شریعت اور مذہب میں قوت حاصل کریں، فی الواقع یہ علوم اس امر کے لیے ذریعہ ٹھہرائے گئے ہیں کہ مذہب اسلام کے متعلق کامل درجے کی تعلیم ہو سکے، کیونکہ خالص مذہبی تعلیم ہی کی غرض سے اس کالج کی بنیاد قائم کی گئی ہے"۔

"ہندوستان میں اور کوئی ایسا خوش قسمت کالج نہیں ہے جس میں طالب علموں کی یہ کثرت اور تعلیم کی اس قدر عمدہ حالت ہو، جیسی کہ مدرسہ دیوبند میں دیکھی جاتی ہے، تمام واعظین اور پروفیسر ہندوستان کے مقدس اور دانا اہلِ اسلام میں سے ہیں، اور قدیم زمانے کی یادگار ہیں، ان لوگوں کی قابلیت مسلم اور مشہور ہے، مذہبی معاملات میں ان کے فیصلے اور فتوے کو ہندوستان کے اندر اور باہر اہل اسلام کی بڑی تعداد بلا پس وپیش قبول کرتی ہے، ان لوگوں کی شہرت خصوصاً جناب مولانا محمود حسنؒ کی صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں ہے منجملہ دیگر امور کے ایک یہ بھی سبب ہے جس نے اس کالج کو دنیا کے تمام حصوں کے اہلِ اسلام میں مشہور کر دیا ہے، فی الحال ۳۵۰ طلباء زیر تعلیم ہیں جن میں سے زیادہ تر بورڈنگ ہاؤس میں رہتے ہیں اور کالج ان کے خرچ کا متکفل ہے اور یہ خرچ اس کی آمدنی کے لحاظ سے کچھ تھوڑا نہیں ہے، طلباء ہندوستان کے مختلف صوبہ جات اور دیگر ممالک سے جوق جوق آتے ہیں، یہ امر ظاہر کرتا ہے کہ کالج اُن کی ضروریات کو کافی ہے، اور یہ امر صرف ہندوستان کے مسلمانوں ہی کے واسطے باعثِ فخر نہیں ہے؛ بلکہ پورے ملک کے لیے بھی ہے؛ کیوں کہ ملک میں یہ مشہور

اور فیض پہنچانے والا کالج ہے، اس کالج سے سند حاصل کرنے کے بعد جو طلباء نکلتے ہیں وہ اپنی جماعت یا گروہ میں نہایت وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، اور اعلیٰ درجے کا مرتبہ حاصل کر کے فوراً ہی اپنے پیروکاروں کی ایک کثیر جماعت کے ہادی اور رہنما بن جاتے ہیں اور اُن کی رائے کو ہر مسلمان نہایت عزت و وقعت کے ساتھ سنتا ہے، اس طرح وہ بہت سی جماعتوں کو ایک ہی رائے پر لا سکتے ہیں، خود اُن کی ذات کے واسطے شاذ و نادر ہی روزی کی کمی پیش آتی ہوگی، یہ لوگ آسانی سے گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم میں داخل ہو سکتے ہیں''۔

''جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں اس مدرسہ کی تعلیم زمانۂ قدیم کے موافق مشرقی طور پر خالص مذہبی تعلیم ہے، عمارات صاف ستھری اور نہایت خوبصورت ہیں؛ لیکن تعمیرات کے علاوہ اور ضروریات بھی ہیں اور کالج کو مزید امداد اور روپے کی سخت ضرورت ہے، تاکہ اس کی حالت کو ضرورتِ موجودہ کے مطابق ترقی دی جا سکے، میں نہایت خوشی کے ساتھ مدرسہ کے چندہ دہندگان کی فہرست میں ایک ہزار روپیہ چندہ دے کر اپنے نام کا اضافہ کرتا ہوں[۱]''۔

ادیب مصر علامہ سید رشید رضا مصریؒ کی دارالعلوم آمد

علامہ سید رشید رضا مرحوم دنیائے اسلام کے منتخب و متبحر عالم، نامور اہل قلم، مصر کے مشہور علمی رسالہ ''المنار'' کے ایڈیٹر اور یگانۂ روزگار مصنف تھے، ان کو مصر کے مشہور رہنما مفتی محمد عبدہ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا، اور جو فکر و اجتہاد، دقیقہ رسی اور بالغ نظری مفتی محمد عبدہ کی خصوصیت تھی، اس کا بڑا حصہ رشید رضا کے حصے میں آیا تھا، موصوف رجب ۱۳۳۰ھ میں ہندوستان آئے تو دارالعلوم کی جانب سے انھیں

[۱] تاریخ دارالعلوم، ج:۱،ص ۲۱۷-۲۱۹۔

دار العلوم میں آنے کی دعوت دی گئی، علامہ مرحوم نے دار العلوم میں تشریف لاکر اس کی علمی خدمات، درس کی مابہ الامتیاز خصوصیات، اس کے مذہبی مسلک اور علم وفکر کی مضبوط بنیادوں کو دیکھ کر انتہائی حیرت اور مسرت کا اظہار کیا، اس موقع پر حضرت علامہ محمد انور شاہ صاحبؒ نے عربی زبان میں ایک طویل تقریر فرمائی تھی، جس میں علمائے دیوبند کے علمی مسلک اور ان کی علمی خدمات کی وضاحت کی گئی تھی۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ نے عربی سپاس نامہ پیش کیا، جس میں دار العلوم کی تاریخ اور جماعتِ دار العلوم کے فقہی مسلک کا تعارف کرایا گیا تھا، سید صاحبؒ نے اپنی جوابی تقریر میں فرمایا ''جو عظیم الشان اور گراں بہا خدمات آپ علم اور دین کی انجام دے رہے ہیں ان کے لحاظ سے آپ میرے اور تمام مسلمانوں کے شکریے کے مستحق ہیں، مجھے اس دار العلوم کو دیکھ کر بڑی مسرت حاصل ہوئی، میں آپ حضرات کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں دار العلوم دیوبند کو نہ دیکھتا تو میں ہندوستان سے نہایت غمگین واپس جاتا، سید صاحب کے خاص الفاظ یہ تھے، لَوْ لَمْ أَرْهَا لَرَجَعْتُ مِنَ الْهِنْدِ حَزِيْناً!

اس مدرسہ کی نسبت میں نے اب تک جو کچھ سنا تھا اس سے بہت زیادہ پایا، استاذ جلیل مولانا انور شاہ صاحبؒ نے جو اصول بیان کئے ہیں اور اپنے مشائخ کا جو مسلک مجھے بتلایا ہے، میں اسے پسند کرتا ہوں اور اس سے متفق ہوں، فقہ حنفی بلاشبہ کافی ووافی ہے۔

علمائے دار العلوم کی سادہ زندگی اور ان کی علمی خدمات سے سید صاحب بہت متاثر ہوئے، اس کا اندازہ ان کی اس رائے سے ہوتا ہے جو انھوں نے مفتاح کنوز السنۃ کے دیباچہ میں ظاہر کی ہے، فرماتے ہیں:

''اگر ہمارے بھائی ہندوستانی علماء کی توجہ اس زمانے میں علم الحدیث کی طرف مبذول نہ ہوتی تو مشرقی ممالک سے یہ علم ختم ہو چکا ہوتا، کیوں کہ

مصر، شام، عراق اور حجاز میں دسویں صدی ہجری سے چودھویں صدی کے اوائل تک یہ علم ضعف کی آخری منزل پر پہنچ گیا تھا[۱]۔

گورنر یوپی دار العلوم میں

دار العلوم کی تاریخ میں ۱۳۳۳ھ میں دوسری مرتبہ صوبۂ متحدہ کے گورنر نے اس کا معائنہ کیا، پہلا موقع دس سال قبل حضرت گنگوہیؒ کی حیات میں ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں پیش آیا تھا، اس مرتبہ دعوت دینے کا ایک خاص سبب یہ تھا کہ جس جگہ دار الحدیث کی تعمیر ہونے والی تھی، وہاں سے ایک برساتی نالہ گذرتا تھا، اس کے ہٹائے جانے کی کوشش تو مدت سے جاری تھی مگر قرب و جوار کی زمین کے نشیب و فراز کے سبب سے اس سلسلے میں کچھ ایسی دشواریاں حائل تھیں کہ سرکاری منظوری کے باوجود نالہ ہٹایا نہیں جاسکا تھا، اس کام کی تکمیل کے لیے صوبائی حکومت کی اجازت کے ساتھ اس کی اعانت کی بھی ضرورت تھی، اس بنا پر حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ مہتمم دار العلوم کا عرصے سے خیال تھا کہ صوبہ کے گورنر کو دعوت دی جائے؛ سر جیمس مسٹن اس وقت صوبہ متحدہ کے گورنر تھے، یکم مارچ ۱۹۱۵ء مطابق ۱۳۳۳ھ کو دیوبند آئے، جلسہ خیر مقدم میں ہز آنر کو جو سپاس نامہ دیا گیا اس میں دار العلوم کے نصب العین اصولِ تعلیم، طرزِ عمل، طلباء کی ضروریات کی تکمیل اور نمود و نمائش سے احتراز، اساتذہ و طلباء کی سادہ زندگی اور دار العلوم کی تدریجی ترقی اور مستقبل کے عزائم کو وضاحت سے بیان کیا گیا تھا۔

دار العلوم کو دیکھ کر سر جیمس مسٹن کے قلب میں اس کی عظمت کا جو گہرا نقش قائم ہوا، اس کا اظہار انھوں نے اپنی مندرجہ ذیل اردو تقریر میں اس طرح کیا:

عرصے سے میری تمنا یہ تھی کہ یہاں آکر بچشمِ خود اس مشہور مدرسہ کو دیکھوں اور اس کے ذی علم مدرسوں سے تعارف و ملاقات کا مجھ کو موقع ملے، میری اس آرزو کی

۱۔ تاریخ دار العلوم، ج:۱، ص: ۲۳۰-۲۳۱۔

متعدد وجوہ ہیں، اولاً ایسے علمائے متبحرّ کی جو بلا امید نفع دنیوی تعلیم و تدریس میں مصروف رہتے ہیں، تعظیم و تکریم جو فطرتاً ہر تعلیم یافتہ شخص کے دل میں جاگزیں ہونی چاہیے، دوم وہ فخر و مباہات جو اس صوبے کے ہر باشندے کو اس مدرسہ کی وجہ سے کرنا چاہیے، جس کی شہرت تمام ممالک ایشیا اور اسلامی یورپ میں پھیلی ہوئی ہے، اور ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ میں تہہِ دل سے اس کی قدر و منزلت کرتا ہوں کہ آپ نہایت ثابت قدمی سے محض مذہبی درس و تدریس میں مشغول رہتے ہیں، میں تہہِ دل سے آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے اپنا مشہور و معروف مدرسہ مجھ کو دکھلایا اور اپنے کام اور مقاصد اصلی کے کچھ کچھ حالات معلوم کرنے کا مجھ کو موقع دیا۔

آج کل دنیا کے لوگوں کا میلان تین امور ناقص کی طرف ہے، اول یہ کہ لوگ بلا لحاظ عقبیٰ کی راحتِ دائمی کے، رات دن دولتِ دنیا کے حصول کی سعی کرتے رہتے ہیں اور اسی ادنیٰ کام میں اپنی عقل و شعور کو جو ہمارے خالقِ اکبر نے بہتر مقاصد کے لیے ہم کو عطا فرمایا ہے صرف کر دیتے ہیں، دوسرا امر یہ ہے کہ لوگ ظاہری زیب و زینت اور نام و نمود کی طرف مائل رہتے ہیں اور روحانی و باطنی برکات و ترقیات حاصل کرنے کے لیے جو سچی اور واقعی نعمتیں ہیں کوئی حصہ اپنے وقت کا باقی نہیں رکھتے، تیسرا امر یہ ہے کہ لوگ مذہب کے پردے میں تعصّب کا برتاؤ کرتے ہیں اور باہمی نزاع و نفاق پھیلاتے ہیں، بجائے اس کے مذہبی پند و تعلیم سے یہ بات ذہن نشین کریں کہ خداوندِ عالم کی نظر میں اس کے سب بندے یکساں ہیں، اور سب کو باہم دگر انکسار و درگزر کا سلوک اور اس قول پر عمل کرنا چاہیے۔

شناسند بیگانہ را ہمچو خویش
رہِ آشتی را بگیرند پیش

آپ نے ایڈریس کے اس فقرے میں جو سب سے زیادہ مؤثر ہے، یہ تحریر کیا ہے کہ آپ ان تینوں ناقص امور سے اجتنابِ کلّی رکھتے ہیں اور مجھ کو یقین کامل

ہے کہ اس طرح آپ اپنے طلباء کی ایسی تعلیم وتربیت کررہے ہیں جو دنیا و عقبیٰ دونوں جگہ ان کی راحت وخوشی کا باعث ہوگی۔

اگرچہ آپ کی قوم پر تکلیف ومایوسی کا زمانہ گزر رہا ہے مگر آپ اس کو ہمیشہ عاقلانہ وعظ وپند کی روشنی دکھلاتے رہتے ہیں، اور سچے مذہب کی تعلیم سے اس حالت افسردگی میں تسکین وتسلی دیتے رہتے ہیں، اس طرح ان کی تکلیفیں جاتی رہیں گی، اس موقع پر میں خود تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں کسی دنیوی طریقے سے آپ کی امداد واعانت کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ یہ شاید آپ کو ناگوار گذرے لیکن آپ خوب جانتے ہیں کہ اگر آپ کی طرف سے کبھی امداد کی خواہش کی جائے گی تو میں کامل طور پر اور بکشادہ دلی اس کے پورا کرنے کی سعی کروں گا، اور اس کو اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا، آج تو میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں آپ کی مہمان نوازی کا بہت شکر گذار ہوں، اور میرے دل میں آپ کے کام کی نہایت عظمت وتوقیر ہے، اور میں خدا سے یہ دعا کرتا ہوں کہ آپ کو ہر قسم کے امورِ دینی ودنیوی میں ترقی حاصل ہو"۔[1]

رسالہ سیر دار العلوم: ایک حقیقت پسندانہ تجزیہ

دہلی کے مشہور مخیّر رئیس حاجی بخش الٰہی صاحب اور ان کا خاندان دار العلوم کے خصوصی اعانت فرمانے والوں میں تھے، موصوف ہمیشہ بڑی بڑی رقموں سے دار العلوم کی اعانت میں حصہ لیتے تھے، ۱۳۳۵ھ میں ممدوح نے اپنے فرزند حاجی محمد رفیع صاحب کو دار العلوم دیکھنے کے لیے دیوبند بھیجا، موصوف نے دار العلوم میں قیام فرما کر نہایت دیدہ وری کے ساتھ ایک ایک چیز کا معائنہ کیا، اور دہلی پہنچ کر اپنے مشاہدات کو "دار العلوم دیوبند کی سیر" کے عنوان سے قلم بند کر کے خود شائع کیا، یہ رسالہ بڑی تقطیع کے ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے، دار العلوم کے ہر ایک شعبے، اس کے

---

[1] دیکھیے: تاریخ دار العلوم، ج:۱، ص:۲۴۱-۲۴۴۔

نظام، کارکنان و مدرسین اور ارکانِ انتظامیہ کا ذکر نہایت جامعیت اور مؤثر طریقے سے بیان کیا ہے، طلباء کی نسبت لکھا ہے کہ:

''شعبان کا مہینہ تھا، میں نے دیکھا کہ سالانہ امتحان ہو رہا ہے، وہاں کی نگرانی اور انتظام اور امتحان کا منظر دیکھ کر، میرے دل میں بڑے بڑے شاہانِ اسلام کا فوٹو کھنچ گیا، حقیقت میں ان ہی حضرات کی ہمت اور برکت ہے کہ ایسی بڑی جماعت کا اتنا باقاعدہ انتظام اور اہتمام کر رکھا ہے، طلباء کے شوق و رغبت کا یہ حال تھا کہ آدھی آدھی اور ساری رات ان کو کتاب دیکھتے اور تکرار و مطالعہ کرتے ہوئے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، یہ اساتذہ کی محنت اور خوبی تعلیم کا اثر ہے، جب میں طلبہ کی محنت کا یہ حال دیکھتا تھا تو مجھ کو ان بے چارے غریب و مسکین لوگوں پر بڑا رحم آتا تھا، جنھوں نے اپنے گھر بار کو چھوڑا، اپنے عزیز و اقارب کی مفارقت کو گوارا کیا، اور دور دراز سے سفر کی زحمتیں اٹھائیں اور اس ناداری کی حالت میں ایسی ایسی سخت محنتیں کرتے ہیں، اور اپنے عیش و آرام کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔

طلباء کی جماعت میں ایک طالب علم مولوی عبدالغفور صاحب کو دیکھا جو شریف الطبع شہر موصل (عراق) کے رہنے والے دیوبند میں محض تحصیل علوم کی غرض سے تشریف فرما ہیں، میں نے یہ بھی سنا کہ آپ پہلے شافعی المذہب تھے، مگر اپنی خوشی اور دلی رغبت سے باوجودیکہ اساتذہ دارالعلوم نے منع کیا، لیکن انھوں نے اپنی دلی رغبت سے حنفیت اختیار کر لی''۔

''غرض کہ وہاں روس، چین، بلخ و بخارا، کابل، روم، شام اور عرب و عجم، ہر ملک اور ہر شہر کا طالب موجود ہے، اس وقت تک ایک ہزار سے زائد عالم دارالعلوم سے بالکل فارغ التحصیل ہو کر اطرافِ ملک میں پھیل چکے ہیں، اور نہیں معلوم کہ ابھی کس قدر اور وہاں سے نکل کر امت کے لیے باعثِ ہدایت بنیں گے؛ کیوں کہ میں دیکھتا ہوں کہ ہندوستان کے اکثر حصوں میں جس

درس گاہ اور انجمن یا مدرسہ اور مکتب میں کسی ذی استعداد عالم کی ضرورت ہوتی ہے تو دار العلوم ہی سے بلایا جاتا ہے اور وہیں کے تعلیم یافتہ عالم اور مدرس یہ قابلیت رکھتے ہیں کہ ہر قسم کی کتابیں بخوبی پڑھا سکیں، چناں چہ مجھ کو بھی جب اپنے بچے کی تعلیم و تربیت کا خیال ہوا تو دار العلوم ہی سے ایک سعید و صالح نوجوان عالم مولوی قاری محمد یوسف صاحب کو بلایا، اور میرے ہی یہاں کیا؛ (بلکہ) جس بڑے شہر مثلاً کلکتہ، ممبئی، کانپور، الہ آباد، بنارس، دہلی، آگرہ، میرٹھ، بریلی، جس جگہ بھی آپ دیکھیں گے آپ کو دار العلوم ہی کے اکثر فیض یافتہ مسندِ درس پر بیٹھے ہوئے انشاء اللہ تعالیٰ ملیں گے[1]۔

حسابات کے بارے میں لکھتے ہیں:

”مجھ کو وہاں کی بعض باتوں پر نہایت حیرت اور تعجب ہوتا ہے اور عقل دنگ رہ جاتی ہے، مثلاً دار العلوم جیسے بڑے علمی مرکز کی جس کی نظیر ہندوستان کے سوا، دور دور نہیں ہے، اس کا مدار زیادہ تر عام چندہ پر ہے، اور چون برس سے نہایت خوبی کے ساتھ اسلام کی نمایاں خدمت کر رہا ہے، وہاں کا حساب، کتاب اس قدر صاف اور سچا ہے کہ جس کی نظیر بہت کم ملے گی، جس کا جی چاہے وہاں سے روداد طلب کر کے اپنا اطمینان کلی کر سکتا ہے، ہر رجسٹر وہاں کا اتنا باقاعدہ ہے کہ ابتدائی مدرسے سے آج تک جس تاریخ کا حساب آپ دیکھنا چاہیں برابر دیکھ سکتے ہیں، میری نظر سے بہت سی انجمنوں، مدرسوں اور دفتروں کے حساب کتاب گذرے؛ لیکن اتنا صاف اور سچا حساب میرے دیکھنے میں نہیں آیا، اور حق یہ ہے کہ یہ ان حضرات کے خلوص اور دیانت داری کا نتیجہ ہے، جن کو یقین نہ ہو وہ انصاف پسندی سے وہاں جا کر اس کے نمایاں اثر کو دیکھ سکتے ہیں، اور کیا عجب ہے کہ ان حضرات کا خلوص اور دیانت ہی دار العلوم کی ترقی کا سبب بن رہا ہو[2]۔

[1] دار العلوم دیو بند کی سیر، ص: ۴۰۔ [2] ایضاً، ص ۴۰، ۶)

حضرت فخر الاسلامؒ

کے دور اہتمام میں جلسہ ہائے تقسیم اسناد وانعام

جلسہ تقسیم انعام ۱۳۲۴ھ

دارالعلوم کے اکابر کا شروع سے ہی طریقۂ کار یہ تھا کہ ہر سال شعبان میں سالانہ امتحان کے بعد تقسیم انعام کا جلسہ منعقد کرتے، جس میں طلبہ کے علاوہ مقامی اور بیرونی لوگوں کو بھی شرکت کی دعوت دی جاتی تھی، جلسہ کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ مجمع عام میں مدرسین وطلبہ کی سال بھر کی محنت اور سعی وکوشش کے نتائج سامنے آجائیں تاکہ کامیاب طلبہ کی انعام ملنے پر حوصلہ افزائی ہو اور ناکام طلبہ میں شوق ورغبت کی تحریک پیدا کی جائے۔ اس کے ساتھ دوسری غرض یہ بھی تھی کہ قوم اور بالخصوص چندہ دینے والوں کو مشاہدے کے ساتھ اپنے چندے کے مصرف کا علم ہوجائے اور وہ بطور خود اطمینان حاصل کرسکیں کہ انہوں نے اپنی جس نسل اور سرمائے کو دارالعلوم کے حوالے کیا تھا اس میں دارالعلوم کہاں تک کامیاب ہوسکا ہے۔ چناں چہ اس قسم کے جلسہ ہائے انعام ہر سال دارالعلوم میں ہوتے رہے ہیں، مگر کبھی کبھی ان جلسوں کو وسیع پیمانے پر بھی منعقد کیا جاتا تھا، جس میں قرب وجوار کے علاوہ دور دراز مقامات کے لوگوں کو بھی دعوت دی جاتی تھی، اس نوع کا سب سے پہلا جلسہ ۱۲۹۰ھ میں ہوا تھا، دوسرا ۱۲۹۲ھ میں، تیسرا ۱۲۹۸ھ میں اور چوتھا ۱۳۰۱ھ میں، یہ پانچواں جلسہ تھا اور اب تک تمام جلسوں سے زیادہ عظیم الشان تھا، قرب وجوار کے علاوہ علی گڑھ، مرادآباد، شاہجہانپور، بریلی اور بھوپال وغیرہ مقامات کے بہت سے مسلمانوں نے اس میں شرکت کی، بیگم صاحبہ بھوپال کے نمائندے بھی آئے تھے، مہمانوں کو دارالعلوم اور شہر کے مکانات میں

ٹھہرایا گیا، دیو بند کے لوگوں نے حسبِ معمول مہمانوں کی راحت رسانی اور مدارات میں زیادہ حصہ لیا۔

جلسہ میں اہتمام کی جانب سے کارگزاری کی رپورٹ پیش کی گئی اور حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایک نظم سنائی جس میں دار العلوم سے قبل کی علمی حالت اور قیامِ دار العلوم کا نقشہ نہایت موثر انداز میں کھینچا گیا ہے۔ اس نظم کے چند شعر درج ذیل ہیں:

کل کی ہے بات، کہ تھی جہل کی گھنگور گھٹا
جس طرف آنکھ اٹھاتے تھے محیطِ عالم
آبِ حیواں کی طرح، علم ہوا تھا مخفی
ظلمتِ جہل سے مخلوق تھی اعمیٰ و اصم
حافظِ علم تھا، اک سینۂ صندوق فقط
نہ کوئی حامی و غم خوار، نہ کوئی ہمدم
رحمتِ حق ہوئی حامی، تو یکا یک اٹھے
چند مردانِ خدا باندھ کے صف ٹھوک کے خم
یوسفِ علم شریعت کے خریدار بنے
جمع کر کے سرِ اخلاص سے معدودِ درم
سلسلہ ڈالا فقیرانہ بنامِ ایزد
کوردہ میں کہ جہاں بیٹھے ہیں اربابِ ہمم
شوق کہتا تھا بڑھو، ضعف کہے تھا ٹھہرو
ناتوانوں کا تھا کیا کہئے عجب ضیق میں دم
اتنے میں دیکھتے بس کیا ہیں، کہ اک مردِ خدا
آرہا تیز روی سے ہے لئے ساتھ علم

کس بلا کی تھی نظر پڑتے ہی جس کے فی الفور
پڑگئی جان میں جاں، آہی گیا دم میں دم
تھی نرالی ہی کچھ اس مردِ صفا کی سج دھج
تھے عجائب ہی کچھ اس شیرِ خدا کے دم خم
گاڑ کر اس نے علَم ایک ندا کی ایسی
یک بیک چونک پڑے اہل مدر اہل خیم
اس کی آواز تھی یا بانگِ خلیل اللّٰہی
کہہ کے لبیک چلے اہل عرب اہل عجم
باندھ کر چست کمر کہتے ہوئے "نحن معک"
پیچھے پیچھے ہوئے سب اس کے بنا سر کو قدم
اس مربی دل و جاں کی مسیحائی سے
علم دیں زندہ ہوا، جہل نے لی راہِ عدم
ابرِ علم و عمل و فضل کا بادل برسا
جس جگہ اس یمِ رحمت کا پڑا نقشِ قدم
دولتِ علم سے سیراب کیا عالم کو
قاسمِ علم بھلا کیوں نہ ہو پھر اس کا علَم
اس کی آواز تھی بے شک قُمِ عیسیٰ کی صدا
جس کے صدقہ سے لیا علم نے دوبارہ جنم
پھر تو کیا تھا، دی خدا نے وہ ترقی اس کو
دیکھ لیں آپ کہیں اپنی زباں سے کیا ہم
کلفتیں جھیلیں سبھی، پر نہ ہوا چیں بجبیں
دقتیں دیکھیں، ٹلا اپنی جگہ سے نہ قدم

آخری شعر میں دار العلوم کے ہمدردوں کو امداد کی تلقین فرماتے ہیں:

پیروی کرتے رہو، سعی کو ہاتھوں سے نہ دو
بدمے یا درمے یا قدمے یا بقلم [۱]

دستار بندی کا عظیم الشان جلسہ ۱۳۲۷ھ

فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی مدارسِ عربیہ کا قدیم معمول ہے؛ مگر دار العلوم میں ۱۳۰۱ھ کے بعد سے مسلسل کچھ ایسے اتفاقات پیش آتے رہے کہ گذشتہ ۲۶ سالوں میں کوئی جلسہ نہ ہوسکا، اس سال میں گذشتہ سالوں کی تلافی کے طور پر ربیع الآخر کی ۶-۷-۸ تاریخوں میں نہایت عظیم الشان پیمانے پر جلسۂ دستار بندی منعقد کیا گیا، ہندوستان کے مدارسِ عربیہ کی تاریخ میں ایسے زبردست اجتماع کی نظیر بمشکل مل سکے گی، اس جلسے کی عظمت کا اندازہ صرف اس بات سے ہوسکتا ہے کہ اس میں باہر سے شریک ہونے والوں کی تعداد تیس ہزار سے اوپر تھی، جس میں ملک کے ہر خطے سے مسلمانوں کے ہر طبقے کے لوگ شریک تھے، قرب و جوار کے قصبات و دیہات سے پیدل آنے والوں کی تعداد اس میں شامل نہیں ہے، روداد میں مرقوم ہے کہ ''جس کشادہ پیشانی اور مسرت کے ساتھ دور و نزدیک کے لوگ آکر جمع ہوئے اور جو اثر اپنے دلوں میں لے گئے اس کی مثال بمشکل مل سکے گی، علماء اور رؤسا اور اعلیٰ عہدے دار سے لے کر ادنیٰ کاشتکار اور معمولی مزدور تک سب ایک ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے، کسی کو کسی پر فوقیت اور برتری کا خیال تک نہ تھا۔ جلسے میں سب کی نشست یکساں تھی، سب لوگ مواعظِ حسنہ سے محظوظ، پر اثر نظارہ سے متأثر اور اس دل فریب منظر پر فریفتہ نظر آتے تھے، روحانی برکات و کرامات کا نزول بھی ایسا کھلا ہوا تھا کہ غیر حساس اشخاص تک اسے محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔

[۱] رودادِ جلسۂ انعام، ۱۳۲۴ھ، تاریخ دار العلوم، ص: ۲۱۳-۲۱۴۔

جلسے کے دوران میں عجیب طرح کی اسلامی شان نمایاں تھی، دارالعلوم کی مغربی جانب تالاب کے کنارے دور تک خیموں کا طویل سلسلہ پھیلا ہوا تھا، نماز کے لیے خیموں کے سامنے میدان میں ہزاروں آدمیوں کی بڑی بڑی صفیں قائم ہوتی تھیں، راتوں کو ذکر و شغل کی آوازوں سے جنگل گونجتا تھا، ہر شخص کو برکت اور روحانی مسرت محسوس ہوتی تھی، جلسے کے ایام میں بعض صلحاء نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا: آپؐ اہلِ جلسہ سے مصافحہ فرمارہے ہیں، اس طرح کے بے شمار خواب جلسے سے قبل اور جلسے کے دوران میں لوگوں نے دیکھے، ایک بزرگ جو لوگوں سے بالکل الگ تھلگ رہتے تھے اور کسی سے بات کرنا پسند نہ کرتے تھے، جلسے سے قبل دیو بند آئے، جلسے کی ہر چیز کو بغور دیکھتے رہے، نہایت مستعدی سے ہر وقت چلتے پھرتے رہتے تھے اور جلسہ ختم ہوتے ہی یہاں سے چلے گئے، لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جلسے کی خدمت کے لیے روحانی طور پر مامور تھے[۱]''۔

اس اجتماع کی معمولی کرامت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس قدر بڑے مجمع میں ایک بھی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا، اور نہ کسی کو اپنے اموال کے نقصان یا چوری ہوجانے کی شکایت پیش آئی، کھانا ہر شخص کو بروقت مل جاتا تھا، جس کا منجانب دارالعلوم مفت انتظام تھا۔

اس جلسۂ دستار بندی کے زمانے میں حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ دارالعلوم کے مہتمم تھے، ممدوح نے اس موقع پر ایک طویل خطبہ ''دارالعلوم کا زریں ماضی و مستقبل'' کے عنوان سے تحریر فرمایا تھا، جس میں دارالعلوم کے قیام اور اس کی خدمات کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے، اور ۴۵ سال کے آمد و خرچ کا موازنہ کرتے ہوئے بتلایا گیا ہے کہ سب سے بڑی بات جس پر مدرسہ اسلامیہ دیو بند فخر کرے تو بیجا نہیں یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کے روپیے کو اچھی طرح ٹھکانے سے لگایا، تھوڑے

[۱] تاریخ دارالعلوم ج:۱،ص:۲۲۴۔

خرچ میں وہ کام کر دیکھایا جو دوسری جگہ دس گنا خرچ کرنے کے بعد بھی حاصل نہ ہوتا، خیال فرمائیے کہ اس ۴۵ سال کے عرصے میں مدرسہ کے جملہ قسم کے مصارف کی میزان جس میں تعمیرات مدرسہ و مسجد و کتب خانہ، خرید کتب، انعام طلبہ سب ہی کچھ شامل ہے، مبلغ تین لاکھ تین سو ترپن روپے ہے، اس میں اگر اسی ہزار روپے کو جو تعمیر میں صرف ہوئے علیحدہ کر دیا جائے اور دس ہزار کتب کی قیمت جو تخمیناً بیس ہزار روپے ہے نکال دی جائے تو گویا تعلیم پر دو لاکھ روپے صرف ہوئے، اب ہم اس دو لاکھ کو ایک ہزار فیض یافتہ طلبہ پر تقسیم کرتے ہیں تو فی طالب علم دو سو روپیہ آتے ہیں، اللہ اکبر، کیا حوصلہ افزا نتیجہ ہے کہ صرف مبلغ دو سو روپیہ میں ایک مکمل عالم دین تیار کر دیا جائے جو مدرس بھی ہو، مفتی بھی ہو، واعظ و خطیب بھی اور جامع منقول و معقول بھی ہو، یہ ہے واقعی کامیابی، لیکن اگر اس کے ساتھ یہ بھی دیکھا جائے کہ اس مقدار سے صرف ایک ہزار عالم ہی تیار نہیں ہوئے؛ بل کہ کئی سو حافظ قرآن بھی اسی صرفہ میں تیار ہوئے ہیں، صدہا طلبہ نے فن تجوید و قرأت بھی حاصل کیا ہے، ہزارہا مستفتیوں کو اسی صرفہ میں سے ہر وقت جواب بھی ملتے رہے ہیں، بہت سے طلبہ جو تھوڑا سا فائدہ حاصل کر کے قبل از تکمیل چلے گئے وہ بھی اسی میں ہیں، صدہا باشندگان دیوبند نے اسی صرفہ میں فارسی و ریاضی کی تعلیم بھی پائی ہے تو خرچ کا اوسط اور بھی گھٹ جاتا ہے[1]۔

رودادیں کیا کہتی ہیں

تقسیم اسناد کے جلسے جو شوال میں ہوئے تھے، وہ دراصل پچھلے سال کی انتظامی اور تعلیمی کارگزاریوں اور آئندہ تعلیمی سال کے منصوبوں کے اظہار و بیان کے لیے ہوا کرتے تھے، بعض حالات کہ وجہ سے یہ جلسے مؤخر بھی ہو جایا کرتے تھے، ایسی صورت میں دار العلوم سے نکلنے والے دونوں مجلّے ''القاسم'' اور ''الرشید'' دار العلوم کی

[1] تاریخ دار العلوم، ج:۱، ص:۲۲۲-۲۲۵۔

منتوں کا آئینہ اور ترجمان ہوتے تھے، اور خود دارالعلوم سے شائع ہونے والی روداد دارالعلوم کی ہر پیش رفت سے امت مسلمہ کو باخبر کرنے کا فریضہ انجام دیا کرتی تھی، اس لیے فخرالاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح کی ترتیب میں، ان کے دور کی علمی و عملی، روحانی و عرفانی ترقیوں کے لیے رودادِ دارالعلوم سے مدد لینا ضروری ہے، بالخصوص ان سالوں کے احوال جاننے کے لیے، جن کا تفصیلی تذکرہ تاریخ دارالعلوم میں موجود نہیں ہے، ذیل میں رودادِ دارالعلوم کے حوالے سے بعض معلومات درج ہیں:

۱۳۳۴ھ و ۱۳۳۵ھ میں دارالعلوم کی غیر معمولی ترقی

دارالعلوم نے روزِ اول سے ترقی کی جانب جو قدم بڑھایا تھا اس میں سال بسال اضافہ ہوتا رہا، اس سال کے حالات میں لکھا ہے:

> ''آخری دس سال کے اندر مدرسہ عالیہ دیوبند کا طول و عرض ہر حیثیت سے سہ چند و چہار چند ہوگیا، اگر اس کے ہر ہر شعبہ پر نظر ڈالی جائے اور موجودہ حالت کا آج سے دس سال قبل کی حالت سے موازنہ کیا جائے تو وضاحتاً معلوم ہوتا ہے کہ بعض امور میں سہ چند ترقی کر گیا ہے اور بعض میں چہار چند، مثلاً رجوع طلباء، تعدادِ مدرسین، تعمیرات، کتب خانہ، مجموعی آمد و صرف چنانچہ آخر کے چند سالوں کی نسبت کو دیکھنے سے ان کے رجوع کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے، ۱۳۲۶ھ آخر میں درجہ عربی کے طلباء کی تعداد ۱۶۹ر تھی، اور اب سات برس کے بعد چار سو سے زائد ہے، طلباء کے رجوع و ہجوم سے مدرسہ کے ہر شعبہ کو وسعت دینا لازم ہوگیا، تعمیرات کے لحاظ سے، اس لیے کہ بہت سی جماعتوں میں ۵۰/۶۰/۸۰/ تک طلباء ہوتے ہیں، اسی طرح کتب خانہ کی توسیع لازمی ہوگئی، چنانچہ بحمد اللہ ہر

چیز میں اسی نسبت سے وسعت ہوتی گئی، کتب خانہ وسیع بنایا گیا جو باوجود وسعت کے اب پھر تنگ ہو رہا ہے، درس گاہیں بنائی گئیں اور اس سلسلے میں دارالحدیث کی عمارت تجویز ہوئی[1]"۔

روحانی ترقیات

یوں تو شروع ہی سے دارالعلوم روحانیت اور اہل دل کا مرکز رہا ہے، حضرت فخر الاسلامؒ کا دور اہتمام روحانیت کے تعلق سے بھی بڑا ممتاز رہا ہے، یہ دارالعلوم کا وہی روشن دور ہے جس میں مہتمم سے لے کر دربان تک صاحبِ نسبت بزرگ ہوا کرتے تھے، ان معنوی روحانیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایک ظاہری روحانیت کا بھی سامان پیدا کر دیا اور وہ اس طرح کہ اللہ کی تقدیر سے دارالعلوم کے حصے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جبہ مبارکہ کا غلاف آیا، تاریخ دارالعلوم میں اس غلافِ مبارک کی اہمیت اور اس کی آمد کے پس منظر پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے جو درج ذیل ہے۔

جبّۂ نبوی ﷺ کا غلاف

قسطنطنیہ میں دولت عثمانیہ کے زمانے سے شاہی خزانے میں بعض آثار نبویہ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار، جھنڈا اور جبّۂ مبارک محفوظ ہیں، یہ آثار دسویں صدی ہجری کے اوائل میں آخری عباسی خلیفہ المتوکل علی اللہ نے سلطان سلیم اول کو تفویض خلافت کے وقت سپرد کئے تھے، سلاطین عثمانیہ ان آثار نبویہ کو بطور سندِ استحقاقِ خلافت اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے، جبّۂ مبارک کی عظمت کا بڑا لحاظ رکھا جاتا ہے، اور کوئی شخص خواہ وہ کسی درجے کا ہو یہ جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ خاص جبّۂ

---

[1] تاریخ دارالعلوم، ج:۱،ص:۲۴۵۔

مبارک کو ہاتھ لگائے یا بوسہ دے، جو لوگ زیارت کرتے اور بوسہ دیتے ہیں ان کا عمل اسی باریک غلاف تک محدود رہتا ہے، عثمانی سلاطین کا سقوطِ خلافت تک یہ معمول تھا کہ وہ اعیان وارکان دولت کے ساتھ سال بھر میں ایک دفعہ ۱۵ رمضان المبارک کو آثارِ نبویہ کی زیارت کیا کرتے تھے، جبہ مبارک پر جو غلاف رکھا جاتا تھا وہ کبھی کبھی خاص خاص لوگوں کو سلطان المعظم کی جانب سے تبرکاً ہدیہ کر دیا جاتا تھا، یہ غلاف اس وجہ سے کہ جبہ مبارک کو مس کئے ہوئے رہا ہے جس قدر متبرک اور موجب خیر و برکت ہے وہ ظاہر ہے۔

اب یہ جبۂ مبارک استنبول کے ایک شاہی قصر ''توپ کاپی'' میں رکھا ہوا ہے، اس قصر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد یادگاریں محفوظ ہیں، اس قصر کو سلطان محمد فاتح نے ۸۶۳ھ مطابق ۱۴۵۸ء میں تعمیر کرایا تھا، ایک عرصے تک یہ محل ترک سلاطین کا قصر خلافت رہا، بعد میں اسے میوزیم کی شکل دے دی گئی، توپ کاپی (TOP KAPI) ترکی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی ہیں ''توپ کا دروازہ''۔

توپ کاپی کے میوزیم میں متعدد ہال ہیں، ایک ہال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو تلواریں چاندی کے ایک صندوق میں رکھی ہوئی ہیں، یہیں سونے کے دو صندوق ہیں، ایک میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک اور مہر ہے جو عقیق کو تراش کر بنائی گئی ہے، مہر گلابی رنگ کے عقیق کی ہے اور بیضوی شکل میں ہے، اور دوسرے میں آپ کا ایک جھنڈا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ مبارک اور مکتوب گرامی سونے کے فریم میں لگا ہوا ہے، یہ وہ نامۂ مبارک ہے جسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مصر کے حاکم مقوقس کے نام ارسال فرمایا تھا، یہ نامۂ مبارک آثار قدیمہ کے ایک فرانسیسی ماہر بارتھل می (BARTHLMY) کو مصر میں ۱۸۵۰ء میں دستیاب ہوا تھا، فرانسیسی عالم نے اس مکتوبِ گرامی کو سلطان عبدالمجید خاں (۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء - ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۱ء) کی خدمت میں پیش کیا، سلطان معظم نے

اسے طلائی صندوق میں محفوظ کرا کر توپ کاپی میں رکھوا دیا تھا۔

توپ کاپی کے اس حصے میں جہاں یہ تبرّکات رکھے ہوئے ہیں دروازے پر چار زبانوں ترکی، جرمنی، انگریزی اور فرانسیسی میں مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہوئی ہے:

"گذشتہ سینکڑوں برسوں سے مسلمانوں کے نزدیک اس مقام کی نہ ہبی اہمیت اور بڑی قدر ہے، اس میں جتنے آثار رکھے ہیں سب مقدس اور قابل احترام ہیں"۔

آپ سے امید ہے کہ آپ اس مقدس جگہ پر خاموشی، متانت اور سنجیدگی کو ملحوظ رکھیں گے اور اس بابرکت جگہ پر کوئی نامناسب بات نہ کریں گے"۔

دارالعلوم نے جنگ بلقان کے زمانے میں ترک مجروحین و مہاجرین کی انجمن ہلالِ احمر کے ذریعے ہندوستان میں قابلِ قدر امدادی خدمات انجام دی تھیں، ان سے سلطان محمد پنجم (۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۸ء - ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۸ء) بہت متاثر ہوئے تھے، چنانچہ سلطان المعظم نے اپنے اس تأثر کا اظہار اس طرح فرمایا کہ دولتِ عثمانیہ کا سب سے بڑا متبرّک ہدیہ یعنی جبہ مبارک کا غلاف دارالعلوم کو عطا فرمایا، خالد خلیل بک دولتِ عثمانیہ کے سفیر مقیم ممبئی ۱۶ ربیع الاول ۱۳۳۲ھ کو دیوبند تشریف لائے اور سلطان المعظم کی جانب سے یہ متبرّک ہدیہ پیش کیا۔

یہ غلاف رومال کی شکل میں ہے، کپڑا اسفید، نہایت مہین اور خوش وضع ہے، وسط میں جلی قلم سے سیاہ حروف میں یہ شعر لکھا ہوا ہے

نُور الهُدیٰ نِلنَا بِهٖ تکرِیمًا
صَلّو عَلَیهِ وَسَلّمُوا تَسلِیمًا

کناروں پر ترکی زبان کے شعر لکھے ہوئے ہیں۔

یہ ذخیرۂ خیر و برکت دارالعلوم کے خزانے میں ایک نہایت خوبصورت چوبی بکس میں رکھا ہوا ہے، اور جس روز سے دارالعلوم میں آیا ہے اکثر و بیشتر اس کے

ثمرات و برکات کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے[1]"۔

مالیات کا مدّ و جزر

دارالعلوم ایک ادارہ ہی نہیں؛ بلکہ ایک تحریک ہے، ملتِ اسلامیہ کے ہر درد و غم کے لیے تڑپنا اور اس کے مداوا کی کوشش اس کا نمایاں امتیاز ہے، بارہا ایسا ہوا کہ ملتِ اسلامیہ کے مسائل کے حل کرنے کے لیے دارالعلوم نے مسلمانوں سے چندے کی اپیل کی، تاکہ مسلمان دیگر ضروری مصارف میں اپنے پیسے استعمال کریں، کبھی ایسا بھی ہوا کہ اس کے نتیجہ میں خود دارالعلوم کا مالیہ متأثر ہوا مگر دارالعلوم نے اس کی پرواہ نہیں کی، چنانچہ شدھی سنگٹھی کے زمانے میں جب مسلمان شدید ارتداد کے فتنے میں آنے لگے تھے، دارالعلوم نے مسلمانوں کو متوجہ کیا کہ وہ اپنے صدقات و عطیات ان غریب مسلمانوں کو عطا کریں جو غربت کی وجہ سے ارتداد کا شکار ہو رہے ہیں اس کے نتیجے میں مسلمان اس بڑے فتنے کی طرف متوجہ ہوئے، دارالعلوم کا مالیہ بھی متأثر ہوا، مگر اللہ تعالیٰ نے دارالعلوم کے احوال پھر اچھے کر دیئے، تاریخ دارالعلوم میں شدھی سنگھٹی کے ہنگامے اور دارالعلوم کے مالیہ پر اس کے اثرات کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے:

> "۱۳۴۱ھ میں شدھی سنگٹھی کا ہنگامہ جس شدّ و مدّ اور زور شور کے ساتھ اٹھا تھا اس کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ مسلمان ہمہ تن اس طرف متوجہ ہو گئے، وقت کا یہ تقاضہ بھی بجائے خود بڑی اہمیت رکھتا تھا مگر ان حالات کا دارالعلوم کے مالیہ پر اثر پڑنا بھی ناگزیر تھا، ۱۳۴۰ھ میں آمدنی کا اوسط ۸۲ ہزار اور صَرف ۶۸ ہزار تھا، ۱۳۴۱ھ میں آمدنی ایک دم گھٹ کر ۵۹ ہزار ہوگئی مگر صرف ۶۲ ہزار ہوا، البتہ ۱۳۴۲ھ میں سابقہ کمی کی بہت حد تک تلافی ہوگئی، اس سال آمدنی ۹۴/ ہزار اور صرف ۷۹ ہزار رہا، مگر چونکہ

---

[1] تاریخ دارالعلوم، ج:۱، ص: ۲۳۵-۲۳۸۔

سابقہ قضیے کے اثرات ابھی تک باقی تھے اس لیے ۱۳۴۳ھ میں پھر کم ہو کر آمدنی تو ۷۳ ہزار پر آ گئی مگر مصارف ۹۹ ہزار پر پہنچ گئے، مگر اس چار سالہ آمد و صرف کے عدم توازن اور مدّ و جزر کے باوجود آخری نتائج کی یہ یکسانیت حیرت انگیز رہی، کہ دارالعلوم کا تمام کاروبار بلا ادنیٰ تغیر کے بدستور جاری رہا، اس چیز کو دارالعلوم کے اعجاز سے تعبیر کرنا بے جا نہیں ہے۔ والحمد لله علیٰ ذالک[1]۔

ٹھیک یہی واقعہ ہلال احمر کے موقع پر ہوا تھا جب دارالعلوم نے اپنے آپ کو نظر انداز کر کے ترکی کے مظلوم مسلمانوں کے لیے چندے کی اپیل کی، اس موقع پر بھی دارالعلوم کا خسارہ ہوا مگر اللہ کے فضل سے چند ہی دنوں میں حالات ٹھیک ہو گئے، تاریخ میں درج ہے:

''سالِ گذشتہ میں دارالعلوم نے اپنے آپ کو نظر انداز کر کے ترکی کے مظلوم مسلمانوں کے لیے چندہ بھجوانے میں جو جد و جہد کی تھی، اس کا اثر دارالعلوم کی مالیات پر پڑنا لازمی تھا، چنانچہ سال رواں میں سات آٹھ مہینے سخت مشکلات اور ابتلا و آزمائش میں گذرے مگر الحمدللہ اس کے بعد حالت بدل گئی اور ختم سال پر آمدنی مصارف کے مقابلے میں کم رہی مگر تاہم دارالعلوم کے کسی کام میں رکاوٹ پیش نہیں آئی، دولتِ آصفیہ سے اب تک ڈھائی سو روپے ماہانہ آتے تھے، مگر اس سال کے رمضان المبارک سے یہ مقدار دوگنی کر کے پانچ سو کر دی گئی[2]''۔

---

[1] تاریخ دارالعلوم، ج:۱،ص:۲۶۷۔

[2] تاریخ دارالعلوم، ج:۱،ص:۲۳۳۔

حضرت فخر الاسلامؒ کے زمانے میں

دار العلوم کا شاندار تعارف اور چندے پر اس کا اثر

اس دور اہتمام میں حسن انتظام اور غیر معمولی تعلیمی اور تربیتی ترقیات کی وجہ سے پورے ملک میں دار العلوم کا شاندار تعارف ہوا، ہندوستان کے مسلمانوں کا دار العلوم پر اعتماد بڑھتا چلا گیا اور اس کے مفید نتائج سامنے آئے، پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ طلباء کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہوتا رہا، اسی طرح دار العلوم کے چندے میں بھی ہر سال اضافہ ہوا، چناں چہ تاریخ دار العلوم میں ۱۳۲۶ھ میں حیدر آباد اور بھوپال کے چندے میں نمایاں اضافہ کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

''حیدر آباد جس نے ایک زمانہ میں علم وفن کی سرپرستی کرنے میں ہمارے قدیم سلاطین کی رسم کہن تازہ کر دی تھی، ۱۳۰۵ھ میں دار العلوم کی جانب متوجہ ہوا اور ابتداءً سو روپیہ ماہانہ چندے سے دار العلوم کی امداد کا آغاز ہوا، گذشتہ سالوں میں اس پر ۲۵ روپیہ کا اضافہ ہوا، اور سالِ رواں میں یہ چندہ المضاعف ہو کر ۲۵۰ روپیہ ہو گیا۔

اسی طرح بھوپال کے چندے میں بھی معتد بہ اضافہ ہوا، بھوپال کا چندہ ابتداءً چھ سو روپیہ سالانہ تھا، اس میں پہلے ۲۰۰ روپیہ سالانہ کا اضافہ ہوا، مگر چند ہی مہینوں کے بعد رمضان ۱۳۲۷ھ سے اس کی تعداد تین ہزار روپیہ سالانہ کر دی گئی[1]''۔

اسی طرح مختلف ریاستوں کے ذمہ داروں اور اہل خیر مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر دار العلوم کا تعاون کیا، ۱۳۳۴ھ کی رپوٹ روداد میں حیدر آباد کے عطیہ میں

[1] تاریخ دار العلوم، ج:۱،ص:۲۱۷۔

اضافہ کا تذکرہ ہے، تاریخ دار العلوم میں اس اضافے کے بارے میں درج ہے:

''اس سال پھر حیدر آباد کے ماہانہ عطیے میں مزید اضافہ ہوا، اب تک حیدر آباد سے دار العلوم کے لیے پانچ سو روپیہ ماہانہ آتے تھے، اس سال میں بسعی حضرت مہتمم صاحب ان پر تین سو روپیہ کا اضافہ ہوکر آٹھ سو روپیہ ماہانہ ہو گئے، اور پھر چند ہی سال بعد ۱۳۴۸ھ میں ایک ہزار کر دیئے گئے، جو ریاستِ حیدر آباد کے سقوط تک جاری رہے، ان اضافوں کی کامیاب سعی سے جب بھی حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ مہتمم دار العلوم حیدر آباد سے دیوبند پہنچتے تھے تو دار العلوم کی طرف سے ان کا شاندار خیر مقدم کیا جاتا، تہنیتی جلسے ہوتے اور اس میں تبریکی نظمیں پڑھی جاتی تھیں، چنانچہ آخر کے اضافہ پر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، حضرت مولانا عبد السمیع صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم نے (جو اس وقت طالب علمی کے دور میں تھے) اپنے اپنے بلیغ قصائد سنائے۔

اس زمانے میں سلطنتِ آصفیہ کے جود و کرم سے ہندوستان کی تمام اسلامی درسگاہیں علی العموم سیرابی حاصل کرتی رہی ہیں، حکومتِ آصفیہ جس طرح دار العلوم دیوبند، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اور دوسرے بہت سے مسلم اداروں کی نہایت فیاضی کے ساتھ مدد کرتی تھی، اسی طرح بنارس ہندو یونیورسٹی اور شانتی نکیتن وغیرہ ہندو ادارے بھی ماضی میں اس کی علمی فیاضیوں سے مستفید ہوتے رہے ہیں[1]''۔

اسی طرح دوسرے ممالک میں بھی دار العلوم کا تعارف ہوا، اور وہاں کے مسلمان بھی دار العلوم کا تعاون کرنے میں پیش پیش رہے، ۱۳۳۹ھ میں ہندوستان سے دار العلوم کے چندے اور آمدنی میں کمی رہی، مگر فرانس جنوبی افریقہ اور رنگون وغیرہ

---

[1] تاریخ دار العلوم، ج:۱، ص:۲۴۴۔

بیرونی ممالک کے گراں قدر چندے نے اس کمی کو پورا کردیا، اس میں فرانس کا چندہ پہلا اور آخری چندہ تھا۔

ڈھاکہ کے لیے وفد کی روانگی

ڈھاکہ کے رئیس نواب سلیم اللہ خاں صاحب کو قومی اور اسلامی کاموں سے بڑا شغف تھا، موصوف دارالعلوم کی امداد و اعانت میں بڑی بڑی رقموں سے بیش از بیش حصہ لیتے تھے، ۱۳۳۲ھ میں جب دارالحدیث کی تعمیر و تکمیل کے لیے چندے کی اپیل کی گئی تو موصوف نے بڑی گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا اور اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ اس سلسلے میں دارالعلوم کا ایک وفد ڈھاکہ آنا چاہیے، دارالعلوم کی پچاس سالہ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ملک کے ایک بڑے رئیس کی جانب سے اس قسم کی دعوت دی گئی، دارالعلوم میں اب تک وفود کے بھیجنے کا کوئی خاص اہتمام نہ تھا، اور بالخصوص امراء اور رؤسا کی بارگاہوں سے تو مصلحتاً اجتناب ہی برتا جاتا تھا، مگر نواب صاحب کے دینی کاموں میں خلوص کے ساتھ حصہ لینے، قومی ہمدردی اور اسلامی کاموں سے شغف اور دل سوزی کے باعث ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے وفد کی روانگی کا فیصلہ کیا گیا۔

۷ جمادی الاولیٰ کو دارالعلوم کے اراکین و اساتذہ کا ایک وفد حضرت فخر الاسلام مولانا محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی زیر سرکردگی ڈھاکہ روانہ ہوگیا، نواب صاحب نے اراکین ریاست اور اپنے اعزہ کے ساتھ اسٹیشن پر استقبال کیا، اور وفد کی شایانِ شان اس کی مدارات و تواضع میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، کئی روز تک ڈھاکہ میں جلسے ہوتے رہے، حضرت شاہ صاحبؒ، حضرت مولانا مدنیؒ، علامہ عثمانیؒ اور مولانا مرتضیٰ حسنؒ نے وعظ و تقریریں فرمائیں، نواب صاحب نے افتتاحی تقریر میں بتلایا کہ:

"میں زمانۂ دراز سے دارالعلوم دیوبند کا دلی خادم ہوں اور ہر وقت یہی

خیال رہتا ہے کہ اس کی ترقی کی کوشش کروں اور دارالعلوم کی بہبودی کے
ذرائع نکالوں، چنانچہ اس وقت بھی کہ یہ خیر مقدم کا موقع ہے میں چاہتا
ہوں کہ کچھ ہدیہ پیش کروں اور امید کرتا ہوں کہ دارالعلوم کے واسطے آپ
اس ناچیز ہدیہ کو قبول فرمائیں گے، ہر چند یہ محقر (معمولی سی) نذر اس
لائق نہیں کہ اس عظیم الشان کام کے لیے جس کا آپ حضرات نے ذمہ لیا
ہے کچھ بھی کفایت کرسکے، تاہم امید کرتا ہوں کہ اس قلیل مقدار کو قبول فرما
کر سرفرازی بخشیں گے"[1]۔

نواب صاحب نے اپنی اور اپنے خاندان کی جانب سے تیرہ ہزار روپیے دیئے نواب صاحب نے ایک کمیٹی بنائی، اور وفد کو یقین دلایا کہ تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے، کمیٹی حسبِ ضرورت چندے کے ذریعے روپیہ بہم پہنچاتی رہے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ دور اپنی علمی خصوصیات اور روحانی وعرفانی ترقیات نیز اپنے حسن انتظام وانصرام کی وجہ سے دارالعلوم کا عہد زریں تھا۔

اس دور کی علمی خصوصیات اور روحانی وعرفانی کیفیات کے بارے میں مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ دیوبندی رقم طراز ہیں کہ:

"اس وقت دارالعلوم دیوبند ائمہ فن علماء اور اولیاء واتقیاء کا ایک بے مثال
گہوارہ تھا، ایک طرف نمونۂ سلف قدوۃ المشائخ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ
صاحب کشمیریؒ صدر مدرس دارالعلوم کا حلقۂ درس حافظ ابن حجر اور
شیخ الاسلام نوویؒ کے حلقۂ درس کی مثال تھی تو دوسری طرف شیخ الاسلام
حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کا حلقۂ درس امام غزالیؒ اور رازیؒ کی یاد
تازہ کرتا تھا، ایک طرف شیخ المشائخ مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰنؒ
صاحب کا حلقۂ فتویٰ ودرس حدیث وتفسیر اور اس کے ساتھ حلقۂ اصلاح و

[1] تاریخ دارالعلوم، ج:۱، ص:۲۳۹، ماہنامہ القاسم، جمادی الآخر ۱۳۳۲ھ۔

ارشاد اور سالکانِ طریقت کی تربیت کا بے نظیر سلسلہ جاری تھا تو دوسری طرف یادگارِ سلف عالم ربانی حضرت مولانا سید اصغر حسینؒ صاحب کا درسِ حدیث وفقہ اور نہایت مفید عام تصانیف کا سلسلہ جاری تھا، اسی کے ساتھ عام اصلاح خلق کے لیے ارشاد و تربیت کا ایک بڑا حلقہ تھا جس سے ہزار ہا بندگانِ خدا کی اصلاح ہوتی تھی اور ان میں دینی انقلاب نمایاں نظر آتا تھا۔ شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب اور شیخ المعقول والمنقول حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی اور حضرت مولانا رسول خاں صاحب ہزاروی رحمۃ اللہ علیہم اس زمانے کے متوسط مدرسین میں شمار ہوتے تھے، رئیس المناظرین حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب اس وقت ناظم تعلیمات تھے، فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب دار العلوم کے صدر مہتمم تھے اور اس کے ساتھ ہمیشہ ایک سبق پڑھانے کا معمول تھا، نائب مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ تھے، جن کے عربی قصائد اور عظیم الشان تصنیف "دنیا میں اسلام کیوں کر پھیلا؟" ہر طبقے کے علماء میں قبول عام حاصل کر چکے ہیں، غرض ہر طرف بزرگان سلف کے نمونے پیکر علم وعمل ستاروں کی طرح درخشاں نظر آتے تھے، جن کے چہرے دیکھ کر خدا یاد آتا تھا، ان کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہیں کہ: ع

ایک محفل تھی فرشتوں کی، جو برخواست ہوئی[1]"

❀❀❀

---

[1] تاریخ دار العلوم ج:۱،ص:۲۴۸-۲۵۱۔

آٹھواں باب

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے دور میں اکابر دیوبند کی سرگرمیاں

"یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ ازہر الہند دار العلوم دیوبند کے فیض یافتہ علمی و دینی، سیاسی و سماجی متنوع خدمات کے کسی شعبے میں پیچھے نہیں رہے، اس عظیم درسگاہ کی تربیت زندگی کو ایک ایسے رخ پر ڈالنے کی ضامن ہے، جہاں کا فاضل کبھی محدث، گاہے مفسر، داعی، امیر کارواں، مبلغ دین اور ہمہ جہت کوششوں کا امین ہوتا ہے، اسے مسیلمہ کذاب (یا اس کی ناپاک ذریت) کے مقابل میں فریضۂ حق ادا کرتے ہوئے شمشیر بے نیام بھی دیکھا جاسکتا ہے، اور خانقاہوں کے گوشوں میں "ہو حق" کے نعروں میں مصروف بھی، وہ تبلیغ دین کے لیے کمر بستہ بھی نظر آئے گا، اور اس کا فیضان علم چہار سو مواج بھی دکھائی دے گا[1]"۔

مذکورہ بالا سطور جو ایک ذمہ دار قلم اور تاریخ ہند اور تاریخ اسلام پر گہری نگاہ رکھنے والے شخص کے آبگینۂ فکر سے نکل کر، زیب صفحات ہوئے ہیں، وہ کوئی خوش فہمی یا خوش اعتقادی نہیں؛ بلکہ آخری دور میں ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ، اس پر اثر انداز ہونے والی تحریکات اور ان کے مفید یا مضر ثمرات کا جسے بھی کوئی شعور

---

[1] لالہ وگل، ص: ۱۸۱-۱۸۲۔

ہوگا وہ اس ناقابل انکار حقیقت میں کبھی شبہ نہیں کرے گا کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اللہ تعالیٰ نے دارالعلوم دیوبند کو امت اسلامیہ کے لیے ایک مسیحا کی شکل میں رونما کیا جس نے امت اسلامیہ کی ہمہ جہت خدمات انجام دی، اور ہندوستان میں اسلام کے سفینہ (جو پوری طرح مشکلات کے طوفانوں میں گھر چکا تھا) کو ساحل امان تک پہونچایا، دارالعلوم دیوبند احیائے علم وفن، تزکیہ واحسان، تصنیف وتالیف، جہاد وسیاست، تعلیم وتربیت اور تردید زیغ وضلال کی عظیم جامع تحریک کا نام ہے، یہاں سے علوم وفنون کے گلستان کی آبیاری ہوئی، انگریزوں کے خلاف محاذ آرائیاں ہوئیں، تصنیفات وتالیفات کے کتب خانے تیار ہوگئے، قادیانیت کا ایسا تعاقب ہوا کہ بوکھلا کے رہ گئی، بدعات وخرافات کے حامیوں کی دنیا تنگ کردی گئی اور وہ راہِ سنت کی طرف لوٹنے پر مجبور ہوئے، عیسائیت اور آریہ سماج کے مبلغوں کے چیلنجوں کو قبول کیا گیا اور تمام مذاہب پر اسلام کے تفوق کی کیل ٹھونکی گئی، اتباع سنت کی خوشبو یہیں سے پھیلی، اور اصلاح معاشرہ کی بنیادیں یہیں سے فراہم کی گئیں۔

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے تذکرے میں اکابر دیوبند کے کارناموں کا تذکرہ بظاہر بے جوڑ اور تعجب خیز لگتا ہے؛ لیکن یہ تعجب اس حقیقت کو سامنے رکھیے تو ختم ہو جاتا ہے کہ حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کی حیثیت اس وقت جماعتِ دیوبند کے سربراہ کی تھی، اور فکر دیوبند اور دارالعلوم سے وابستہ تمام حضرات کے وہ متفق علیہ نمائندہ تھے، ان کی ظاہری اور باطنی سرپرستی ان تمام حضرات کو حاصل تھی، اس لیے یہ تذکرہ۔ جو در حقیقت کئی تذکروں کو زندہ کرنے کی غرض سے لکھا جارہا ہے۔ اپنے اندر معنویت وافادیت کے کئی پہلو رکھتا ہے۔

سیاسی سرگرمیاں

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۵ء سے ۱۳۴۷ھ مطابق

۱۹۲۸ء تک دارالعلوم کے صدر مہتمم رہے، یہ عرصہ ہندوستانی سیاست اور عالمی سیاست کے لیے سخت انتشار اور اضطراب کا ہے، انگریزوں کے خلاف تقریباً ڈیڑھ سو سال سے چلنے والا جہاد حریت اب دوسرے مرحلے میں داخل ہو چکا تھا، انگریز کے خلاف ہندوستانی عوام ذات پات اور برادری کی سرحدوں سے اوپر اٹھ کر، متحد ہو چکی تھی۔

علمائے دیوبند کی طرف سے حضرت شیخ الہندؒ اپنے قابل فخر شاگردوں کے ساتھ، آزادی کا بگل بجا رہے تھے، اسی دور میں حضرت شیخ الہندؒ نے جنگ آزادی کو فیصلہ کن مرحلے میں داخل کرنے کی غرض سے ایک عظیم خفیہ تحریک کی بنیاد ڈالی جسے تاریخ میں ''ریشمی رومال تحریک'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے، اس تحریک اور اس کے اسباب وعوامل کو دیگر کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ یہ تحریک ناکام ہوگئی اور حضرت شیخ الہندؒ قید کر کے مالٹا بھیج دیے گئے۔

اس دور میں مسلمانوں کی سیاسی اور ملی قیادت کے لیے، ایک تاریخی قدم اٹھایا گیا، اور وہ ہے جمعیۃ علمائے ہند کا قیام، جمعیۃ علمائے ہند کا قیام ۱۹۱۹ء میں حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ، حضرت مولانا ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد اور دیگر بزرگوں کی تحریک سے عمل میں آیا، اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی اس کے پہلے صدر بنائے گئے، ہندوستان کی آزادی اور آزادی کے بعد مسلمانوں کی سیاسی وملی رہنمائی میں اس کا کردار ناقابل فراموش ہے۔

جمعیۃ الانصار کا قیام

اس دور کی سیاسی سرگرمیوں میں جمعیۃ الانصار کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے، تاریخ دارالعلوم میں جمعیۃ الانصار کے قیام کے تعلق سے درج ہے:

''حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی تحریک پر ۲۷ر رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ کو ''الانصار'' کے نام سے فضلاء دارالعلوم کی ایک جمعیت کا قیام عمل میں

آیا، یہ جمعیت جن اغراض و مقاصد کے لیے قائم ہوئی ان میں سب سے اہم مقصد دارالعلوم کے اثرات کی اشاعت و ترویج اور ان کو ہمہ گیر بنانا تھا، اس کے ساتھ مالی امداد و اعانت بھی اس کے مقاصد میں شامل تھی، ۱۳۲۹ھ میں جمعیۃ الانصار نے مؤتمر الانصار کے نام سے ایک عظیم الشان اجلاس مراد آباد میں منعقد کیا، اور زیادہ عرصہ نہ گذرنے پایا تھا کہ ملک میں جابجا قاسم المعارف کے نام سے جمعیۃ الانصار کی شاخیں قائم ہوگئیں، جمعیۃ الانصار کے اغراض و مقاصد میں بتلایا گیا ہے کہ اس جمعیت کی غرض مدرسہ عالیہ دیوبند کے مقاصد کی تائید و حمایت اور اس کے پاک اثر کی ترویج و اشاعت ہے، لکھا ہے کہ:

”مدرسہ کے اثر کی ترویج و اشاعت کلام اللہ اور احادیث رسولؐ کے صحیح معانی اور حضرت مولانا محمد قاسم قدس سرہٗ کی علمی تحقیقات ہیں، جن کی اشاعت کرنے اور اطرافِ عالم میں پہنچادینے سے بہت سے کام بن سکتے ہیں، میرا خیال ہے کہ جو شکوک فلسفۂ جدیدہ سے اب پیدا ہو رہے ہیں ان کو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ نے عرصہ ہوا کہ رفع فرما دیا ہے، ہمارے لیے جدید کلام یہی ہے کہ ہم مولانا مرحوم کی تالیفات کو اسی نظر و تحقیق سے پڑھیں جیسے کہ فلسفۂ و منطق کی کتابیں پڑھتے ہیں، یہ تجربہ ہے کہ جب مولانا مرحوم کی تحقیقات کو کبھی کسی فلسفی کے روبرو پیش کیا گیا تو اس کو اطمینان ہوگیا اور مولانا مرحوم کی ہر بات اچھی طرح دل نشین ہوگئی، مولانا کی تحقیقات کے ذریعے سے خدماتِ اسلام کرنا جمعیت کا فرض ہوگا“[1]۔

اس کے علاوہ متعدد بڑے بڑے اور اہم علمی مقاصد جمعیۃ الانصار کے پیش نظر تھے جن کی تفصیل دارالعلوم اور خود جمعیت کی رودادوں میں مذکور ہے، مگر جمعیت

---

[1] تاریخ دارالعلوم ج:۲، ص:۲۲۲۔

کی عمر کا پیمانہ اتفاقاتِ زمانہ سے بہت جلد لبریز ہو گیا اور اس کا وہ خواب جو اس نے دارالعلوم کی فلاح وترقی کی بابت دیکھا تھا شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے دور اہتمام میں اکابر دیو بند کی جو سیاسی وملی سرگرمیاں رہیں ان میں اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کہ برطانوی دور اقتدار میں جب بھی کوئی ایسا قانون بنانے کی کوشش کی گئی جو اسلامی شریعت سے متصادم ہو سکتا تھا تو علمائے دیو بند نے اس کا زبردست مقابلہ کیا اور بروقت اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے، یہ کارنامہ ہر زمانے میں انجام دیا گیا ہے، اور آزاد ہندوستان میں بھی دارالعلوم نے اپنی سیاسی قیادت کے متعدد بے مثال مظاہرے پیش کیے ہیں، مگر سر دست فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے سوانح کی ترتیب میں اپنی نوعیت کا منفرد اور جرأت وہمت سے لبریز وہ واقعہ لائق ذکر ہے جب ایک برطانوی وزیر ہند کی آمد کے موقع پر دارالعلوم کی طرف سے ایک مطبوعہ تحریر وزیر کو پیش کی گئی، اور اس میں بدلتے ہوئے حالات میں مسلمانوں کے حقوق کی طرف توجہ دلائی گئی یہ تحریر خود حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے پیش کی تھی، تاریخ میں ہے:

> ''۱۹۱۷ء میں برطانوی وزیر ہند کی ہندوستان میں آمد کے سلسلے میں ملک کے انتظام میں کچھ تغیرات متوقع تھے، اسی موقع پر دارالعلوم دیوبند کی جانب سے ایک مطبوعہ تحریر کے ذریعہ مسلمانوں کو اپنے ضروری حقوق طلب کرنے پر متوجہ کیا گیا، اس توجہ دہانی کی اہمیت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس وقت تک مسلمانوں کی کسی سیاسی جماعت نے اس پر توجہ نہیں دی تھی، یہ تحریر جو ''تجاویز علمائے دیوبند'' کے عنوان سے حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمہ اللہ مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند نے پیش کی تھی، اس میں لکھا ہے کہ:
>
> ''بروقت تشریف آوری وزیر ہند بہادر نظام ملک میں اہم تغیرات کی توقع کی جاتی ہے، گورنمنٹ کے اعلان ۲۰؍اگست ۱۹۱۷ء سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

ایسے وقت میں مسلمانوں کے مذہبی حقوق اور ان کی کامل آزادی کا تحفظ ضروری ہے، سیاسی مجالس نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، علماء کا اس وقت کا سکوت آئندہ کے لیے مضر ثابت ہوگا، اس لیے نہایت ضروری ہے کہ منجانب علماء دیوبند جو ہندوستان کے ہر حصے میں، پھیلے ہوئے ہیں اور اکثر و بیشتر حصہ مدارس دینیہ وسلاسل اسلامیہ ان کے انتظام وسپردگی میں ہے، ایسی تجاویز پیش کردی جائیں، بنابریں یہ تجاویز آپ کی خدمت میں بھیجی جاتی ہیں کہ ان کو ملاحظہ فرما کر اپنی رائے سے یا ان کے علاوہ کوئی اور تجویز پیش کرنی ہو، اس سے مطلع فرمائیں، اور اسی مطبوعہ تحریر پر اپنی رائے ثبت فرما کر دارالعلوم دیوبند میں بھیج دیں، علماء کے یہ مطالبات ہر حال میں قابل منظوری ہیں، خواہ ہوم اول یا سیلف گورنمنٹ اپنے اصل معنی میں ملک ہند کو دیئے جائیں یا ان کا کچھ حصہ دیا جائے۔

ان تجاویز کی منظوری کے لیے گورنمنٹ سے عرض کرنا ہر حال میں اسلامی معاملات کے تحفظ اور حسب قوانین شرعیہ بلاکسی قسم کی مداخلت یا مزاحمت کے نفاذ کے لیے نہایت ضروری ہے۔

(۱) طبقۂ علماء بحیثیت حقیقی نمائندگان عامۂ مسلمین ہونے کے کسی قسم کی تبدیلی جو مسلمانوں کے کامل آزادانہ حقوق وفوائد سیاسی یا مذہبی کے انتفاع یا تحفظ میں خطرہ پیدا کرنے کا باعث ہو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

(۲) مسلمانوں کے عام فوائد کے لحاظ سے یہ امر اشد ضروری ہے کہ کم سے کم ایک مسلمان عالم جو اسلامی دینیات میں دستگاہ کامل رکھتا ہو منجانب سرکار ہر لیجس لیٹو کونسل کے لیے جماعت میں سے نامزد کیا جائے۔

(۳) تمام معاملات فیمابین اہل اسلام بموجب قانون شرع محمدی قاضی ومفتیان کی عدالت ہائے اسلامی سے طے ہونے چاہئیں اور اس قسم کی عدالتیں

شرع محمدیؐ کے مطابق ملک ہند میں قائم ہونی چاہئیں۔

(۴) تحفظ اوقاف و مساجد و معابد و مقابر وغیرہ وغیرہ اہل اسلام زیر نگرانی شیخ الاسلام بموجب قواعدِ شرعیہ اسلام ہونی چاہئیں۔

(۵) کوئی ایکٹ واضعان آئین وقوانین جو اس معاملے میں قوانین شرعیہ اسلام سے متصادم ہوگا نافذ نہیں ہونا چاہیے۔

(۶) ایک علیحدہ محکمہ بماتحتی شیخ الاسلام کے جس کے ارکان علماء میں سے انتخاب کیے جاویں، قائم ہونا چاہیے۔

ہر فرقے کے قائم مقام اس کی مجلس کے رکن ہوں اور اس فرقے کے معاملات کی نگرانی ان کے سپرد کی جائے۔

(۷) معاملات مذہبی فیما بین اہل اسلام و دیگر اقوام کا تصفیہ مخلوط عدالتوں میں ہونا چاہیے۔

(۸) تعلیم مذہبی کو قطعاً آزاد رہنا چاہیے اور کوئی ایسا قانون جو اس میں رکاوٹیں پیدا کر سکے، نافذ نہیں ہونا چاہیے۔

(۹) سند یافتگانِ مدارس مذہبی کو ان صیغہ جات میں جو ان کے مناسب حال ہوں ملازمت ملنی چاہیے۔

خادم الاسلام

محمد احمد مہتمم دارالعلوم دیوبند[۱]

یہ تجاویز جو حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے پوری جماعت کی نمائندگی کرتے ہوئے، برطانوی وزیر کو پیش کی، اپنے اندر بڑی اہمیت رکھتی ہے، خاص طور سے تعلیم کی آزادی اور مسلمان ججوں کے تقرر کا مسئلہ اس وقت کا انتہائی اہم ترین مسئلہ تھا؛ کیوں کہ اسلامی شریعت کے مطابق بہت سے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے

۱۔ تاریخ دارالعلوم، ج ۱ ص ۴۹۷-۴۹۹۔

قاضی کا مسلمان ہونا شرط ہے، اسلامی احکام کی رو سے عورت خود نکاح کو فسخ نہیں کرسکتی، بلکہ ضروری ہے کہ مسلمان قاضی سے نکاح فسخ کرایا جائے، اسی طرح نکاح، طلاق، میراث، وقف، شفعہ کے ہزاروں مقدمات ایسے ہوتے ہیں جن میں مسلمان حاکم کے فیصلے اور حکم کی ضرورت ہوتی ہے، غیر مسلم حاکم کا فیصلہ شرعی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہے، برطانوی عہد میں بہت سے مقامات ایسے تھے جہاں کوئی منصف یا جج مسلمان نہیں تھا، اس صورت میں خاص طور پر ان عورتوں کے لیے بڑی مشکلات تھیں جو خلع کی ضرورت مند تھیں۔

ان کے لیے دشواری یہ تھی کہ اگر وہ غیر مسلم حاکم سے فسخ نکاح کا حکم حاصل کر کے دوسرا نکاح کرلیتی ہیں تو وہ گنہگار اور مرتکب حرام ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ علمائے دیوبند کا سیاسی سفر جو تحریک آزادی کی ابتدا میں حضرت شاہ عبدالعزیز سے شروع ہوا، وہ حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید، پھر حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حضرت گنگوہیؒ، حضرت نانوتویؒ کے واسطے سے حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے شاگردوں کے دور تک بلا انقطاع جاری رہا۔

دفاعی سرگرمیاں

(الف) قادیانیوں کا استیصال

انگریزی دور حکومت میں، انگریزی کذاب اور دجال نبی غلام احمد قادیانی کا مسئلہ، امت مسلمہ کے لیے قیامت صغریٰ سے کم نہیں؛ اس دور میں مسلمان جن حالات سے گذر رہے تھے، وہ تاریخ سے تھوڑی سی واقفیت رکھنے والے شخص سے مخفی نہیں، مادی، اقتصادی اور سیاسی بدحالیوں کے زمانے میں مسلمانوں کے پاس ایک ایمان اور پیغمبر آخرالزماں (فداہ أبی و أمی) صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہی وہ واحد سرمایہ تھی،

جو انہیں مشکل حالات میں، حوصلہ دیتی اور اور مردانہ وار مقابلہ پر آمادہ کرتی تھی۔

شاطر انگریز اس ایمانی قوت کے راز سے واقف تھے، انہوں نے بڑی خفیہ چالاکی سے غلام احمد نامی ایک شخص کو کھڑا کیا، تاکہ وہ نبی بن کر مسلمانوں کو اپنی نبوت کی طرف دعوت دے، اور رفتہ رفتہ مسلمانوں کے دل سے ان کی ایمانی حرارت کو ٹھنڈا کرے، مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی نبوت کا دعویٰ کیا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری پیغمبر ہونے کا انکار کیا، یہ فتنہ بڑی تیزی سے پھیلا، اور سینکڑوں مسلمان اس کی زد میں آگئے، مگر اللہ تعالیٰ نے بروقت ایسے علمائے مخلصین کو کھڑا کردیا جنہوں نے قادیانی نبوت کے طلسم کو توڑ کر رکھ دیا، مقام تشکر ہے اور دارالعلوم اور دارالعلوم سے وابستہ تمام افراد کے لیے سرمایۂ افتخار کہ اس فتنہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دینے کی قیادت علمائے دیوبند نے کی اور اس کے سرخیل علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور آپ کے نامور تلامذہ رہے، بلاشبہ قادیانیت کی تردید میں دوسرے اداروں اور جماعتوں نے بھی شرکت کی، لیکن قادیانیت کی راہ کا سنگ گراں دارالعلوم دیوبند اور اس سے وابستہ علماء ہی تھے، علامہ انظر شاہ کشمیریؒ نے خوب لکھا ہے:

> ”انفرادی واجتماعی طور پر مرزا سے نمٹنے کے لیے جو کچھ کوششیں کی گئیں ان میں بڑا زبردست کردار دارالعلوم دیوبند کا رہا ہے، ایک صدی پرانا (اور اس تحریر کے وقت ڈیڑھ صدی پرانا) علم ومعرفت کا یہ میخانہ جس کی بنیاد ان اکابر اہل اللہ نے رکھی، جو اپنے وقت کے قطب اور امام تھے، محض ایک تعلیم گاہ نہیں؛ بلکہ فکر ونظر کی ایک ٹکسال ہے، ہندوستان میں اسلامی اقتدار ٹوٹ جانے کے بعد، خود اسلام کو جن خطرات کا سامنا تھا، ان سے حفاظت کے لیے لطیفۂ قدرت نے دارالعلوم کی شکل اختیار کی، آج ہندوستان وپاکستان میں پچانوے فی صدی مدارس، درسگاہیں، تعلیمی ادارے تصنیف وتالیف کے شعبے دارالعلوم کے فیضان کا پرتو ہیں؛ جب کہ پانچ فی صدی یہ کارنامے

دوسرے اداروں کے حصے میں آتے ہیں، دارالعلوم نے جو کچھ کیا، ان جلیل خدمات کا تعارف اس وقت سامنے نہیں، تاہم قادیانی تلبیس کو شکست و ریخت کرنے میں جو کچھ اس کا کردار ہے، اس کی ایک مختصر تفصیل بہر حال پیش کرنا ہوگی۔

اس ادارہ کی یہ عجیب و غریب خصوصیت ہے کہ وقت کا جب بھی کوئی ایسا فتنہ اٹھا، جس کے سرے خفی واخفی انداز میں، الحاد و زندقہ یا ضلالت و گمراہی سے مل رہے ہوں، دارالعلوم کے اکابر نے انہیں پہلے ہی لمحے میں دریافت کیا اور ان جراثیم کی دریافت جو دوسروں کے لیے راز تھی، اکابر دارالعلوم کے لیے ایک سامنے کی حقیقت رہتی۔

''حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی مومنانہ فراست نے ''براہین احمدیہ'' کے پیچ و خم میں مرزا کے زیغ و ضلال کو پڑھ لیا تھا، قادیانیت کے اٹھائے ہوئے فتنے سے نمٹنے کے لیے دارالعلوم کی پوری مشنری حرکت میں آئی، مولانا انور شاہ کشمیریؒ، مولانا مرتضی چاندپوری، مفتی محمد شفیع، مولانا محمد انوری رائپوری، مولانا بدر عالم، مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ چھوٹے بڑے سینکڑوں افراد و اشخاص سب دارالعلوم کی مشین کے پرزے تھے، جو مشترک طور پر قادیانیت کے خلاف حرکت میں آئے، پس بلاشبہ انفرادی و اجتماعی کوششیں جو ان کی جانب سے قادیانیت کے خلاف منظر عام پر آئیں، ان کا تعلق دارالعلوم ہی سے ہے، اگرچہ اس مہم میں ہندوستان کے دوسرے اداروں نے بھی شرکت کی، لیکن قادیانیت کے مقابلہ میں اصل حریف اور اس کی راہ کا سنگ گراں دارالعلوم دیوبند ہی تھا''۔

''اس موقعہ پر حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیریؒ (بانیٔ ندوۃ العلماء لکھنؤ) کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا، جن کی زندگی کا بڑا حصہ قادیانیت کی

تردید میں صرف ہوا، اور آپ ہی کی کوششوں سے بہار میں ایک عظیم الشان مناظرہ ہوا، جس میں خود علامہ کشمیریؒ نے بھی شرکت کی، بہرحال علامہ انور شاہ کشمیریؒ جو قادیانیت کے دورِ شباب میں دارالعلوم کے صدر نشین تھے، آپ نے اس فتنہ کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کیا، اور قلب بریاں کے ساتھ اسلام کے تحفظ وحفاظت کے لیے کھڑے ہوگئے، سب سے پہلے آپ نے اپنے تلامذہ کی مستقل جماعت تیار کی، جنہوں نے تقریر وتحریر دونوں محاذ پر قادیانیت کا بھرپور مقابلہ کیا، آپ ان تلامذہ سے اپنی نگرانی میں بیش قیمت کتابیں لکھواتے، اور آپ کی تصحیح وتائید کے بعد وہ کتابیں شائع ہوتیں، تردید قادیانیت کا یہ ذوق حلقۂ تلامذہ میں اس درجہ استوار کردیا تھا کہ پھر جہاں کہیں آپ کا کوئی شاگرد پہونچا، اس نے ردِ قادیانیت کو اپنا فریضہ سمجھا، مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مولانا ادریس صاحب کاندھلویؒ، مولانا بدر عالم صاحبؒ، مولانا محمد انوریؒ، مولوی ابوالوفاء شاہ جہاں پوریؒ، یہ چند نام اس پرجوش حلقے کے ہیں جسے علامہ نے قادیانیت کے خلاف صف آراء کیا تھا[1]''۔

(ب) بدعات وخرافات اور باطل نظریات کا تعاقب

اکابر دیوبند کا ایک بڑا کارنامہ یہ رہا ہے کہ دینی، علمی اور فقہی مسائل سے لے کر تہذیب ومعاشرت اور سیاست وتمدن تک، دین کے کسی شعبے میں انہوں نے اسلامی شریعت کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا، انہوں نے کسی گوشے میں بھی حریف طاقتوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے، انیسویں صدی عیسوی مسلمانوں کے عقائد، افکار اور نظریات کے لیے ایک زبردست چیلنج تھی، مغربی علوم وفنون اور فرنگی تہذیب تمام دنیا کو ایک عظیم سیلاب کی طرح اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی، دوسری طرف عیسائی

---

[1] نقش دوام، ص ۱۸۳-۱۸۵۔

مشنریاں مسلمانوں کو اپنے دین وایمان سے برگشتہ کرنے پر کمر بستہ تھیں، تیسری طرف بدعات وخرافات کو بھی کچھ ایسے ''محافظ'' مل گئے تھے جو مروجہ رسوم وبدعات کے سوا کسی چیز کو اسلام نہیں سمجھتے تھے، اور داعیانِ سنت کو وہ سیدھا خارج از اسلام سمجھتے تھے، گویا اسلام کا قلعہ چاروں طرف سے بادِ مخالف کی زد میں تھا، ایسے وقت میں یہ علماء دیوبند ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے ''دارالعلوم دیوبند'' قائم کر کے ایک مضبوط دفاعی حصار تیار کیا، اور اسی مرکزی پلیٹ فارم سے شریعت اسلامی کے تحفظ اور باطل افکار ونظریات کے استیصال کے لیے راستے ہموار کیے۔

ابتدائی مرحلے میں جن حضرات نے باطل افکار ونظریات کی تردید میں نمایاں خدمات انجام دیں، ان میں سرفہرست حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، حضرت الامام محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا ابوالمنصور وغیرہ حضرات تھے، ان حضرات نے پوری ہمت و جرأت کے ساتھ عیسائی مشنریاں بدعتیوں اور منکرین حدیث کا زبردست مقابلہ کیا، اور شریعت اسلامی کو اس کی صحیح شکل میں باقی رکھنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے دور اہتمام میں بھی اکابر دیوبند کی تمام تر سرگرمیاں اسی شان کے ساتھ جاری رہیں، اور اس دور میں کسی قدر عیسائی مشنریوں کا زور ٹوٹ چکا تھا، ہندو پنڈت بھی مناظروں میں لگاتار شرمناک شکست کے بعد اپنا راستہ بدل چکے تھے، اب وہ ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کرنے میں لگے تھے، اس دور میں مسلمانوں کو فکری طور سے تین فتنوں کا سامنا تھا، (۱) قادیانی فتنہ، یہ سب سے عظیم فتنہ تھا اور اس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے، (۲) بریلوی فتنہ، (۳) غیر مقلدین کا فتنہ۔

بریلویت کا فتنہ

جہاں تک بریلوی فتنہ کی بات ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اگر اسے ''فتنہ عمیاء'' (اندھا فتنہ) کا نام دیا جائے تو بالکل بجا ہے، یہ اندھا فتنہ اس لیے ہے کہ بریلویوں کو

بھی یہ پتہ نہیں کہ ہمارا عقیدہ کیا ہے؟ جن مسائل کو علمائے دیوبند اور بریلوی حضرات کے درمیان مختلف فیہ کہا جاتا ہے، ان مسائل میں بانی بریلویت مولانا احمد رضا خاں کے اقوال اتنے متضاد ہیں کہ یہ طے کرنا مشکل ہے کہ ان کا اصل عقیدہ کیا ہے؟

اس لئے پورے برصغیر میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی کو سب سے "بے چارہ اور مسکین" کہا جائے تو بے جا نہیں؛ کیوں کہ کبھی تو وہ خود اپنے فتاویٰ کی روشنی میں کافر ہوتے رہتے ہیں اور کبھی اپنی جماعت کے مولویوں کے ذریعے، اور خود اس جماعت کے لوگ جب علماء دیوبند کی حقیقت حال سے واقف ہو کر مولانا احمد رضا خاں کے فیصلے میں غور کرنے لگتے ہیں تو احمد رضا کا نشتر تکفیر انہیں بھی مسلمان نہیں رہنے دیتا۔

ہاں دو چیزوں میں بریلوی حضرات ہمیشہ سنجیدہ رہے (یہ الگ بات ہے کہ سنجیدگی اور بریلویت دو متضاد چیزیں ہیں) (۱) بدعات کی حمایت اور انہیں جائز قرار دینے کی کوشش، (۲) علمائے دیوبند کی مخالفت۔

اگر بریلویت کے قیام کا مقصد انہیں دو چیزوں کو قرار دیا جائے تو بے جا نہیں، بانی بریلویت انگریز دوستی میں، کمر کس کر، علمائے دیوبند کی مخالفت کے لیے میدان میں اترے اور چوں کہ اس اختلاف کی کوئی علمی اور شرعی بنیاد نہیں تھی، اس لیے انہیں اس اختلاف کے فروغ میں دروغ گوئی، مکر و فریب اور دجل و تلبیس میں بھی کوئی عار محسوس نہیں ہوئی۔

بریلویت کو لگام دینے کی جو باضابطہ کوشش ہوئی ہے وہ فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کا ہی دور اہتمام ہے، موقع کی مناسبت سے یہ بات لکھ دینے میں کوئی حرج نہیں کہ علمائے دیوبند اختلاف اور اتفاق دونوں میں ہمیشہ اعتدال پر قائم رہے، اختلاف کو ہمیشہ وہ علمی اور سنجیدہ انداز میں حل کرنے کی کوشش کرتے تھے، اختلاف کو ہوا دینا اور اس کے دائرہ کو بڑھا دینا نہ علمائے دیوبند کا شیوہ رہا اور نہ ہی یہ نبی کریم۔صلی اللہ علیہ وسلم۔وصحابۂ کرامؓ اور سلف صالحینؒ کی سنت ہے۔

احمد رضا بریلوی کے نام حضرت فخر الاسلامؒ کا مکتوب

مثال کے طور پر جب مولانا احمد رضا خاں نے علمائے دیو بند کی مخالفت کے بال و پر نکالنے شروع کیے، تو سب سے پہلے انہوں نے علمائے دیو بند کی بعض عبارتوں پر اعتراض کیا، اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب ''حفظ الایمان'' کی ایک عبارت کو لے کر تو انہوں نے کچھ زیادہ ہی ہنگامہ کیا، اور مناظرہ کرنے کا ارادہ کیا جب یہ خبر شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیو بندیؒ اور فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ تک پہنچی تو آپ نے انتہائی عالمانہ اور مشفقانہ انداز میں مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ کو خط لکھا اور انہیں براہ راست گفتگو کی دعوت دی گئی تاکہ آپس کے اختلافات ختم ہو جائیں اور امت میں انتشار نہ ہونے پائے، یہ خط مختلف کتابوں میں چھپ چکا ہے، ہم یہ خط ''شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندی، ایک سیاسی مطالعہ'' مرتبہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری سے نقل کرتے ہیں، تاکہ قارئین کو علمائے دیو بند کی انصاف پسندی کا کچھ اندازہ ہو سکے، ڈاکٹر ابو سلمان صاحب نے اس خط سے پہلے ایک مختصر تمہید لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ خط حضرت شیخ الہند صدر المدرسین دار العلوم دیو بند اور فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب مہتمم دار العلوم کی طرف سے مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے نام ہے، جو مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی کو مولانا عبد الرحمٰن صدیقی مفسر و محشی بیضاوی کے کاغذات میں ملا تھا، یہ خط احمد رضا صاحب بریلوی اور مولانا اشرف علی تھانوی کے مراد آباد میں ۲۷ر صفر ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء، کو ہونے والے مناظرے کے سلسلے میں ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حیات اور کارنامے، مرتبہ ڈاکٹر رشید الوحیدی، دہلی''۔

اس تمہید کے بعد ڈاکٹر صاحب نے پورا خط نقل کیا ہے، خط کا متن یہ ہے:

"نحمده و نصلی علی رسوله الکریم

جامع الاشتات جناب مولوی احمد رضا خاں صاحب اصلح الله بالنا و بالکم اظہار مایلیق بشانکم کے بعد واضح ہو:

معلوم ہوا ہے کہ آپ نے مولانا اشرف علی صاحب سے حفظ الایمان کے متعلق مناظرہ کا عزم کرلیا ہے، گو ابھی اس مناظرہ کی تاریخ مقرر نہیں ہوئی، مگر یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ مراد آباد میں کسی عرس کی شرکت کے لیے آنے والے ہیں، مولانا اشرف علی صاحب، حسب قرار داد معاہدہ آپ سے وقت معین پر مناظرہ کریں گے، اور آپ کے مؤاخذات (اعتراضات) پر حفظ الایمان کا جواب دیں گے۔

مگر چوں کہ آپ نے حضرت مولانا قاسم الخیر والبرکات (حضرت نانوتویؒ)، حضرت مولانا رشید الملت والدین (حضرت گنگوہیؒ) کی نسبت بھی دادِ ایمان داری دی ہے اور آپ اس میں مدعی ہیں، اس لیے ہم کو حق ہے کہ آپ سے آپ کے دعووں کا ثبوت طلب کریں؛ بلکہ حسب قاعدہ "الاقدم فالاقدم" آپ کو اول ہر دو حضرات مرحومین کے متعلق تصفیہ کرنا ضروری ہے، اور ان نزاعات کو اس موقع پر مراد آباد میں طے کرلیا جاوے، اور مسلمانوں میں جو اختلاف واقع ہو رہا ہے اس کو رفع کر دیا جائے۔

اس لیے ہم آپ کی خدمت میں اطلاع دیتے ہیں کہ آپ اس خاص کام کے لیے تیار ہو کر مراد آباد کا قصد فرما دیں، ہم بالاصالۃ مشافہۃً (براہ راست) زبانی گفتگو کریں گے، آپ بفور پہونچنے اس تحریر کے، اپنے پہونچنے کے وقت سے اطلاع دیں تا کہ ہم لوگ پہلے سے مراد آباد پہونچ جاویں، اگر آپ نے ہماری تحریر کا کچھ جواب نہ دیا، تب بھی بغرض اظہار

حق و رفع اختلاف ہم لوگ مراد آباد کا قصد ضرور کریں گے۔

مکرر یہ کہ آپ سے اصالۃً گفتگو ہوگی، وکالت معتبر نہ ہوگی، اور اگر اصالۃً گفتگو سے انکار کر کے کسی وکیل مسلّم کو پیش کریں گے، تو اس وقت ہم کو بھی اختیار ہوگا کہ اپنی طرف سے وکیل مسلّم کو پیش کریں۔

محمود حسن۔ محمد احمد[1]"

اس خط کے متن کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کس قدر مشفقانہ انداز میں اصلاح اور اظہار حق کی نیت سے مولانا احمد رضا خاں صاحب کو متوجہ کیا جا رہا ہے، اگر وہ اسی وقت سنبھل جاتے اور مل کر اپنی غلط فہمیاں دور کر لیتے تو بات یہاں تک نہ پہونچتی لیکن بجائے اس کے کہ وہ اس طرف متوجہ ہوتے، نہ جانے ان کے سر میں کیا سودا سمایا کہ پورے طور سرکشی پر اتر آئے، بدزبانی اور افترا پردازی کی تمام سرحدوں کو پار کر گئے، ڈرامائی انداز میں عبارتوں کی قطع و برید کر کے ایک تکفیری افسانہ تیار کیا اور تمام علمائے اہل حق کو انتہائی بے شرمی کے ساتھ کافر قرار دے ڈالا۔

اب وقت آ گیا تھا کہ بریلوی صاحب کے اعتراضات کا سنجیدگی سے جواب دیا جائے تاکہ امت مسلمہ اس فتنہ سے محفوظ رہ سکے، اس وقت اس فتنہ کی تردید میں تین بزرگوں نے نمایاں خدمات انجام دی حضرت مولانا مرتضی حسن چاند پوریؒ، حضرت مولانا خلیل احمد انبہٹویؒ اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ۔ بریلویوں کے اعتراضات کے جوابات دیئے گئے، ان کے جھوٹ و مکاری کا پردہ چاک کیا گیا۔

یہ بات ہر شبہ سے بالاتر ہے کہ بریلویوں کو حق کا راستہ دکھایا جا چکا ہے اور ان پر پوری طرح حجت مکمل کر دی گئی ہے، اگر اس کے بعد بھی وہ اپنی ضد پر جمے ہوئے ہیں تو یہ صرف ان کی ہٹ دھرمی اور عناد ہے۔

---

[1] شیخ الہند مولانا محمود حسن، ایک سیاسی مطالعہ، ص ۱۳۳-۱۳۴۔

غیر مقلدیت کا فتنہ

کسی امام کی تقلید کرنا یا نہ کرنا فی نفسہ کوئی فتنہ نہیں، اس لیے کہ تقلید کے وجوب پر اجماع ہو جانے کے بعد بھی امت میں کچھ ایسے علماء پیدا ہوئے، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کسی امام کی تقلید نہیں کی، اور آج تک امت انہیں اچھے القاب سے یاد کرتی ہے؛ لیکن یہ اس وقت فتنہ بلکہ عظیم فتنہ بن جاتا ہے جب قرآن وحدیث کی پیروی کے نام پر ائمۂ سلف کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا جائے اور ان ائمہ کی تقلید کرنے والوں کو گمراہ بلکہ مشرک تک کہہ دیا جائے، بدقسمتی سے یہ فتنہ ہندوستان میں رونما ہوا، اور ایک ایسے وقت میں کہ نبی کریم - صلی اللہ علیہ وسلم - صحابۂ کرام اور سلف صالحین اور پوری تاریخ اسلام، مستشرقین کے نشانے پر تھے اور تاریخ اسلام کو مطعون کیا جا رہا تھا، نادان غیر مقلدین نے ائمۂ سلف کے اعتماد کو مجروح کر کے مغربی استعمار کو تقویت پہونچائی، جب یہ ہنگامہ ایک فتنہ کی شکل اختیار کر گیا تو اکابرین دیوبند کو اس کی تردید کی طرف متوجہ ہونا پڑا، خود حضرت الامام محمد قاسم نانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند اور قطب الارشاد حضرت گنگوہیؒ نے اس کی تردید میں متعدد تصانیف لکھیں، فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے دور اہتمام میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور علامہ انور شاہ کشمیری رحمہم اللہ نے غیر مقلدیت کی تردید میں نمایاں خدمات انجام دیں، اور مختلف موضوعات پر متعدد تصانیف وجود میں آئیں۔

تصنیفی وتالیفی سرگرمیاں

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے دور اہتمام میں جس طرح بشمول مولانا محمد احمد صاحبؒ، اکابر دیوبند نے دیگر میدانوں میں کارہائے نمایاں

انجام دیئے، اسی طرح تصنیف و تالیف کے میدان کو بھی انہوں نے اپنی محنت کی جولان گاہ بنایا اور تفسیر و حدیث فقہ و ادب، عقائد و کلام، احسان و تصوف، تاریخ و سیرت اور مختلف موضوعات پر ہزاروں تصانیف وجود میں آئیں۔

دارالعلوم کے فیض یافتگان کی قلمی صلاحیتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے تاریخ دارالعلوم میں لکھا گیا ہے:

"دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی اور تدریسی خدمات ایک معروف حقیقت ہے، اور دنیا نے اس کا اعتراف کیا ہے، مگر علمائے دیوبند نے درس و تدریس، وعظ و تقریر اور دوسرے دینی مشاغل کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی جو عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ہیں وہ نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کے لیے بلکہ دنیائے اسلام کے لیے بھی ایک قابلِ فخر سرمایہ ہے، علوم دینیہ سے متعلق کوئی علم و فن ایسا نہیں ہے جس میں ان کی تصنیفات و تالیفات موجود نہ ہوں، ان میں بڑی بڑی ضخیم کتابیں بھی ہیں اور چھوٹے چھوٹے رسالے اور کتابچے بھی ہیں، یہ کتابیں زیادہ تر تو عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں ہیں، مگر ان کے علاوہ اور زبانوں میں بھی ملتی ہیں، دارالعلوم دیوبند کی خدمات کے دو رخ ہیں، ایک اندرونی جس کا تعلق طلباء کی تعلیم و تدریس سے ہے، اس کا دوسرا رخ بیرونی ہے جو عام مسلمانوں اور ملک سے متعلق ہے، عوام سے رابطہ، وعظ و تبلیغ، فتویٰ، دینی و ملکی معاملات میں قوم کی شرعی رہنمائی، تذکیر و تزکیہ اور تصنیف و تالیف اس کے اہم عنوانات ہیں، اس سلسلے میں دارالعلوم سے جو قابل قدر خدمات انجام پائیں وہ برصغیر کی تاریخ میں آپ اپنی مثال ہیں صرف تصنیف و تالیف ہی کے میدان میں تنہا ایک بزرگ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے، دینی اور

اصلاحی نقطۂ نظر سے زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں حضرت تھانویؒ کی تصنیف موجود نہ ہوں، وہ اپنی تصانیف کی کثرت اور افادیت کے لحاظ سے ہندوستانی مصنفین میں اپنا جواب نہیں رکھتے، ہندوستان میں دینی شغف رکھنے والا کون شخص ہے جو حضرت تھانویؒ کی ایک بہشتی زیور ہی سے واقف نہیں ہوگا۔

حضرت تھانویؒ اور بعض دوسرے بزرگان دیوبند کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی تصنیفات کا حق تصنیف محفوظ نہیں رکھا، بلکہ ان کو افادۂ ملت کے لیے عام کردیا ہے ان بزرگوں کو تجارت اور منفعتِ مالی کبھی مقصود نہیں رہی بلکہ صرف افادہ واصلاح کا مقصد سامنے رہا ہے[۱]"۔

علماء دیوبند کی تصانیف شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی نظر میں:

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ ہندوستانی علماء، خاص طور سے علماء دیوبند کے علوم کی گہرائی وگیرائی اور ان کے اخلاص وتقویٰ سے کافی متأثر تھے۔ وہ علماء دیوبند کی دینی دعوت اور تعلیمی واصلاحی خدمات کی مقبولیت کا بنیادی سبب بھی ان کے اخلاص اور تقویٰ کو قرار دیتے ہیں۔

تاریخ دارالعلوم میں ہے:

"علمائے دیوبند کے اس تحریری سرمائے کا مدار شام کے ایک جلیل القدر عالم شیخ ابوغدہ کے الفاظ میں گہرے علم اور وسیع مطالعے کے علاوہ تقوی و صلاح، روحانیت اور استغراق فی العلم ہے، چناں چہ شیخ ابوالفتاح ابوغدہ نے علمائے دیوبند کی تصانیف کی اہمیت کے اعتراف کے ساتھ اس خواہش کا اظہار بھی کیا ہے کہ ان میں جو کتابیں اردو اور فارسی زبانوں

---

[۱] تاریخ دارالعلوم ۱/۵۱۹۔

میں ہیں ان کا عربی میں ترجمہ کرایا جائے تا کہ عرب دنیا کو بھی ان سے استفادے کا موقع مل سکے[۱]"۔

شیخ کے الفاظ یہ ہیں:

"علم وتقویٰ کے اساطین سے مالا مال اس عظیم الشان ادارے کے علمائے عظام کی خدمات جلیلہ کا ذکر کرتے ہوئے میں ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں بلکہ اگر ذرا جرأت کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہمارا ایک واجبی حق ہے جس کا مطالبہ میں کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ان علمائے کرام کا فریضہ ہے کہ اپنے متفردانہ عقول کے نتائج فکر اور بیش بہا علمی فیوض وتحقیقات کو عربی زبان کا جامہ پہنا کر عالم اسلام کے دوسرے علماء کے لیے استفادے کا موقع فراہم کریں، یہ فریضہ ان حضرات پر اس لیے عائد ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص ہندوستان کے علمائے محققین کی کوئی تصنیف پڑھتا ہے تو اس میں اس کو وہ نئی متفردانہ تحقیقات ملتی ہیں جن کا مدار گہرے علم اور وسیع مطالعے کے علاوہ تقوی وصلاح اور روحانیت پر ہوتا ہے۔

چونکہ ہندوستان کے یہ علماء و شیوخ کرام نیکی و صلاح روحانیت اور استغراق فی العلم جیسی شروط پر نہ صرف یہ کہ پورے اترتے ہیں بلکہ سلفِ صالحین کے صحیح وارث اور ان کے نمونے ہیں اس لیے ان کی کتابیں بہت سی نئی تحقیقات اور حسب حالاتِ وقت کتنی ہی کارآمد چیزوں پر مشتمل ہوتی ہیں، و ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ ان حضرات کی بعض کتابیں تو وہ ہیں جن میں ایسی چیزیں ملتی ہیں جو متقدمین علمائے اکابر، مفسرین، محدثین اور حکماء کے یہاں بھی دستیاب نہیں ہوتیں، لیکن افسوس اور قلق کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان نادر تالیفات میں سے اکثر

---

[۱] تاریخ دارالعلوم، ج:۱،ص:۵۱۹۔

بلکہ سب کی سب اردو زبان میں لکھی گئی ہیں، جو گو ہندوستان کی عام اسلامی زبان سہی، لیکن عربی کو کثیر الاستعمال اور علوم اسلام کی خاص زبان ہونے کا جو شرف حاصل ہے ظاہر ہے کہ وہ اردو کو حاصل نہیں ہے، لہٰذا یہ علوم اور گراں قدر تحقیقات جو ہمارے برادرانِ اسلام علماءِ ہند کا خصوصی حصہ اور کارنامہ ہیں۔

اگر ان کو اردو ہی کے قالب میں محبوس رکھا گیا تو ہم عربی بولنے والوں سے مخفی و پوشیدہ رہ کر ہماری محرومی کا باعث بنی رہیں گی، اس طرح نہ صرف یہ ہمارے ساتھ ہی زبردست ناانصافی ہوگی بلکہ علم و دین کے حق کا بھی ایک بڑا نقصان ہوگا، اس لیے فریضۂ معرفت اور امانتِ علم کی ادائیگی کے لیے یہ بات اولین واجبات میں سے ہے کہ ان نفیس شاہکار اور عمدہ کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا جائے، تاکہ ان سے وہ آنکھیں روشنی حاصل کریں جو ایسی چیزوں کے لیے بے تاب، تشنہ اور مشتاق ہیں، اور جیسا کہ میرا خیال ہے اس اہم ذمہ داری اور کٹھن فریضے کی ادائیگی کا کام اسی ادارۂ عامرہ کے افراد کر سکتے ہیں جو علمائے کرام اور طلبائے نجباء کا گہوارہ و سرچشمہ ہے[1]۔"

اس دور میں اکابر دیوبند کے حقیقت رقم قلم سے جو تصانیف وجود میں آئیں ان کا اجمالی تذکرہ بھی کتاب کی طوالت کا سبب ہوگا، ہاں ان چند کتابوں کا ذکر کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، جو اسلامی کتب خانے میں خوشگوار اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اور امت بجا طور پر ان پر فخر کر سکتی ہے۔

ان گنی چنی چند اہم اور قابل قدر تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابوں کو جگہ دی جا سکتی ہے:

---

[1] تاریخ دار العلوم، ج:۱،ص:۵۲۰۔

قرآن مجید کے تراجم وتفاسیر اور متعلقات

۱	ترجمۂ قرآن مجید	شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ
۲	ترجمۂ قرآن مجید	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۳	حواشی قرآن مجید مترجمہ شاہ شیخ الہندؒ	حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندید
۴	حواشی قرآن مجید مترجمہ شاہ عبدالقادرؒ	حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ
۵	اعجاز القرآن	حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندیؒ
۶	تفسیر بیان القرآن (بارہ جلدیں)	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۷	قصص القرآن	حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سہارویؒ
۸	مشکلات القرآن (عربی)	حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ
۹	منحۃ الجلیل فی بیان مافی معالم التنزیل	حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ
۱۰	وحی الٰہی	حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی
۱۱	ہدیۃ المہدیین فی آیۃ خاتم النبیین	حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی

حدیث اور متعلقاتِ حدیث

۱	الابواب والتراجم (عربی)	شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ
۲	اعلاء السنن (اٹھارہ جلدیں)	مولانا ظفر احمد عثمانی زیر نگرانی حضرت مولانا اشرف علیؒ
۳	انوار المحمود حاشیہ سنن ابوداؤد	حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ
۴	بذل المجہود شرح ابوداؤد (عربی، ۵ جلدیں)	حضرت مولانا خلیل احمد انبہٹویؒ
۵	تدوین حدیث	حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
۶	ترجمان السنۃ	حضرت مولانا بدر عالم میرٹھیؒ

۷	التعلیق الصبیح شرح مشکوٰۃ المصابیح (عربی)	حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ
۸	تقریر الترمذی	شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ
۹	حاشیہ آثار السنن علامہ شوق نیمویؒ	حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ
۱۰	حاشیہ سنن ابن ماجہ (عربی)	حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ
۱۱	حجیۃ حدیث	حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ
۱۲	العرف الشذی علی جامع الترمذی (عربی)	حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ
۱۳	فتح الملہم شرح صحیح مسلم (عربی)	حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
۱۴	فضل الباری شرح صحیح بخاری	حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
۱۵	فیض الباری علی صحیح البخاری (عربی)	حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ
۱۶	مشکوٰۃ الآثار	حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ
۱۷	نبراس الساری علی اطراف البخاری (عربی)	مولانا عبد العزیز گوجرانوالا
۱۸	الکنفح الشذی شرح الترمذی	مولانا رشید احمد گنگوہیؒ
۱۹	الورد الشذی علی جامع الترمذی	شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ

فقہ اور متعلقاتِ فقہ

۱	احکام القرآن	حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، حضرت مولانا ادریس کاندھلویؒ
۲	امداد الفتاویٰ (۶ جلدیں)	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۳	امداد المفتیین	حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ
۴	بہشتی زیور (۱۱ حصوں میں)	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۵	تعلیم الاسلام	حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ

۶	حاشیہ شرح نقایہ (عربی)	حضرت مولانا اعزاز علی امروہیؒ
۷	حاشیہ کنز الدقائق (عربی)	حضرت مولانا اعزاز علی امروہیؒ
۸	حاشیہ نور الایضاح (عربی)	حضرت مولانا اعزاز علی امروہیؒ
۹	فتاویٰ امدادیہ (اشرفیہ)	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۱۰	کفایۃ المفتی	حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ
۱۱	مفید الوارثین	حضرت مولانا سید اصغر حسینؒ
۱۲	میراث المسلمین	حضرت مولانا سید اصغر حسینؒ

عقائد وکلام

۱	حدوث مادہ وروح	حضرت مولانا ادریس کاندھلویؒ
۲	الدین القیم	حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ
۳	علم الکلام	حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ
۴	عقائد الاسلام	حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ
۵	عقائد الاسلام قاسمی	حضرت مولانا طاہر قاسمی دیوبندیؒ
۶	عقائد الفرائد حاشیہ شرح عقائد	مولانا محمد علی چاٹگامی

احسان وتصوف

۱	آداب الشیخ والمرید	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۲	تبویب تربیت السالک	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
		حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۳	تربیت السالک	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۴	التشرف بمعرفۃ احادیث التصوف	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

۵	التصرف فی تحقیق التصوف	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۶	الکشف عن مہمات التصوف	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۷	خصوص الکلم فی حل فصوص الحکم	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۸	شرح مثنوی مولانا رومؒ	مولانا عبدالقادر ڈیروی
۹	شریعت وتصوف	حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب علی گڑھی
۱۰	عنوان التصوف	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۱۱	کلید مثنوی مولانا رومؒ	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۱۲	مبادی التصوف	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۱۳	مسائل السلوک من کلام ملک الملوک	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

ادب ولغت

۱	اردو عربی ڈکشنری	حضرت مولانا عبدالحفیظ بلیاویؒ
۲	بیان اللسان (عربی اردو لغت)	حضرت مولانا زین العابدین سجاد میرٹھی
۳	البنیات ترجمہ اردو قصائد لامیۃ المعجزات	حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہیؒ
۴	التعلیقات شرح المقامات	مولانا نورالحق
۵	حاشیہ دیوان حماسہ (عربی)	حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہیؒ
۶	حاشیہ دیوان متنبی (عربی)	حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہیؒ
۷	حاشیہ مقامات حریری (عربی)	حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ
۸	حاشیہ مفید الطالبین (عربی)	حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہیؒ
۹	قصیدہ لامیۃ المعجزات (عربی)	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ
۱۰	معین اللبیب فی قصائد الحبیب (عربی)	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ
۱۱	نفحۃ العرب (عربی)	حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہیؒ

تاریخ وسیرت

نمبر	کتاب	مصنف
۱	اسلام کا نظام تعلیم وتربیت	حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
۲	اسلام کا نظام حکومت	حضرت مولانا حامد الانصاری غازی
۳	اسلام میں غلامی کی حقیقت	حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی
۴	اشاعتِ اسلام	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ
۵	اعیان الحجاج	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی
۶	امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی	مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
۷	انوار قاسمی (حضرت نانوتوی کی سوانح حیات)	مولانا انوار الحسن شیر کوٹیؒ
۸	بلاغ المبین فی مکاتیب سید المرسلین	حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی
۹	پانی پت اور بزرگانِ پانی پت	حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی
۱۰	تاریخ الاسلام	حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی
۱۱	تاریخ الحدیث	حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی
۱۲	تاریخ القرآن	حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی
۱۳	تجلیات عثمانی	مولانا انوار الحسن شیر کوٹیؒ
۱۴	حیات امداد اللہ مہاجر مکیؒ	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۱۵	حیات امدادؒ	مولانا انوار الحسن شیر کوٹیؒ
۱۶	حیات شیخ الہندؒ	حضرت مولانا میاں سید اصغر حسین دیوبندیؒ
۱۷	حیات شیخ الاسلام	حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی
۱۸	خاتم الانبیاء	حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ
۱۹	خاتم النبیین	حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ

۲۰ خلق عظیم — حضرت مولانا حامد الانصاری غازی
۲۱ رسول کریمؐ — حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی
۲۲ زبدۃ السیر — مولانا عماد الدین شیرکوٹیؒ
۲۳ سفرنامہ شیخ الہندؒ — حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
۲۴ سوانح ابوذر غفاریؓ — حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
۲۵ سوانح اویس قرنیؒ — حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
۲۶ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک — حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ
۲۷ شہید کربلا — حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی
۲۸ میری ڈائری — حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ
۲۹ النبی الخاتم — حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
۳۰ نشر الطیب — حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۳۱ نقش حیات — حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
۳۲ ہزار سال پہلے — حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
۳۳ ہندوستان عہدِ مغلیہ میں — حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ

علم کلام حقائق اسلامیہ اور فن اسرار دین اور دوسرے مختلف علوم وفنون میں دیوبند کے بزرگان سلف وخلف کی ہزاروں محققانہ تصانیف ہیں جن کا شمار اور تعارف ان مختصر اوراق میں ممکن نہیں ہے۔

❁❁❁

نواں باب

قیام دکن

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کو اللہ تعالیٰ نے بڑی علمی صلاحیت اور غیر معمولی مقبولیت سے نوازا تھا، آپ ایک باوقار اور بارعب عالم دین، صاحب فراست اور دقیقہ سنج منتظم اور صاحب دل بزرگ تھے، آپ ہی کے دور میں دارالعلوم کو عظیم مرکزیت حاصل ہوئی، اس کے افکار و خیالات نے امت مسلمہ میں مقبولیت حاصل کی اور فضلائے دارالعلوم کے علوم و تحقیقات کو اعتبار اور قدر کی نگاہ سے دنیا میں دیکھا جانے لگا۔

دارالعلوم جوں جوں ترقی اور شہرت کے منازل طے کرتا گیا، منتظمین اور اساتذہ دارالعلوم بالخصوص حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شہرت اور مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا، آپ کی علمی قابلیت ملک گیر شہرت، اور بے نظیر انتظامی صلاحیت کو دیکھ کر، نظام دکن نے ریاست دکن کی عدالت عالیہ میں آپ کی خدمات حاصل کرنی چاہی۔

نظام دکن

نظام دکن سے مراد آصف جاہ سابع امیر عثمان علی خان بہادر ہیں، امیر عثمان

علی خان ۱۹۱۱ء سے ۱۹۴۸ء تک حیدر آباد کے حاکم رہے۔

آپ بڑے علم دوست اور علماء نواز تھے، آپ کی توجہات عالیہ کی برکت سے دائرۃ المعارف العثمانیہ سے اسلامی تہذیب و ثقافت کے بارے میں اساس کا درجہ رکھنے والی کتابیں تحقیق و تخریج کے زیور سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئیں۔

امیر عثمان علی خان کی بڑی خواہش تھی کہ عدالت عالیہ کے عہدۂ قضاء پر ایسی شخصیت کو بحال کیا جائے جو علوم شرعیہ میں مہارت کے ساتھ ساتھ، زمانے کی نزاکتوں سے خوب واقف ہو، اور ایک اچھے قاضی کے تمام اوصاف کا حامل ہو، نظام دکن کی نظر حضرت فخر الاسلام علیہ الرحمہ پر پڑی، اور اکابر کے مشورے سے یہی طے پایا کہ یہ درخواست مسترد نہ کی جائے اور اس کی سب سے بڑی وجہ ریاست دکن اور دارالعلوم دیوبند کے دیرینہ تعلقات تھے، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

نظام دکن کا دارالعلوم سے رابطہ

ریاست دکن کے فرماں روا دارالعلوم سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے تھے، دارالعلوم کی ضروریات پر ان کی نظر تھی، چناں چہ ایک زمانے میں جب دارالعلوم کے تمام ملازمین کی تنخواہ ڈھائی ہزار (۲۵۰۰) روپے ماہانہ تھی، نظام دکن ماہانہ ایک ہزار (۱۰۰۰) روپیہ سے دارالعلوم کو گراں قدر امداد فراہم کیا کرتے تھے، جو ظاہر ہے ایک قیمتی علمی تعاون تھا، پہلے گذر چکا ہے کہ جب دارالطلبہ کی تعمیر شروع ہوئی تو حیدر آباد کے مسلمانوں نے دل کھول کر اس میں حصہ لیا، اسی طرح حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے آخری دور میں دارالعلوم میں انتظامی امور سے متعلق اختلاف رونما ہوا، تو نظام دکن نے ایک تحقیقاتی وفد دارالعلوم روانہ کیا، اور اس وفد نے دارالعلوم کے انتظامی اور مالی امور پر اطمینان کا اظہار کیا، ظاہر ہے یہ گونا گوں سرگرمیاں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ نظام دکن علم و ادب کے اس قلزم عرفاں کی کارکردگیوں سے کافی

متاثر تھے، اور موقع بموقعہ دار العلوم کی مدد فرمایا کرتے تھے۔

نظام دکن کی شان میں حضرت شیخ الادبؒ کا قصیدہ

نظام دکن کے حسن اخلاق، علم دوستی، علماء نوازی اور دار العلوم سے بے پناہ قلبی لگاؤ سے متاثر ہوکر، شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہویؒ نے نظام دکن کی شان میں ایک طویل قصیدہ لکھا، جسے موقعہ کی مناسبت سے یہاں لکھا جارہا ہے:

عثمان عثمان قد ضاء ت به الدکن
کلا و ربی اضاء الارض والرحمن
زال المخاوف والاهوال من دکن
وعمها الروح والريحان والامن
عثمان ماوىً لقوم ما لهم سکن
وملجأ لغريب ما له وطن
غوث الارامل اذ باتت تسهرها
الصروف من دهرها والذل والفتن
من فی العوالم ما ربته دولته
و من علی الارض ما فی عنقه مِنَنَ
فهذه الدولة الغراء ماطرة
علی البرية جوداً ما له ثمن
حلو لمختبط شوسٌ لمضطغنٍ
و ليس يرضىٰ بما يلقىٰ به دون
شعائر الدين فی ايامه عظمت
و من طغی و بغیٰ فی عهده وهنوا

اذا استعانک یا عثمان! مختبط
لبّاہ جودک لا من و لا محن
ضعفی القلوب اذا قویتھم شجعوا
فرسان خیل اذا ما رعتھم جبنوا
ان الملاذ لقوم قد اتوک علی
انضاءِ فقر وجدب للھی اذنوا
احییت کل ملوک الارض قاطبۃً
جوداً و عدلاً فما ماتوا و لا دفنوا
فلا تخفف مکر حسادٍ اذا مکروا
فلیس یاکل الا اھلہ الضغن
اعلمت دین رسول فاق من سبقوا
و قد تزری علی من بالعلیٰ قِمنُ
یبیت عثمان مولاھم اذا رقدوا
یرعٰی رعایاہ لا نوم ولا وسن
یدعو الوریٰ لملیک عادل یقظ
قوم اذا اغتربوا فی ظلہ تطنوا
اظللت اللہ فی اظلال رأفتہ
کما ترکتھم فی دھرھم آمنوا
دخلد اللہ ملکاً انت ما لکہ
یا من عزائمہ فی الدھر لاتھن
و من یعادیک یا عثمان! من سفہ
فی الھم والغم والاحزان مرتھن

اعزک الله من بین الملوک کما
اعززت ما نطق القران والسنن[۱]

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کو دکن آنے کی دعوت

حاکم دکن امیر عثمان علی خان بہادر نے ۱۳۴۰ھ بڑی عزت واحترام سے آپ کو دکن آنے کی دعوت دی، حضرت حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ رقم طراز ہیں:

۱۳۴۰ھ میں نظام دکن نے آپ کو وجاہت شہرت اور مقبولیت کی بنیاد پر عدالت عالیہ کا قاضی مقرر فرمایا[۲]۔

نظام دکن نے آپ کے ساتھ بڑی عزت واحترام کا معاملہ فرمایا، ایک ہزار روپیہ آپ کی تنخواہ مقرر کی، ڈھائی سو روپیہ پہلے ہی سے آپ کا سرکاری وظیفہ جاری تھا، اور ساڑھے سات سو روپے تنخواہ مقرر کی، نظام دکن کا اصول یہ تھا کہ وظیفہ خوار شخص کو جب وہ سرکاری عہدے پر مقرر فرماتے تو وظیفہ بند کر دیتے مگر فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کو انھوں نے اس اصول سے مستثنیٰ رکھا، آپ کی رہائش کے لیے ایک عمدہ مکان اور سواری کے لیے دو گھوڑے عطا فرمائے، تمام درباروں اور نذر وغیرہ کی پیشکش سے آپ کو الگ رکھا، عدالت عالیہ کے اجلاس میں شرکت کو بھی ضروری قرار نہیں دیا؛ بلکہ قیام گاہ پر ہی اجلاس کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی[۳]۔

جس وقت مولانا محمد احمد صاحبؒ دکن تشریف لے گئے اسی وقت آپ کے بہت سے مریدین حیدر آباد میں موجود تھے، انہوں نے آپ کے قیام دکن کو اپنے لیے سرمایۂ سعادت اور علمی وروحانی استفادہ کے لیے ایک سنہرا موقع باور کیا، سرکاری

---

[۱] سوانح حیات حضرت شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علی امروہویؒ، ص ۶۳-۶۴۔
[۲] پچاس مثالی شخصیات، ص ۱۱۱۔
[۳] دیکھئے دار العلوم دیوبند کی پچاس مثالی شخصیات، ص ۱۱۰۔

رہائش گاہ میں آپ کا مستقل قیام آپ کے مریدین کو گراں گذرا؛ کیوں کہ سرکاری مکان میں آنے جانے اور استفادہ کی وہ آزادی حاصل نہیں تھی، جو آپ کے مریدین چاہتے تھے، اس لیے آپ کے ایک ہونہار مرید، جسے آپ اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے اس نے اپنی عظیم الشان حویلی حضرت مہتمم صاحبؒ کے لیے خالی کر دی[۱]۔

تاریخ دارالعلوم میں آپ کے دکن تشریف لے جانے کے واقعہ کو تھوری وضاحت سے بیان کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو:

> ۱۳۴۰ھ کے اوائل میں نظام دکن کے چیف سکریٹری کا تار موصول ہوا کہ ''اعلیٰ حضرت نے فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم کو حیدر آباد کی عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) کے عہدۂ افتاء پر تین سال کے لیے بمشاہرہ ایک ہزار روپیہ تجویز فرمایا ہے''۔
>
> حضرت مہتمم صاحب کو دارالعلوم سے جس درجے کا تعلق اور اس کے کاموں میں جس قدر انہماک تھا، اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسری جانب متوجہ ہونے کا کوئی موقع ہی نہ تھا، مگر دارالعلوم اور حیدر آباد کے مابین جو دیرینہ تعلق قائم تھا، اس کو نظر انداز کرنا بھی آسان نہ تھا، بالآخر جماعتی فیصلہ یہی قرار پایا کہ امتثالِ امر سے انکار نہ کیا جائے، ۹ر ربیع الآخر کو فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو ہمراہ لے کر روانہ ہوگئے، ۱۴ر ربیع الآخر کو نظام دکن سے ملاقات ہوئی، حضرت مہتمم صاحبؒ نے دارالعلوم کی خدمت اور اپنے شغف وانہماک کا ذکر فرمایا تو ارشاد ہوا کہ ''میں جانتا ہوں کہ وہ کام جس کو آپ سرانجام دیتے ہیں بہت بڑا ہے، اور اگر آپ اس بناء پر یہاں آنے سے انکار کردیتے تو مجھے کچھ ملال نہ ہوتا؛ لیکن میرا خیال یہ تھا کہ

---

[۱] پچاس مثالی شخصیات، ص ۱۱۲۔

میرے منشاء کا اتباع کرکے آپ ضرور آئیں گے، آپ یہاں رہ کر بھی دارالعلوم کی خدمات انجام دے سکتے ہیں“۔

اس تقرری میں عہدۂ افتاء کے علاوہ نظام کے سامنے مدرسہ نظامیہ کی تعلیمی و انتظامی اصلاح کی بھی ضرورت پیش نظر تھی، چنانچہ اس کی صدارت بھی تفویض کی گئی، اور فرمانِ خاص صادر ہوا کہ مدرسہ نظامیہ کے سابقہ حالات کو دیکھ کر اصلاح و ترقی کے لیے تجاویز پیش کی جائیں، چنانچہ مولانا محمد احمد صاحبؒ نے اس سلسلے میں جو تجاویز پیش کیں، ان کو فوراً نظام کی منظوری حاصل ہوگئی[1]۔

قیام دکن کے زمانے میں، آپ کی ذات دکن کے فضلائے دارالعلوم دیوبند کے لیے مرکز بن گئی، ہر وقت فضلائے دارالعلوم کا اجتماع رہتا آپ کی مہمانداری وہاں بھی اسی شان کے ساتھ قائم رہی، جس آب و تاب کے ساتھ دیوبند میں ہوا کرتی تھی، حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ رقم طراز ہیں:

”حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ مرحوم صدر دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، مولانا محمد علی صاحب مرحوم پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی، مولانا عبد المجید صاحب ناظم صبغۃ الاسلام دکن اور دوسرے ملکی و غیر ملکی فضلاء کا جمگھٹا لگا رہتا اور یہ سب احباب وہاں اسی طرح جمع رہتے تھے، جیسے ایک شفیق باپ کے زیر سایہ اس کے محبوب فرزند جمع ہوں[2]۔

حضرت شیخ الادبؒ کی رفاقت

حضرت مولانا محمد احمد صاحب کو نظام دکن نے جس وقت عدالت عالیہ کا صدر مفتی مقرر فرمایا اس وقت شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہویؒ دارالعلوم

---

[1] تاریخ دارالعلوم، ج ۱ ص ۲۵۸۔
[2] پچاس مثالی شخصیات، ص ۱۱۳۔

دیوبند میں استاذ تھے، اور آپ کا شمار دارالعلوم کے ممتاز اساتذہ میں ہوتا تھا، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ اس وقت ضعیف ہو چکے تھے، اس لیے آپ نے حضرت شیخ الادبؒ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہا، حضرت شیخ الأدبؒ نے حضرت مہتمم صاحب کی خواہش کے احترام میں ہامی بھردی اور نو سال تک دارالعلوم کی تدریس سے الگ رہے، حضرت شیخ الادبؒ نے مولانا محمد احمد صاحبؒ کی بڑی علمی معاونت کی، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ بھی حضرت شیخ الادبؒ کا بہت زیادہ خیال رکھا کرتے تھے، حضرت مہتمم صاحبؒ نے نظامِ دکن سے سفارش کی کہ مولانا محمد اعزاز علی امروہویؒ کو نیابت مفتی کا عہدہ سپرد کردیا جائے، چناں چہ نظامِ دکن (امیر عثمان علی خان بہادر) نے آپ سے متعلق یہ ذمہ داری کردی اور پچاس روپیہ ماہوار تاحین حیات مقرر فرما دیا، یہ تنخواہ آپ کو برابر ملتی رہی۔

حضرت مولانا انظر شاہ صاحب کشمیریؒ نے ''تذکرۃ الاعزاز'' میں اس واقعہ کا تذکرہ مندرجۂ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

> ''حضرت مولانا دارالعلوم میں تدریس میں مشغول تھے'' سخت محنت، شب و روز کی جد و جہد، نیز بعض اکابر اساتذہ کی توجہ سے مولانا کا شمار، دارالعلوم کے ممتاز اساتذہ میں ہونے لگا تھا، اور ان کی علمی استعداد پر اعتماد کرتے ہوئے مجلس علمیہ (مجلس تعلیمی) نے درمیانی درجہ کی کتابیں، تدریس کے لیے ان کے یہاں بھیج دی تھیں کہ اسی دوران میں ریاست حیدرآباد کی جانب سے دارالعلوم کے صدر اہتمام محمد احمد صاحبؒ کو ریاست کا مفتیٔ اعظم بنا کر بلایا گیا؟ کیوں کہ مہتمم صاحبؒ اپنی ضعیف العمری کی وجہ سے امور متعلقہ کے انجام دینے سے معذور تھے، اس لیے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کے مشورہ سے دیوبند سے حیدرآباد روانگی کے وقت میں مہتمم صاحب نے مولانا اعزاز علی صاحب کو اپنے

ہمراہ لے جانا چاہا، اور حضرت مولانا مولانا محمد احمد صاحبؒ اور مولانا عثمانیؒ کے اصرار پر حیدر آباد جانے پر مجبور ہوئے، اور تقریباً نو سال دارالعلوم میں تدریس کے بعد ۱۳۳۹ھ میں حضرت مولانا کو دارالعلوم چھوڑنا پڑا۔

ریاست حیدر آباد کے مفتی اگرچہ مولانا محمد احمد صاحب مرحوم ہی تھے، لیکن ریاست کے تمام امور متعلقہ دارالافتاء حضرت مولانا ہی انجام دیتے تھے، مولانا محمد احمد صاحبؒ نے ایک مرتبہ ریاست کے اعلیٰ حکام اور ذمہ دار آفیسران کے ذریعہ سے مولانا کا مشاہرہ ریاست کی طرف سے جاری کرانا چاہا تھا لیکن اس کوشش میں کامیابی نہ ہوئی۔

اس تمام عرصے میں حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ اپنی جیب سے حضرت مولانا کو ایک معمولی رقم مشاہرہ کے طور پر دیتے رہے، اور اس کے بعد ایک موقعہ پر کوشش کر کے ریاست کی جانب سے مولانا کا پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ کرا دیا تھا۔

حضرت مولانا کو حیدر آباد میں یہ خدمت انجام دیتے ہوئے ابھی ایک سال کا عرصہ ہوا تھا کہ ۱۳۴۰ھ میں مولانا محمد احمد صاحبؒ کو جب کہ وہ حیدر آباد سے دیوبند کا سفر کر رہے تھے، جان جان آفریں کے سپرد کر دینا پڑی، مہتمم صاحب کے اس اچانک سانحۂ ارتحال پر بظاہر حضرت مولانا کے حیدر آباد میں قیام کا کوئی باعث نہ تھا[1]۔

دکن میں آپ کی خدمات

میر عثمان علی خان بہادر آصف جاہ سابع نے دراصل آپ کو دکن کی دینی اور علمی ترقیات کی خاطر ہی دکن آنے کی زحمت دی تھی، ریاست دکن میں علمی اور دینی

[1] تذکرۃ الاعزاز، ص ۵۵-۵۶، ط: دیوبند

اعتبار سے دو ادارے بڑے حساس تھے، ایک صدارت العدالۃ العالیہ، یعنی مفتیِ اعظم کا عہدۂ بلند اور دوسرا جامعہ نظامیہ، میر عثمان علی خاں بہادر نے یہ دونوں ذمہ داریاں بیک وقت آپ کو سونپ دیں۔

چناں چہ آپ ایک طرف مفتیِ اعظم کی حیثیت سے لوگوں کے سوالات کے شرعی جوابات دیتے تھے، تو دوسری طرف جامعہ نظامیہ کی تعلیمی اور انتظامی نگرانی فرماتے تھے، جامعہ نظامیہ کو آپ نے حیات تازہ بخشی، جامعہ کے اصول وضوابط مقرر فرمائے، اور ان میں ایسی دفعات رکھیں، جو جامعہ کی فکری سلامتی اور عملی اسپرٹ کی ضامن تھیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دکن میں حضرت فخر الاسلامؒ کی دونوں عملی جہتوں پر تفصیل سے کلام کیا جائے:

۱- صدارت العدالۃ العالیۃ

صدارت العدالۃ العالیۃ، ریاست دکن میں مفتی اعظم کا عہدہ تھا، یہ شعبہ انتہائی حساس اور سرگرم سمجھا جاتا تھا، دکن کے علماء وفضلاء کی محنت سے عوام کا مجموعی مزاج و مذاق دینی تھا، اور وہ اپنے ہر معاملے میں شرعی رہنمائی چاہتے تھے، تاریخ دار العلوم میں اس شعبہ کا مختصر سا تعارف درج ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے:

> ''ریاست حیدر آباد کے سابقہ نظام میں اسلامی طرز پر دار القضاء کا محکمہ قائم تھا جس میں ممالک محروسہ کے شرعی معاملات پیش ہو کر طے ہوتے تھے، افتاء کا منصب بھی سرکاری طور پر قائم تھا، عدالت عالیہ میں صدر مفتی کا عہدہ تھا، جس کا کام قتل وقصاص کے مقدمات میں شریعت کے مطابق فتوی دینا تھا، عدالت عالیہ کے فیصلے اور سزائے موت کا انحصار مفتی کے فتوی پر ہوتا تھا۔ اگر چہ یہ عہدہ عدالت عالیہ کے چیف جج کے مماثل تھا مگر

اس لحاظ سے کہ یہ ایک خالص مذہبی وشرعی منصب ہے زیادہ ممتاز اور باعظمت سمجھا جاتا تھا[۱]۔

میر عثمان علی خان نے فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کو اس شعبہ کا ذمہ دار بنا کر، اس میں نئی زندگی عطا کی، آپ مفتیٔ اعظم کی حیثیت سے تین سال دکن میں رہے اور سینکڑوں فیصلے آپ کے قلم سے نکلے، (بڑی جدو جہد کے بعد یہ فیصلے حیدرآباد سے حاصل ہوئے ہیں، جو ان شاء اللہ اگلے کسی باب کی زینت ہوں گے)

ان فیصلوں کو دیکھ کر آپ کی وسعت علمی معاملہ فہمی، اور آپ کی ذکاوت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، چند مثالیں درج ہیں:

بے وضو اذان دینے کا مسئلہ

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ "بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ اذان بے وضو جائز ہے اور اقامت جائز نہیں" اس بناء پر اگر کوئی مؤذن ہمیشہ بلا وضو اذان کہنے کی عادت بنالے، خصوصاً صبح کی اذان، سوتے سوتے بچھونے سے اٹھ کے سیدھا اذان کے منبر پر چلا جائے اور آنکھیں مل کر اذان دے دیا کرے اور یہ کہدے کہ اذان بے وضو بھی جائز ہے، اگر وضو کی تکلیف گوارا نہ کریں تو کیا مضائقہ؟ آیا اس فعل پر مداومت کرنا مؤذن کو بلا کسی عذر کے صحیح ہے، یا یہ فعل قابل اصلاح ہے؟ مفصل جواب بحوالہ کتب مطلوب ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب: حامداً ومصلیاً: اذان کی دو حیثیتیں ہیں، ایک یہ کہ اذان ذکر ہے، دوسری یہ کہ اذان دعوت نماز ہے، لہٰذا مؤذن کی بھی دو حیثیتیں ہوں گی، ایک یہ کہ وہ ذکر کر رہا ہے دوسری یہ کہ وہ نماز کی دعوت دیتا اور لوگوں کو نماز کے لیے بلاتا ہے۔

اس اعتبار سے کہ مؤذن ذکر کر رہا ہے کلمات اذان بے وضو بھی اپنی زبان

۱۔ تاریخ دار العلوم، ج:۱، ص:۲۵۹۔

سے ادا کرسکتا ہے؛ کیوں کہ ذکر، تسبیح تہلیل اور تلاوت شرعاً بے وضو جائز ہے؛ لیکن اس اعتبار سے کہ وہ لوگوں کو نماز کی دعوت دے رہا ہے اس کا بے وضو ہونا مکروہ ہوگا،؛ کیوں کہ وہ اب تک شرکت (ادائے نماز) کے قابل نہیں ہے۔

کتب فقہ میں جہاں یہ لکھا ہے کہ ''اذان بے وضو جائز ہے'' اذان کے صرف ذکر ہونے کا لحاظ فرمایا گیا ہے، لیکن ساتھ ہی اس کے دعوت نماز ہونے کے اعتبار سے یہ صراحت بھی فرمائی گئی ہے کہ مؤذن کو باوضو ہوکر ہی اذان کہنی چاہیے، اس لیے کہ مؤذن کا باوضو رہنا مستحب ہے۔

بنا براں اگر کسی مؤذن نے بے وضو اذان کہنے کی عادت بنالی ہے تو اس کی عادت قابل اصلاح ہے، اگر چہ اس کی اذان کا شرعاً اعادہ واجب نہیں، مراقی الفلاح میں ہے:

> **ویستحب ان یکون علی وضوء لقوله صلی الله علیه وسلم: لایؤذن الا متوضئ.** اور ہدایہ میں ہے: **و ینبغی ان یؤذن و یقیم علی طهر، فان اذن علی غیر وضوء جاز لانه ذکر و لیس بصلاة، فکان الوضوء فیه استحبابا کما فی القراء ة، و یکره ان یقیم علی غیر وضوء.** نیز ہدایہ میں ہے: **ویروی أن یکره الأذان أیضاً، لأنه یصیر داعیاً الی ما لا یجیب بنفسه.** اور عنایہ میں ہے: **لانه یدعو الناس الی التأهب للصلاة فاذا لم یتأهب لها یکون داعیا الی ما لا یجیب بنفسه. والله اعلم بالصواب.**

رکعات تراویح کی تعداد کا مسئلہ

تراویح کی رکعات سے متعلق مندرجہ ذیل استفتاء کا جو جواب دیا ہے وہ

بیک وقت روایات اور عبارات اکابر پر گہری نظر نیز فتوی میں انشراح صدر کی واضح دلیل ہے، ملاحظہ ہو:

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ قیام رمضان یعنی نماز تراویح کی رکعتیں از روئے حدیث وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین بلا لحاظ مذہب اہل تقلید بیس رکعات باجماعت ادا کرنا اقوی ہے یا آٹھ رکعت؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً ومصلیاً: تراویح سنت مؤکدہ ہے اس کی بیس رکعات (دس دوگانہ) ہیں جس پر خلفائے راشدین (سیدنا عمر وعثمان وعلی) رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاہم عنا نے مواظبت فرمائی اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس سے اتفاق فرمایا اور عہد خلافت راشدہ سے اب تک امت مرحومہ کا اس پر بلاخلاف عمل درآمد ہے۔ درمختار میں ہے:

التراويح سنة مؤكدة لمواظبة الخلفاء الراشدين و هي عشرون ركعة بعشر تسليمات. اور رد المحتار میں ہے: (قوله سنة مؤكدة) صححه فى الهداية وغيرها و هو المروى عن ابى حنيفة رضى الله عنه و ذكر فى الاختيار ان ابايوسف سأل ابا حنيفة رضى الله عنه و ما فعله عمر رضى الله تعالىٰ عنه فقال: التراويح سنة مؤكدة و لم يتخرجه عمر مت تلقاء نفسه و لم يكن فيه مبتدعا و لم يأمر به الا عن اصل لديه و عهد من رسول الله صلى الله عليه وسلم و فى شرح منية المصلى و حكى غير واحد الاجماع على سنيتها. (قوله لمواظبة الخلفاء الراشدين) اى اكثرهم لان

المواظبة عليها وقعت فی اثناء خلافة عمر رضی الله عنه و وافقه علی ذلک عامة الصحابة و من بعدهم الیٰ یومنا هذا بلا نکریر و کیف لا وقد ثبت عنه صلی الله علیه وسلم علیکم بسنتی سنة الخلفاء الراشدین المهدیین عضوا علیها بالنواجذ. رواه ابو داؤد.

حدیث شریف میں وارد ہے کہ تم میری سنت اور خلفائے راشدین مہدیین کی سنت کے پابند رہو اور اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑو“۔

(قوله و هی عشرون رکعة) هو قول الجمهور و علیه عمل الناس شرقاً و غرباً. اور بحر الرائق کی جلد دوم صفحہ ۷۱ر میں ہے: و قوله عشرون رکعة بیان لکمیتها او هو قول الجمهور لما فی الموطا عن یزید بن رومان قال: کان الناس یقومون زمن عمر بن الخطاب رضی الله تعالیٰ عنه بثلاث و عشرین رکعة و علیه عمل الناس شرقاً و غرباً لکن ذکر المحقق فی فتح القدیر ما حاصله ان الدلیل یقتضی ان تکون السنة من العشرین ما فعله صلی الله علیه وسلم منها ثم ترکه خشیة ان تکتب علینا و الباقی مستحب و قد ثبت ان ذلک کان احدی عشرة رکعة بالوتر ثبت فی الصحیحین من حدیث عائشة رضی الله عنها و اذن یکون المسنون علی اصول مشائخنا ثمانیة منها و المستحب اثنا عشر انتهیٰ. اور منحۃ الخالق میں ہے: (قوله کما ثبت فی الصحیحین الخ) ای الحدیث السابق عند قول المتن و الافضل فیهما الرباع و

فیه ما کان یزید فی رمضان و لا غیره علیٰ احدی عشرة رکعة قال فی الفتح و اما ما روی ابن ابی شیبة فی مصنفه و الطبرانی و عند البیهقی من حدیث ابن عباس عنه صلی الله علیه وسلم کان یصلی فی رمضان عشرین رکعة سوی الوتر فضعیف بابی شیبة ابراهیم بن عثمان جد الامام ابی بکر بن ابی شیبة متفق علی ضعفه مع مخالفته للصحیح اهـ. قلت: فقد یجاب عنها بان ما فی الصحیح مبنی علی ما هو الغالب من احواله صلی الله تعالی علیه وسلم و هذا کان لیلتین فقط ثم ترکه علیه الصلوة و السلام فلذا لم تذکره عائشة رضی الله عنها و اما تضعیف الحدیث بمن ذکر فقد یقال انه اعتضد بما مر من نقل الاجماع علی سنیتها من غیر تفصیل مع قول الامام رحمه الله ان ما فعله عمر رضی الله عنه لم یتخرجه من تلقاء نفسه و لم یکن فیه مبتدعا و لم یأمر به الا عن اصل لدیه و عهد من رسول الله صلی الله علیه وسلم فتأمل منصفاً.

علامہ محقق ابن ہمامؒ نے ام المومنین سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے جو صحیحین میں مروی ہے یہ استدلال جو فرمایا ہے کہ تراویح کی بیس رکعتوں کے منجملہ آٹھ سنت اور باقی مستحب ہونا پایا جاتا ہے اور اس کے مقابل حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث جس کی ابن ابی شیبہ اور طبرانی اور بیہقی نے روایت کی ہے جس میں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیس رکعات ادا فرمانے کی تصریح ہے اس کو

ایک راوی کے ضعف کی بنا پر جو ضعیف بتلایا ہے اس کا جواب علامہؒ ابن عابدینؒ نے یہ دیا ہے کہ ان دونوں احادیث شریفہ میں تعارض نہیں ہے ام المومنینؓ کی حدیث میں ان آٹھ رکعات (تہجد) کا بیان ہے جو رمضان اور غیر رمضان تمام مہینوں میں ادا فرمائی جاتی تھیں، نیز یہ کہ تراویح کی دو دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں، اور ام المومنین کی حدیث میں چار چار رکعتیں بیک سلام ادا فرمانے کی تصریح ہے، اس سے بھی یہی پایا جاتا ہے کہ ام المومنین کی حدیث نماز تہجد سے متعلق ہے، اس کے علاوہ ام المومنین جو اس حدیث شریف کی روایت فرماتی ہیں ان کا اقامت تراویح کے عہد سے خلافت راشدہ کا عہد ختم ہونے تک موجود رہنا اور اس پر انکار نہ فرمانا بھی اس امر کی دلیل ہے کہ روایت مذکورہ کا تعلق تراویح سے نہیں ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث میں تراویح کی بیس رکعتوں کا بیان ہے جس کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دو رات ادا فرمایا، پھر اس کے فرض ہو جانے کے اندیشہ سے ترک فرما دیا جو اثبات سنیت کے لیے کافی ہے، رہا راوی کا ضعف وہ بیس رکعات پر خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مواظبت اور حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ کی اس تصریح کے بعد باقی نہیں رہتا کہ ایسا عمل کرنا اور دوسروں کو حکم دینا بطور خود نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ کسی اصل پر مبنی نہ ہو اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایماء نہ پایا ہو، عمل مذکور کسی اصل پر مبنی ہونا امام بیہقی اور اصبہانی کی روایت سے بھی پایا جاتا ہے جو ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے آپ فرماتی ہیں: کان

رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا دخل شهر رمضان تغیر لونه و کثرت صلاته و ابتهل فی الدعاء و اشفق منه.اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایماء اس حدیث شریف میں موجود ہے جس کو ابن ابی شیبہ، نسائی، ابن ماجہ، اور بیہقی نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، آپ فرماتے ہیں: ذکر رسول الله صلی الله علیه وسلم رمضان فقال شهر فرض الله علیکم ضیامه و سننت انا قیامه فمن صامه و قامه ایمانا و احتسابا خرج من ذنوبه کیوم و لدته امه.

بہر حال رکعات تراویح کی تعداد بیس ہونا ہی قوی تر اور سنت مؤکدہ ہے اور یہی قول جمہور کا ہے اور یہی اہل تقلید کا مذہب ہے، البتہ تراویح کو مسجد میں باجماعت ادا کرنا سنت کفایہ اور اہل السنّت والجماعت کا شعار ہے اس کو ترک نہ کرنا چاہیے، اگر محلّہ کی مسجد میں چند اشخاص بھی اس کو باجماعت ادا کریں تو بقیہ اہل محلّہ کے لیے جماعت کی پابندی باقی نہیں رہتی، لیکن تراویح کی بیش رکعتیں ان کو بھی ادا کرنی چاہیں اور اگر اہل محلّہ سے مسجد میں کوئی بھی تراویح باجماعت ادا نہ کرے تو تمام اہل محلّہ گنہگار ہوں گے۔ ہدایہ میں ہے: (و السنة فیها الجماعة) لکن علی وجه الکفایه. اور مبسوط کی جلد دوم صفحہ ۱۴۵/ میں شمس الائمہ سرخسیؒ فرماتے ہیں: و ذکر الطحاوی رحمه الله تعالی فی اختلاف العلماء و قال لا ینبغی ان یختار الانفراد علی وجه یقطع القیام فی المسجد فالجماعة من سنن الصالحین و الخلفاء الراشدین رضوان الله علیهم اجمعین حتی قالوا رضی الله

تعالیٰ عنهم نور الله قبر عمر رضی الله تعالیٰ عنه کما نور مساجدنا، و المبتدعة انکروا ادائها بالجماعة فی المسجدنا فأدائها بالجماعة فأدائها جعل شعار اللسنة کاداء الفرائض بالجماعة شرع شعار الاسلام. والله اعلم بالصواب.

آپ مفتی اعظم کی حیثیت سے برسوں کے الجھے ہوئے مقدمات کو حسن تدبیر اور سلیقہ مندی سے حل کیا، وقف کے ایک پیچیدہ سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

وقف کی تولیت کا مسئلہ

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ علاقۂ فوج میں ایک مسجد واقع ہے یہ فوج غیر مسلم حکومت کی ہے اور جس زمین پر یہ مسجد بنائی گئی ہے بادشاہ اسلام کی ہے اور اس مسجد کو مسلمان اور ملازمین میں فوج نے چندہ کر کے بنایا، تاریخ بنائے مسجد ۱۳۱۵ء سے مسجد کا انتظام مثل تولیت و امامت و خطابت زید (قلندر خاں صاحب) کے ذمہ رہا، اور اس کی شکست و ریخت وغیرہ کی نگرانی بھی زید نے اپنی زندگی تک افسران فوج اور مصلیان مسجدان سے رضامند تھے۔

۱۳۴۶ھ میں زید کا انتقال ہو جانے سے اعلیٰ افسر فوج کے تحریری حکم کی بناء پر زید مرحوم کا فرزند مسمی محمد عثمان خاں صالح جانشین ہوا ہے، جس نے اپنے والد مرحوم کی یادگار میں بصرفہ تخمیناً (۵۲۵) روپیہ مسجد میں برقی روشنی لگائی ہے، علاوہ اس کے امام و موذن کو مقرر کیا ہے، مگر مسجد کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے، فوج یہاں سے چلی جانے کے بعد مسجد کو چندے کی احتیاج رہے گی۔

ایسی صورت میں از روئے احکام شرع شریف محمد عثمان خاں اور اس کی اولاد اپنے باپ کی خدمات مثل تولیت و امامت و خطابت کی مستحق ہوگی یا نہیں؟ جانشین مذکوران خدمات کی ہر طرح اہلیت و صلاحیت رکھتا ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً: جائداد موقوفہ کی تولیت یعنی اس کا متولی مقرر کرنے کا اختیار اولاً واقف کو حاصل ہے اس کے بعد اس کے وصی کو اگر یہ دونوں نہ ہوں تو قاضی (مسلمان حاکم اوقاف) کو حاصل ہوگا۔ درمختار کی کتاب الوقف میں ہے:

و لا یة نصب القیم الی الواقف ثم لوصیه ثم للقاضی.

صورت مسئول عنہا میں جب کہ زید (قلندر خاں مرحوم) بانی مسجد نہ تھے بل کہ مسجد مسلمانوں اور ملازمین فوج کی بنا کردہ ہے، تو اس کا متولی مقرر کرنے کا اختیار بھی انہیں کو حاصل ہے، اسی بنا پر افسران فوج اور مصلیان مسجد نے زید (قلندر خاں مرحوم) کو اور ان کے بعد ان کے فرزند محمد عثمان خاں کو بر بنائے اہلیت و صلاحیت مسجد کا متولی مقرر کیا ہے اسی طرح آئندہ بھی مسلمانان فوج اور مصلیان مسجد ہی کو تقرر متولی کا اختیار رہے گا محمد عثمان خاں اور اس کی اولاد کو محض اس بنا پر کہ وہ زید (قلندر خاں مرحوم) کی اولاد ہیں حق تولیت نہیں پہنچ سکتا؛ بل کہ مسلمانوں اور ملازمین فوج کے مقرر کرنے کی بنا پر وہ ادائے خدمات تولیت و امامت و خطابت کے مجاز متصور ہوں گے، اگر آئندہ یہاں سے فوج چلی جائے تو مصلیان مسجد کو تقرر متولی کا اختیار رہے گا۔ خواہ وہ محمد عثمان خاں اور اس کی اولاد کا تقرر کریں یا کسی اور شخص کا۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

بیع بالوفاء کا مسئلہ

بیع بالوفاء سے متعلق ایک سوال کا جواب ان کی فقاہت اور علمی بصیرت پر گواہ ہے:

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ موتی بیگم نے اپنا مکان سجاد مرزا بیگ کے ہاتھ مبلغ...... روپیہ پر بطور بیع بالوفا فروخت کیا اور یہ صراحت کی کہ سات سال کے عرصہ میں اگر وہ

چاہیں تو مکان مذکور کو بادائی رقم مذکور واپس لے سکیں گی، فروخت کے بعد مکان کا قبضہ بھی سجاد مرزا بیگ کو دیدیا۔

اب مدت مذکور گزر چکی مگر موتی بیگم نے مکان مذکورہ واپس نہیں لیا اور سجاد مرزا بیگ کا انتقال بھی ہو چکا اس مکان پر مرحوم کی اولاد قابض ہے ایسی حالت میں مکان مذکور سجاد مرزا بیگ اور ان کی الاد کی ملک تصور ہو گی یا موتی بیگم کی؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: شئی مرہونہ سے نفع حاصل کرنا چوں کہ شرعاً ناجائز ہے اور اس انتفاع کو ربا (سود) قرار دیا گیا ہے اور بغیر نفع لینے کے کوئی شخص رہن لینے پر رضامند نہیں ہوتا اس لیے ربا سے بچنے کے لیے بعد کے فقہاء نے یہ تجویز کی تھی کہ بیع بالوفا کے طور پر وہ شی جس کو رہن رکھنا مقصود ہے بجائے رہن رکھنے کے اس کو ایک مناسب مدت (مثلاً سال، دوسال، پانچ سال، دس سال) کے لیے خرید لیا جائے اور اس مدت تک مشتری اس شئی سے نفع اٹھائے مثلاً وہ شئی مکان ہو تو اس میں سکونت اختیار کرے یا اس کے کرایہ سے منتفع ہوتا رہے، اور بائع کو اندرون مدت خیار دیا جائے کہ وہ اس کو خرید لے اور اگر مدت ختم ہو جائے اور بائع کو اس کو خرید نہ سکے تو مشتری ہی اس کا مستقل مالک بن جائے اور بائع کا خیار ساقط کر دے، گویا ربا سے بچنے کا یہ ایک حیلہ ہے لیکن محققین فقہاء نے یہی لکھا ہے کہ بیع بالوفاء بھی دراصل رہن ہی ہے، لہذا بائع بمنزلہ، راہن اور مشتری کو اندرون مدت ادا کر دے تو شئی مبیع کو جو دراصل شئی مرہونہ ہے مدت ختم ہو جانے کے بعد بھی شرعاً واپس لے سکے گا، محض مدت ختم ہو جانے کی بناء پر بائع (راہن) کا حق اسی روز ساقط نہ ہوگا، البتہ مشتری یعنی مرتہن کو مدت مبینہ کے ختم ہو جانے کے بعد یہ اختیار رہے گا کہ اس کو فروخت کر کے اپنی رقم وصول کر لے۔ عالمگیریہ کی جلد سوم کتاب البیوع باب بستم صفحہ ۲۷۱ میں ہے:

البیع الذی تعارف اهل زماننا احتیا لا للربا و سموه بیع الوفاء هو فی الحقیقة رهن وهذا المبیع فی ید المشترق کالرهن فی ید المرتهن لا یملکه و لا یطلق له الانتفاع الا باذن مالکه و هو ضامن لما اکل من ثمره واستهلک من شجره و الدین ساقط بهلاکه فی یده اذا کان به وفاء بالدین و لا ضمان علیه فی الزیادة اذا هلکت من غیر صنعه و للبائع استرداده اذا قضی دینه و لا فرق عندنا بینه و بین الرهن فی حکم من الاحکام کذا فی الفصول العمادیة.

پس صورتِ مسئول عنہا میں مکان مذکور کی مالک موتی بیگم صاحبہ ہی ہوں گی البتہ؟؟ مرزا بیگ مرحوم کے ورثاء کی مدت مبینہ منقضی ہو جانے کی وجہ سے شرعاً یہ حق حاصل ہیکہ مکان کوفروخت کر کے اپنی رقم کی پابجائی کرے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب.

فتاوی نویسی میں وہ حالات حاضرہ پر مکمل نگاہ رکھتے تھے، اور درپیش مسائل کے حل کرنے میں دیگر مذاہب فقہیہ سے بھی (معتبر شرطوں کے ساتھ) استفادہ فرماتے تھے، مفقود الخبر کی بیوی کا مسئلہ، فقہ حنفی کے مطابق انتہائی دشوار ہے، آپ نے اس مسئلہ میں یہ فقہ مالکی سے استفادہ کرتے ہوئے جواب دیا، ملاحظہ ہو:

زوجۂ مفقود الخبر کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کا عقد مسمی محمد خاں سے بتاریخ ۲۷/رجب ۱۳۴۵ھ ہوا، مگر مسمی مذکور عنین ہونے کی وجہ سے آج تک مفقود الخبر ہے بہت کچھ تلاش کی گئی مگر کہیں اس کا پتہ نہ چل سکا، اسی تلاشی میں ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر گیا۔

محمد خاں کا ایک مکان ذاتی ہے اور کچھ جہیز کا سامان موجود ہے، اس کی ایک

ہمشیرہ ہندہ ہے جو کچھ سامان تھا فروخت کر چکی ہے اور اب وہ چاہتی ہے کہ مکان بھی فروخت کردے۔

نوجوان ہندہ کا اس طرح عالم کس مپرسی میں رہنا اب متعذر ہو گیا ہے اور اب ہندہ اپنا دوسرا عقد کرنا چاہتی ہے، لہٰذا دوسرا عقد کرنے کے لیے ہندہ کو ابھی کتنی مدت تک ٹھہرنا ہوگا اور اس عرصہ میں ہندہ کے نفقہ کا کیا انتظام کیا جائے گا؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: صورت مسئول عنہا میں اگر ہندہ کا شوہر مسمی محمد خاں مفقود الخبر ہے اور ہندہ اس طرح نہیں رہ سکتی تو وہ قاضی (مسلمان حاکم عدالت) کے پاس درخواست پیش کرے قاضی بہ تمسک مذہب حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ چار سال تک اس کی تلاش کا انتظام کرے گا اور اس کے نہ آنے اور پتہ نہ چلنے کی صورت میں مفقود کی وفات کا فیصلہ کرے گا، اور ہندہ کو عدت وفات (چار مہینے دس دن) ختم کرنے اور اس کے بعد نکاح ثانی کر لینے کی اجازت دے سکے گا۔ محمد خاں کی تاریخ مفقودی سے اس وقت تک ڈیڑھ سال کا عرصہ جو گزر چکا ہے وہ اس چار سال کی مدت میں محسوب نہ ہوگا۔ درمختار کی کتاب المفقود میں ہے:

(و لا یفرق بینه و بینها و لو بعد مضی اربع سنین) خلافا لمالک اور ردالمحتار میں ہے:(قوله خلافا لمالک) فان عنده تعتد زوجة المفقود عدة الوفاة بعد مضی اربع سنین.
اور اس کے بعد ہے: قال القهستانی لوافتی به فی موضع الضرورة لا بأس به علی ما اظن.

اس مدت تک ہندہ کے نفقہ کا انتظام بھی مفقود کے مال نقد یا سونے چاندی سے قاضی ہی کرے گا۔ درمختار کے باب النفقہ میں ہے:

(و تفرض النفقة) بانواعها الثلاثة (لزوجة الغائب) مدة

سفر، صيرفية و استحسنه فى البحر و لو مفقودا.

اسی طرح مفقود پر جن لوگوں کا نفقہ بغیر حکم قاضی کے بھی واجب تھا ان کے نفقہ کا انتظام بھی کرے گا مثلاً اس کے ماں باپ یا اولاد؛ لیکن ایسے قرابت دار جن کا نفقہ حکم قاضی کے بغیر واجب نہیں ہوتا مثلاً بھائی بہن وغیرہ، ان کا نفقہ مفقود کے مال سے ادا نہیں کیا جائے گا۔ عالمگیریہ کی جلد دوم کتاب المفقود صفحہ ۳۲۴ رمیں ہے:

ينفق من ماله على من تجب عليه نفقته حال حضرته بغير قضاء كزوجته و اولاده و ابويه و كل من لا يتحقها بحضرته الا بقضاء فانه لا ينفق عليه كالاخ و الاخت و نحوهما، و معنى قولنا ماله النقدان كذا فى خزانة المفتين، و التبر بمنزلة النقدين فى هذا الحكم.

پس صورت مسئول عنہا میں مفقود کی بیوہ بہن کا نفقہ مفقود کے مال سے متعلق نہ ہوگا۔

نیز قاضی مفقود کے مال و جائداد کی حفاظت کے لیے کسی کو مقرر کرے گا، جو خراب یا ضائع ہو جانے والی چیزوں کو فروخت کر سکے گا، اور جس میں ایسا اندیشہ نہ ہو اس کو محفوظ رکھے گا، اگر اس کے بھی فروخت کی ضرورت داعی ہو تو قاضی کی اجازت سے اس کو فروخت کیا جا سکے گا۔ عالمگیریہ کے اسی صفحہ میں ہے:

و ينصب القاضى من يحفظ ما له و يقبض غلاته و الديون التى اقربها غرماؤه. نیز یہ بھی لکھا ہے: ثم الوكيل الذى نصبه القاضى يخاصم فى دين وجب بعقده بلا خلاف و يبيع ما يخاف عليه الفساد من ما له كذا فى التبيين و لا يبيع ما لا يتسارع اليه الفساد فى نفقة و لا

فی غیرھا منقولا کان او عقاراً کذا فی غایۃ البیان.

صورت مسئول عنہا میں مفقود کی بیوہ بہن نے جو سامان بطور خود فروخت کردیا ہے وہ اس کی ذمہ دار ہوگی۔

ہندہ کا سامان جہیز ہندہ کی ملک ہے اس میں مفقود کی بہن کو شرعاً کسی قسم کی مداخلت کا حق نہیں ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

(۲) جامعہ نظامیہ کی نظامت

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سے متعلق جو دوسری اہم ذمہ داری کی گئی وہ جامعہ نظامیہ کی نظامت تھی، جامعہ نظامیہ ریاست دکن (حیدرآباد) میں اس وقت علمی سرگرمیوں اور پوری ریاست میں علم کی روشنی پھیلانے کی واحد درسگاہ تھی۔

جامعہ نظامیہ میں حضرت فخر الاسلامؒ کی ذمہ داریاں

نظامِ دکن نے آپ کو جامعہ نظامیہ کا ناظم مقرر کیا، حضرت فخر الاسلامؒ کا دور نظامت جامعہ نظامیہ کی تاریخ کا روشن اور زرین دور ہے، آپ کے زمانے میں اس جامعہ نے کافی ترقیاں کیں، بڑے نامور فضلاء اور علماء روزگار پیدا ہوئے، ریاست دکن میں جو اس وقت رسوم ورواج اور بدعات وخرافات سے پوری طرح آلودہ تھی، سنت کی روشنی پھیلانے اور فکر صحیح کی چنگاری کو عام کرنے میں جامعہ نظامیہ کا جو مرکزی کردار رہا ہے، اسے کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ جامعہ نظامیہ میں میر مجلس انتظامی تھے، اور میر مجلس انتظامی کے اختیارات جو خود حضرت ہی کے قلم سے تحریر کردہ ہیں، وہ کچھ اس طرح ہیں:

الف: کوئی جلسہ بغیر میر مجلس یا ان کے قائم مقام مجوزہ میر مجلس کے منعقد نہ ہوسکے گا۔

ب: اعلیٰ حضرت سرپرست مدرسہ کے ملاحظہ میں جملہ عرضداشت متعلق مدرسہ

بدستخط میر مجلس پیش ہوں گے۔

ج: جن طلبہ کو خوراک یا وظیفہ دیا جائے گا یا دارالاقامہ میں جگہ دی جائے گی ان کا داخلہ بمنظوری میر مجلس ہوگا۔

د: ملازمان مدرسہ کی برطرفی، معطلی، و بحالی بغیر تجویز مجلس انتظامی نہ ہو سکے گا، لیکن میر مجلس کو اختیار ہوگا کہ کسی ضرورت کے وقت معطلی کا حکم دے کر فوراً ارکان مجلس انتظامیہ سے رائے حاصل کر کے فیصلہ مجلس پر عمل درآمد کریں۔

ہ: میر مجلس کو اختیار ہوگا کہ اراکین مجلس انتظامیہ سے کسی رکن کو کسی کارِ خاص کے لیے وقت معین تک مامور کریں لیکن دائمی طور پر یا طویل مدت کے لیے زائد از ایک ماہ بغیر فیصلہ مجلس انتظامیہ نہ کر سکیں گے۔

و: علاوہ ان رقوم کے لیے جو موازنہ میں منظور ہو چکی ہیں کسی خاص ضرورت کے وقت پچاس روپیہ تک میر مجلس اپنے اختیار سے صرف کر سکتے ہیں لیکن متعاقب اس کی اطلاع مجلس انتظامیہ کو دے کر رائے حاصل کر لی جائے۔

ز: میر مجلس کو اختیار ہوگا کہ بمنظوری مجلس اپنے متعلقہ کاموں میں سے کسی کام کو معتمد کے تفویض کر دیں اس حالت میں معتمد کا کام میر مجلس کا کام ہوگا۔

ح: میر مجلس کو اعلیٰ حضرت کی خدمت میں اپنی ذاتی رائے بمصالح مدرسہ پیش کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

مذکورہ بالا دفعات سے سمجھا جا سکتا ہے کہ میر مجلس انتظامی کا عہدہ انتہائی کلیدی اور اہم ہوتا تھا، آپ نے اس ادارہ کی ترقی کے لیے جو سب سے اہم قدم اٹھایا وہ جامعہ کے اصول وضوابط کی ترتیب ہے، آپ نے عملی انضباط اور ہر ملازم کے دائرۂ کار کی تعیین کرتے ہوئے جامعہ کے اصول وضوابط مرتب فرمائے، ان اصول وضوابط میں جہاں عملی کارکردگی اور اختیارات کی تعیین کی گئی، وہیں فکری یکسانیت اور ذہنی ہم آہنگی پر بھی زور دیا گیا ہے، چناں چہ اصول وضوابط کی پہلی دفعہ میں لکھا گیا:

''مدرسۂ نظامیہ میں اہل سنت والجماعت کے طریقہ پر علوم عربیہ دینیہ کی اعلیٰ تعلیم دی جائے گی، اور اس کے خلاف کسی دوسرے طریقہ پر دینا اصول مدرسہ اور ارادۂ بانی کے خلاف ہوگا، لہٰذا کسی وقت اس میں تغیر و تبدل نہ ہو سکے گا[1]''۔

ریاست دکن کے اس وقت کے ماحول میں، جو پوری طرح شیعی اثرات کی زد میں تھا، اہل سنت والجماعت کے طریقۂ تعلیم کو اختیار کرنا اور اس پر زور دینا کسی جہاد سے کم نہیں تھا، یہ حضرت فخر الاسلامؒ ہی کا حصہ تھا کہ اس اہم ترین دفعہ کو اتنی قوت اور مضبوطی سے لکھ گئے، اور جاننے والوں پر یہ مخفی نہیں کہ اہل سنت والجماعت کے نام پر فکری انحراف اور افراط وتفریط کا وہ کون سا گوشہ ہے جسے اختیار نہیں کیا جا رہا ہے، اس لیے ضرورت تھی کہ اہل سنت والجماعت کے بھی کسی معتبر مشرب ومسلک کی نشاندھی کر دی جائے، چناں چہ دفعہ ا: میں ہی آپ آگے لکھتے ہیں:

''لیکن چونکہ ہندوستان کے باشندوں کا طریقہ بالعموم حنفی ہے اس لیے بانی مدرسہ نے اس طریقہ کی پابندی رکھنا لازمی قرار دی ہے، اس کے خلاف کبھی نہ ہو سکے گا لیکن اگر اس کے ساتھ مذاہب اربعہ مجتہدین میں سے علاوہ مذہب حنفی کے دوسرے طریقہ کے مقلد تعلیم پانا چاہیں تو تعلیم پا سکیں گے اور اگر ان کے لیے اس مذہب کے درس کی ضرورت بھی پیش آئے گی تو ایسے مدرسوں کا تقرر خلاف اصول مدرسہ نہ ہوگا[2]''۔

اسی فکری یکسانیت کے لیے دوسری دفعہ بھی اسی نوعیت کی طے فرمائی، آپ لکھتے ہیں:

''اس مدرسہ کے ارکان انتظامی مدرسین اور جملہ کار پرداز وہی اشخاص ہو سکیں گے جو سنی حنفی طریقہ کے پابند ہوں لیکن جیسا کہ مقلدین مذاہب

---

[1] ضابطہ جامعہ نظامیہ دفعہ ا، مرتبہ مولانا محمد احمد صاحب'' [2] ایضاً۔

اربعہ کے متعلق دفعہ (۱) میں استثناء کیا گیا ہے، اس دفعہ میں استثناء سمجھنا چاہیے، ارکان مجلس میں دو ثلث علماء کا ہونا لازمی ہے[۱]"۔

آپ نے مقاصد جامعہ کی بھی تعیین کی، اور ان مقاصد کی درجہ بندی بھی کی، جو آپ کی فکری گہرائی اور دور رسی کی واضح دلیل ہے، آپ مقاصد جامعہ نظامیہ کے تحت لکھتے ہیں:

"مدرسہ کا مقصد کلی وہی ہے جو دفعہ اول میں مذکور ہو چکا ہے لیکن درجہ تفصیل میں مدرسہ کے مقاصد حسب ذیل صورتوں میں منقسم ہوں گے۔

الف: بہ تعمیل ارشاد خداوند عالم "ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر و یأمرون بالمعروف و ینھون عن المنکر" علماء باعمل کی ایسی جماعت کا تیار کرنا جو علم دین کی اشاعت، احکام اسلام کی تبلیغ اور علوم دینیہ کے قابل ہوں اور عامہ مسلمین کے لیے ان کی تمام مذہبی ضروریات کی سر انجام دہی و رہبری کر سکیں۔

ب: عامہ مسلمین کے لیے بقدر ضرورت دینی تعلیم کا انتظام۔

ج: فرزندان اہل خدمات شرعیہ کی تعلیم کا خاص انتظام۔

د: تبلیغ واشاعت اسلام تقریر اور تحریر تالیف و تصنیف، و صیانت اسلام۔

تشریح دفعہ سوم: مقاصد مدرسہ میں مقصد الف اصل و بالذات ہے اور دوسرے مقاصد درجۂ ثانویہ میں ہیں اور تعلیم قرآن مجید و قرأۃ و تجوید اور بعض تمہیدی تعلیمات مثل قدر ضرورت، فارسی، ریاضی سب مقصد اول میں داخل ہوں گے۔

مقصد الف: باعتبار نوعیت کے کبھی نہیں بدل سکتا، البتہ نصاب تعلیم میں بقدر ضرورت تغیر و تبدل ہو سکتا ہے لیکن اسی حد تک کہ اصل مقصد میں نقص نہ آئے[۲]"۔

جامعہ نظامیہ کے اصول میں ہر ایک کارکن کے اختیارات بھی طے کیے گئے،

۱۔ ضابطہ جامعہ نظامیہ دفعہ ۲، مرتبہ مولانا محمد احمد صاحبؒ۔

۲۔ ایضاً

اوراس میں مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت مناسب دفعات لکھی گئیں:

ضابطۂ انتظامی جامعہ نظامیہ

فرائض مجلس انتظامی

اختیارات مجلس انتظامی

اجلاس مجلس انتظامی کا انعقاد

اختیارات میر مجلس انتظامی

معتمد مجلس انتظامی کے اختیارات

شعبہ جات انتظامی

فرائض ناظم تعلیمات (شیخ الجامعہ)

مہتمم جامعہ کے فرائض

دارالافتاء جامعہ نظامیہ

اہل خدمات شرعیہ

داخلۂ طلباء

وظائف تعلیمی

علماء اسناد دستار بندی

انعامات طلبہ

وظیفہ ملازمین جامعہ

خدمات وعہد ہائے ممالک محروسۂ سرکار عالی

ان عناوین پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ حضرت فخر الاسلام کو اللہ تعالیٰ نے انتظام وانصرام کی کس قدر صلاحیتیں عطا کی تھیں، وہ ان تمام شعبوں کی نگرانی فرماتے تھے، اوران پر مناسب آدمی کو مقرر فرماتے تھے۔

حضرت کے مرتب کردہ یہ اصول آج تک جامعہ نظامیہ میں موجود ہیں اور

ان ہی دفعات کے ساتھ نافذ العمل ہیں، حضرت فخر الاسلامؒ کے بعد جامعہ نظامیہ کو ایسا کامیاب منتظم اور مدبر میر مجلس انتظامی میسر نہ ہوسکا، جو اس کے فکری اور عملی سرحدوں کی پاسبانی کرتا اور اسے نظام دکن اور بانی جامعہ حضرت مولانا محمد انوار اللہ صاحب فاروقیؒ کی متعین کردہ ڈگر پر لے کر چلتا۔

اس لیے جامعہ نظامیہ اپنی فکری اور عملی شناخت کو باقی نہ رہ سکا، ہاں کسی انداز سے روشن روایات اور عظیم خدمات کا پشتارہ اٹھائے ہوئے ایک پگڈنڈی پر ضرور گامزن ہے، اور وہ علمی انفتاح اور وسعت ظرفی جو اس کی خصوصیات تھیں، نمک بن کر گروہی تعصب اور افراط و تفریط کی برف میں پگھل گئیں۔

قیام دکن کے زمانے میں حضرت فخر الاسلامؒ کا دار العلوم سے تعلق

قیام حیدر آباد کے زمانے میں بھی حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کا تعلق دار العلوم کے ساتھ بدستور قائم رہا، آپ وہاں رہ کر بھی دار العلوم کے تمام اہم کاموں کو بہت گہرائی سے دیکھا کرتے تھے، دار العلوم آپ کی حیات کا مرکزی محور بن چکا تھا، یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ آپ دار العلوم کے امور سے غافل ہو جاتے

عشق کا معجزہ اسے کہیے
دور ہو کر بھی میں نہیں ہوں دور

صدارت اہتمام کا ایک عہدہ قائم کر کے آپ کو بحیثیت صدر مہتمم دکن بھیجا گیا اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نائب مہتمم دار العلوم کو مہتمم بنایا گیا اس صورت سے تمام بنیادی اور اہم امور کے فیصلے آپ دکن ہی میں کرتے تھے، اور برابر اہم معاملات میں تحریر و مشورے کے ذریعے سے دار العلوم کی خدمات میں حصہ لیتے رہے۔

واقع یہ ہے کہ دکن کے قیام کی منظوری کے پیش نظر بھی دار العلوم ہی کی خدمت تھی، حضرت مہتمم صاحبؒ کو جو وقیع تنخواہ نظام دکن کی طرف سے ملا کرتی تھی وہ

پوری کی پوری آپ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے پاس بھیج دیا کرتے تھے، اس میں سے نوے روپیے وہ اماں بو (اہلیہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب) کو دے دیا کرتے اور باقی دارالعلوم پر صرف کیا کرتے تھے، ایک دفعہ آپ نے دارالعلوم کی ضرورت کو سامنے رکھ کر، ایک سال کی تنخواہ پیشگی لے لی، اور دارالعلوم کی ضروریات میں صرف کیں (بروایت حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی)

حضرت حکیم الاسلامؒ رقم طراز ہیں:

''مفتی عدالت عالیہ ہونے کے ساتھ آپ دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم بھی رہے، اور ضروری امور کی امسلہ رجسٹری کے ذریعہ حیدرآباد بھیجی جاتی تھیں، جن کے فیصلے آپ وہاں سے کرکے بھیجتے تھے، مجلس شوری نے آپ کی شخصیت ہی کی وجہ سے صدارت اہتمام کا عہدہ قائم کیا اور آپ کو صدر قرار دے کر مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب کو بنایا نیز دیوبند پہونچ کر یہاں جتنا قیام ہوتا، تو حیدرآباد عدالت عالیہ کی مسلیں رجسٹری سے یہاں پہونچتی تھیں، اور فیصلہ لکھ کر حضرت ممدوح حیدرآباد روانہ فرماتے، اکثر فیصلوں کی خوش قلم نقلیں مولانا اشتیاق احمد صاحب صدر الکاتبین شعبۂ کتابت انجام دیتے تھے، آپ دارالعلوم دیوبند اور عدالت عالیہ دکن کی ذمہ داریاں بیک وقت نبھاتے تھے، اور حکومت دکن اور ذمہ دارانِ دارالعلوم آپ کے خواہاں تھے۔

حضرت ممدوح نے اس چار سال میں اور پھر دیوبند سے واپسی کے بعد دارالعلوم سے تنخواہ نہیں لی، اور ایثار سے کام لیا[1]۔

[1] دارالعلوم کی پچاس مثالی شخصیات، ص ۱۱۲-۱۱۳۔

دسواں باب

حضرت فخر الاسلامؒ کی حیدر آباد سے واپسی، سانحۂ وفات اور مرثیے

حضرت مہتمم صاحب کی حیدر آباد سے واپسی

پہلے گذر چکا ہے کہ فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کو نظام دکن نے عدالت عالیہ کے عہدۂ صدر مفتی کے لیے تین سال کے واسطے طلب فرمایا تھا، مجلس شوریٰ نے آپ کی تین سال کی رخصت منظور کرتے ہوئے یہ طے کر دیا تھا کہ زمانۂ قیام حیدر آباد میں آپ کا تعلق دار العلوم سے بدستور باقی رہے گا، چنانچہ اس فیصلے کے مطابق دار العلوم کے تمام اہم امور آپ کی رائے اور مشورہ سے انجام پاتے رہے جیسا کہ سابقہ سطور میں گذر چکا ہے اس کے علاوہ آپ ہر سال دو تین ماہ کے لیے دیوبند تشریف لا کر دار العلوم کی خدمت اصالۃً بھی انجام دیتے تھے، تین سالہ مدت کے اختتام پر شاہی فرمان کے ذریعے اس مدت میں ایک سال کی مزید توسیع کی گئی، لیکن زمانۂ توسیع میں صحت خراب ہوگئی، جب علالت کا سلسلہ زیادہ بڑھا تو آپ قبل از وقت مستعفی ہو کر اوائل ربیع الآخر میں دیوبند تشریف لے آئے، حیدر آباد سے رخصت کی تقریب باغِ عامہ میں نظام دکن نے بنفس نفیس شرکت فرما کر حضرت ممدوح کی خدمات جلیلہ کی نہایت شاندار الفاظ میں تعریف و تحسین فرمائی، اور حسن خدمات کے صلے میں پانچ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ کے اجراء کا فرمان صادر ہوا، غرض کہ حضرت

ممدوح کا تعلق جس غیر معمولی اعزاز واحترام کے ساتھ شروع ہوا تھا، اسی طرح نہایت عزت ووقار کے ساتھ انجام پذیر ہوا[1]۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب حیدر آباد میں

حضرت ممدوح کے استعفاء کو منظور کرتے ہوئے نظام دکن نے فرمایا تھا کہ ہم آپ کی جگہ پر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کا تقرر کرنا چاہتے ہیں، آپ ان سے دریافت کر کے جواب دیں، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے امتثالِ امر کے طور پر یہ تعلق منظور فرمالیا اور ۲۲/ جمادی الاولیٰ کو حیدر آباد تشریف لے گئے، لیکن دو تین ماہ کے بعد جب حضرت مہتمم صاحبؒ کی علالت نے طول کھینچا تو مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ حضرت مولانا کو واپس بلالیا جائے، چنانچہ اس مقصد کے لیے نظام کی بارگاہ میں مجلس کی جانب سے ایک معروضہ ارسال کیا گیا، جس میں دارالعلوم کی اہمیت اور اس کی ضرورت کے پیش نظر استدعا کی گئی تھی کہ حضرت مولانا کو مراجعت دیوبند کی اجازت مرحمت فرمائی جائے، چناں چہ حضرت ممدوح حیدر آباد سے رخصت ہوکر ۱۲/ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ کو دیوبند تشریف لے آئے۔

علامہ کشمیریؒ کی دارالعلوم سے علیحدگی

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے دیوبند واپسی کے بعد یہاں ایک بڑا ہنگامہ کھڑا ہوگیا، انتظامیہ کے ایک فیصلہ سے طلبہ ناراض ہوگئے، جس کی وجہ سے حالات کشیدہ ہوگئے، طلبہ بھی دو جماعتوں میں تقسیم ہوگئے، جس سے دارالعلوم کے انتظامی اور تعلیمی وتربیتی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، حضرت علامہ کشمیریؒ جو اس وقت دارالعلوم کے صدر المدرسین اور دارالعلوم کے علمی وتحقیقی افق کے شاہ خاور تھے، اس واقعہ سے دلبر داشتہ ہوگئے، آپ خاموش پسند طبیعت کے مالک تھے، ہنگامہ آرائی اور محاذ آرائی

[1] دیکھئے تاریخ دارالعلوم: ج:۱، ص:۲۶۷۔

سے انہیں طبعاً حد درجہ تنفر تھا، چناں چہ ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ میں حضرت شاہ صاحبؒ رخصت پر اپنے وطن تشریف لے گئے اور ماہ صفر ۱۳۴۶ھ میں وہیں سے استعفیٰ بھیج دیا اور آپ کے ساتھ دارالعلوم کے متعدد نامور اساتذہ نے بھی احتجاجاً اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔

اس واقعہ کی پوری تفصیل تاریخ دارالعلوم میں دیکھی جا سکتی ہے، بہر حال اللہ تعالیٰ کے تکوینی نظام کے تحت یہ واقعہ پیش آیا، اور بظاہر یہ ناخوشگوار واقعہ بھی اپنے نتائج کے اعتبار سے بعض مفید پہلوؤں سے خالی نہیں رہا، چناں چہ شیخ الاسلام علامہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جو خود حضرت علامہ کشمیریؒ کے ساتھ مستعفی ہو کر ڈابھیل چلے گئے تھے، ۱۳۵۵ھ میں دارالعلوم کے صدر مہتمم کی حیثیت سے دارالعلوم تشریف لائے تو ایک عام اجتماع میں اس اختلاف و خلفشار کے اسباب بیان کرتے ہوئے نہایت بلیغ انداز میں فرمایا تھا کہ:

”جس طرح ایک خاص موسم میں سمندر میں جوش و خروش اور ہیجان و تلاطم پیدا ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سمندر کے بخارات بادل کی شکل اختیار کر کے اسی وقت زمین کی شادابی اور سرسبزی کا سبب بنتے ہیں، جب کہ زمین اپنی خشکی اور تشنگی کے باعث پانی کی سخت محتاج ہوتی ہے؛ لیکن جب سمندر میں گرمی پیدا ہو کر تموج اور تلاطم پیدا ہوتا ہے تو کچھ جزوی نقصانات بھی ہو جایا کرتے ہیں جس سے بسا اوقات سمندر میں چلنے والے جہاز تک خطرے میں پڑ جایا کرتے ہیں، مگر جن لوگوں کی نظر حق تعالیٰ کی حکمت بالغہ پر ہوتی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اس نقصان میں بھی کوئی نفع کلی ضرور ہے، گو سمندر کا یہ تلاطم اور جوش کچھ لوگوں کو اضطراب و ہلاکت مین ڈال دینے والا ہوتا ہے، مگر اسی سے مخلوق کے لیے زندگی کا کوئی عظیم الشان فائدہ اور سامان بھی مشیتِ الٰہی کے پیش نظر ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح دارالعلوم کے علمی سمندر میں بھی، ایک طوفان جوش اور تلاطم اٹھا اور اس کی موجیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں، اس تموج اور تلاطم سے کچھ

نقصانات بھی پہنچے، مگر یہاں سے بخارات کے جو بادل اٹھے وہ ابر رحمت بن کر گجرات کی اس دور افتادہ سرزمین پر جا کر برسے، جو علم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بالکل محروم اور بے بہرہ تھی، علمائے دیوبند کے وہاں پہنچ جانے سے ڈابھیل میں جو عظیم الشان مدرسہ عالم وجود میں آیا، اس کے علمی فیضان سے آج گجرات کا چپہ چپہ سیراب ہو رہا ہے اور گجرات کا بدعت کدہ بحمد اللہ آج قرآن وسنت کی روشنی سے منور ہے۔"[1]

علامہ عثمانیؒ کے الفاظ میں یہ ہے انجام دارالعلوم کے علمی سمندر کے اس جوش و تموج کا، جس نے دارالعلوم کی فضاء میں تین چار سال تک مسلسل طوفان اور تلاطم برپا رکھا، کسی نے سچ کہا ہے۔

خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما درآں باشد!

علامہ کشمیریؒ کے ڈابھیل قیام کے تعلق سے علامہ انظر شاہ کشمیریؒ رقم طراز ہیں:

"آپ نے وہاں ۱۳۴۷ھ سے ۱۳۵۱ھ تک یعنی پانچ سال مسلسل حدیث کا درس دیا، تدریس کے علاوہ تبلیغ کے فریضے سے بھی غفلت نہ کی، چناں چہ بہت سی بدعات ومحدثات جو اہل گجرات کے رگ وریشہ میں داخل ہو چکی تھیں، آپ کی جدوجہد سے ختم ہو گئیں، کتنے ہی لوگ تھے، جن کے دلوں میں دین اور علمائے دین کی محبت پیدا ہو گئی، اور کتنی وہ زندگیاں ہیں، جو آپ کی پاکیزہ ہمنشینی سے صفائی باطن کی پیکر بنیں، کتنے ہی وہ دماغ ہیں، جن میں زہد وقناعت کے اثرات جاگزیں ہوئے، تسلیم کرنا ہوگا کہ گجرات کی زمین پر خیر وبرکت، رشد وہدایت کی یہ ضیاء پاشیاں مرحوم کی مساعی کا کرشمہ ہیں[2]"۔

---

[1] دیکھیے: تاریخ دارالعلوم، ج:۱،ص:۲۷۲-۲۷۳۔

[2] نقش دوام، ص:۴۶-۴۷۔

طلبہ کی اسٹرائک اور علامہ کشمیریؒ اور دیگر نامور اساتذہ کے استعفیٰ سے آپ بہت رنجیدہ تھے، طلبہ کی بعض حرکتوں سے بہت نالاں تھے؛ لیکن اس پورے اختلاف کے زمانے میں حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تسلیم و رضا کے پیکر بنے رہے، طلبہ کا یہ اختلاف ان کے لیے پریشانی خاطر کا سبب تو ضرور تھا، مگر وہ اپنی حکمت و بصیرت سے دارالعلوم کے گیسو کو سنوارتے رہے، اسی زمانے میں حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ نے آپ کو رائے پور آنے کی دعوت دی، آپ رائے پور تشریف لے گئے، حضرت رائے پوریؒ نے غیر معمولی احترام کا معاملہ فرمایا، اور جب دارالعلوم کا ذکر آیا تو حضرت رائے پوریؒ نے آپ کے پاؤں پکڑ لیے اور آب دیدہ ہو کر فرمایا:

> ''میں اس کہنے پر مامور کیا گیا ہوں کہ حق تعالیٰ نے آپ کی ترقیٔ درجات کے لیے بدگویوں کی بدگوئی کا راستہ تجویز فرمایا ہے، وہ جو پیش آنے والا ہے، اس سے آپ دل تنگ نہ ہوں، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے نہایت بشاشت سے فرمایا کہ میں حق تعالیٰ کی ہر تقدیر پر دل سے راضی اور شاد ہوں، فرمایا: چناں چہ ایسے فتنے رونما ہوئے، جن میں یہ تقدیر پوری ہوگئی[۱]''۔

گویا آپ کی حالت شاعر کے اس قول کی مصداق تھی

تری بندہ پروری سے مرے دن گذر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ

سانحۂ وفات فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ

نظام دکن نے فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سے اس وقت جب آپ حیدرآباد میں افتاء کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے، ایک مرتبہ دارالعلوم کے دیکھنے کا

[۱] دیکھیے: پچاس مثالی شخصیات، ص: ۱۱۴۔

شوق ظاہر فرمایا تھا، اس سال کے اوائل میں اربابِ حل وعقد کی رائے ہوئی کہ فخرالاسلام صاحب خود حیدرآباد تشریف لے جاکر نظام کو ان کا وعدہ یاد دلائیں اور دارالعلوم کی طرف سے یہاں قدم رنجہ فرمانے کی دعوت دیں، حضرت ممدوح نے باوجود پیرانہ سالی اور غیر معمولی ضعف ونقاہت کے جماعت کی خواہش کو منظور فرمالیا، اور دکن کے طول طویل سفر کیلیے تیار ہوگئے، ۲۸ر ربیع الثانی کو روانگی عمل میں آئی، حیدر آباد پہونچنے پر نظام سے ٹیلی فون پر گفتگو کے بعد ملاقات کا وقت مقرر ہوگیا، لیکن تقدیر الٰہی کو کچھ اور ہی منظور تھا، ملاقات کے دن اچانک بواسیر کا (جس کا مدت سے عارضہ تھا) ایسا شدید دورہ ہوا کہ قوائے جسمانی نے جواب دینا شروع کر دیا، مرض کی شدت مایوس کن حالت تک پہنچ گئی، جب ملاقات کئے جانے کا کوئی امکان باقی نہ رہا تو یہ رائے قرار پائی کہ آپ کو بعجلت ممکنہ دیوبند لے جایا جائے، سکنڈ کلاس کا ایک پورا کمرہ ریزرو کرایا گیا اور آپ اپنے رفقائے سفر کی معیت میں ۳ر جمادی الاولیٰ کی صبح کو حیدرآباد سے دیوبند کے لیے روانہ ہوگئے، جب ٹرین نظام آباد کے اسٹیشن کے قریب پہنچی تو زبان پر ذکر اللہ جاری تھا ۲۹ر کے عدد پر عقدِ انامل تھا کہ اللہ کے لفظ کے ساتھ روح پرواز کر گئی، رحمة الله رحمة واسعةً۔

نظام آباد اسٹیشن پر نعش اتاری گئی شہر میں خبر پہونچتے ہی لوگوں کا ہجوم ہوگیا اور جنازہ تیار کیا گیا، متعلقین اور نظام کو تار کے ذریعے اطلاع دی گئی، نظام کا جواب آیا کہ حافظ صاحب کا جنازہ حیدرآباد لایا جائے، چنانچہ جنازہ حیدرآباد لے جایا گیا، نظام آباد اور حیدرآباد میں متعدد جگہ نماز جنازہ پڑھی گئی، اگلے روز ۴ر جمادی الاولیٰ کو قبیل عصر نظام کی تجویز کے مطابق حیدرآباد کے مخصوص قبرستان میں جو خطۂ صالحین کے نام سے خود نظام نے اکابر و معظمین کے لیے بنایا تھا، موتِ غربت کے اس شہید کو شاہانہ اعزاز کے ساتھ سپردِ زمین کر دیا گیا، نظام نے باغِ عامہ کی مسجد میں تعزیتی تقریر

کرتے ہوئے نہایت تاسف کے ساتھ یہ پُر اثر جملہ فرمایا کہ ''افسوس وہ مجھے لینے آئے تھے مگر خود یہیں رہ گئے[1]''۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ نے آپ کے آخری سفر، اور سانحۂ وفات کو تفصیل سے بیان کیا ہے، آپ لکھتے ہیں:

''وفات کی صورت حال یہ ہوئی حضرت مرحوم نے حضور نظام کو دارالعلوم آنے کی دعوت دینے کے لیے حیدر آباد دکن کا سفر کیا اور اکابر دارالعلوم کے مشورہ سے آپ دیو بند سے دکن روانہ ہوئے، نواب عبدالباسط خان صاحب مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمایا: حضور نظام سے ملاقات ہوئی، ابھی مقصد کے بارے میں سلسلہ گفتگو کا ایک ملاقات سے آغاز ہی ہوا تھا، کہ بواسیر کا دورہ شدید ہوا، خون بکثرت آیا اور طبیعت اتنی نڈھال ہوگئی کہ لوگ زندگی سے مایوس ہوگئے تمام مقامی احباب و خدام کا مشورہ یہی طے پایا کہ اب جلد سے جلد آپ کو دیو بند پہنچایا جائے چناں چہ سیکنڈ کلاس کا ایک پورا کمرہ ریزرو کرایا گیا یہ چار خدام واحباب ساتھ ہوئے، میر احمد علی صاحبؒ مولانا محمد علی صاحبؒ حافظ محمود احمد صاحبؒ اور حافظ شریف احمد گنگوہی صاحب (حال مدرس حفظ القرآن حفظ القرآن دارالعلوم دیو بند) ریل گاڑی روانہ ہوئی، جب حیدر آباد سے تقریباً اسی میل پہنچی اور نظام آباد اسٹیشن قریب آیا تو رفقاء میں سے مولوی محمد علی صاحب سے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی (جو اس وقت دارالعلوم کے سرپرست تھے) کو خط لکھوایا، اس میں یہ جملہ خصوصیت سے قلم بند کرایا جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ''الحمد للہ میرا قلب غافل نہیں؛ بلکہ ذاکر ہے اور میں اللہ تعالیٰ کی ہر تقدیر پر دل سے راضی ہوں''۔

خط لکھ کر قضاء حاجت سے فراغت پائی اور اپنی سیٹ پر سیدھے لیٹ کر مولانا

[1] دیکھیے: تاریخ دارالعلوم، ج:۱، ص:۲۷۶۔

محمد علی صاحب سے فرمایا کہ چادر ہر طرف سے درست کردو اور یہ دیکھو کہ میرے کپڑوں پر نجاست وغیرہ کا اثر تو نہیں ہے؛ کیوں کہ ملائکہ علیہم السلام کو بدبو سے اذیت ہوتی ہے خادموں نے عرض کیا کہ حضرت کپڑے بالکل صاف ہیں، اس کے بعد عقد انامل پر تسبیح اور ذکر شروع کیا، ۲۹ رکی عدد پر عقد انامل تھا کہ اللہ کے لفظ کے ساتھ روح پرواز کرگئی، رحمہ اللہ ورحمۃ واسعۃ قبض روح کے وقت سب خدام نے ایک تیز قسم کی آسمانی رنگ کی چمک محسوس کی جس نے سب کی نگاہوں کو خیرہ کردیا، یہ چمک آئی تھی جوں ہی ختم ہوئی تو قبض روح ہو چکا تھا۔

نظام آباد کے اسٹیشن پر لاش اتاری گئی، شہر میں یہ خبر بھی بجلی کی طرح پھیل گئی، ہزارہا لوگ نام سن کر جمع ہونے شروع ہوگئے، مسجد اسٹیشن میں غسل دیا گیا، جنازہ تیار تھا اور ہزاروں مسلمانوں نے نماز جنازہ ادا کی، حیدرآباد حضور نظام کو اور متعلقین کو تار دیئے گئے، وہاں سے حضور نظام کا تار پہنچا کہ مولانا کا جنازہ حیدرآباد لاؤ، اسی وقت تابوت بنایا گیا، کئی من صندل کے، برادہ میں تکفین شدہ لاش ڈھانپی گئی اور تابوت بند کردیا گیا، ایک لاری پر تابوت رکھ کر اگلے دن حیدرآباد پہنچایا گیا، شہر میں خبر دوڑ گئی اور جوق در جوق لوگوں کا ہجوم شروع ہوگیا"۔

ہزاروں انسانوں نے نماز جنازہ پڑھی، متعدد نمازیں ہوئیں، حضور نظام نے خود اپنے مصارف پر اپنے مخصوص تیار کردہ قبرستان موسومہ خطہ صالحین میں ۴ر جمادی الاول ۱۳۴۷ھ کو دفن کرایا، حق تعالیٰ درجات بلند فرمائیں[1]۔

اس طرح علم ودانش، فقہ وفتاویٰ اور ملت اسلامیہ کی قیادت کا ایک نیر تاباں دکن کے افق پر ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔

فروغ شمع تو باقی رہے گا صبح محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

[1] دارالعلوم دیوبند کی پچاس مثالی شخصیات، ص: ۱۱۵-۱۱۶۔

آپ کی وفات ایک حادثہ نہیں؛ بلکہ ایک عہد کا خاتمہ، ایک تاریخ کا زوال اور دارالعلوم دیوبند کی روشن روایات کی امانت کی رخصت تھی، فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کا عہدِ اہتمام درحقیقت دارالعلوم کی تاریخ کا ایک زرّین اور تابناک باب ہے، انھوں نے دارالعلوم کی عظیم خدمات انجام دیں اور دارالعلوم نے اُن کے عہدِ اہتمام میں عظیم الشان اور ہمہ جہت ترقی حاصل کی، یہ خبر جان کاہ پوری جماعت کو سوگوار کر گئی، اخباروں اور مجلّات نے یہ خبر شائع کی اور مدتوں اس حادثہ پر ماتم کرتے رہے، جگہ جگہ تعزیتی جلسے ہوئے اور قرآن خوانی کا نظم کیا گیا۔

آپ کی وفات پر کہے گئے مرثیے

آپ کی وفات پر متعدد شعراء نے الم انگیز مرثیے لکھے، ان مرثیوں میں آپ کی خدمات اور آپ کے کارنامے، نیز دارالعلوم کی سالہا سال کی کامیاب نظامت کو خراج عقیدت پیش کیا گیا، ذیل میں ہم تین مرثیے پیش کرتے ہیں، ایک مرثیہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلف الرشید حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب قاسمی نے فارسی میں لکھا ہے، شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہویؒ۔ جو قیام دکن کے زمانہ میں آپ کے بہترین مشیر اور علمی معاون تھے۔ نے دو طاقتور مرثیے لکھے، ایک اردو میں اور ایک عربی میں، ان مرثیوں کا ہر مصرعہ عقیدت ومحبت سے لبریز اور آپ کی روشن خدمات کا عکس جمیل ہے:

پہلا مرثیہ

از شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہویؒ

دارالعلوم بیت الاحزان ہو گیا کیوں
ہے جان بدن میں مضطر سینے میں قلب محزون
ہیں کیوں کمر خمیدہ پھرتے حبیب رحمان
ہاتھوں میں کیوں ہے رعشہ اور کیوں قدم ہے لرزاں
اصغر حسین احمد بیٹھے ہیں سر جھکائے
گویا رضا کے کے پتلے تسلیم کے نمونے
کیوں خاندان قاسم آنسو بہا رہا ہے
ہر ایک گھر میں محشر سا کس لیے بپا ہے
فرطِ غم والم سے طیب کا سر جھکا ہے
ساکت ہیں اور محزون یا رب یہ کیا ہوا ہے
دریائے اشک طاہر کی آنکھ سے رواں ہے
بیٹھے خموش لب ہیں سینے میں دل تپاں ہے
کیوں حسرتیں الٰہی اس جا برس رہی ہیں
کس روئے پر ضیا کو آنکھیں ترس رہی ہیں
کیوں اٹھ گیا جہاں سے کس کا محیط ہے غم
عالم کی موت ہے یہ یا ہے یہ موت عالم
کھو گیا مربی دارالعلوم کا کیا
کہتے تھے جس کو ہم! ہے یہ مہتمم ہمارا

او یادگار قاسم کیوں ہم سے منھ موڑا
بتلا تو دے خدا را کس پر ہے ہم کو چھوڑا
او علم مصطفیٰ پر قربان ہونے والے
دارالعلومِ قاسم پر جان کھونے والے
تو تو رفیق اعلیٰ سے جا کے مل گیا ہے
کچھ اس کی بھی خبر ہے یہ قصر ہل گیا ہے
یہ تھا سفر فنا کا یا تھا سفر دکن کا
کچھ دھیان بھی نہ آیا اس قاسمی چمن کا
او معدن علوم قاسم کہاں گئے تم
آیا پسند تم کو کیوں کرفنا کا قلزم
او تاجدارِ علم و تقویٰ کہاں گیا تو
مسند نشینِ زہد و فتویٰ کہاں گیا تو
کشتی تو ہے بھنور میں او نا خدا ہمارے
منجدہار میں ہمیں تم کیوں چھوڑ کر سدھارے
ناراض تھے اگر تم تو ہم سے ہی خفا تھے
زاہر کی اور سالم کی کیا خطا جو روٹھے
غیروں کے بچوں کا بھی رونا تمہیں گراں تھا
بچے تمہارے روتے ہیں پھر سکوت کیا
سمجھاؤ آج آکر اپنے حبیب کو تم
صبر و سکون ان سے یک لخت ہوگیا گم
او حامی شریعت اور ماحی تفلسف
وے حامل طریقت وے سابح تصوف

محمود کے چہیتے مسعود کے دلارے
قاسم کے دل کے ٹکڑے اشرف علی کے پیارے
پڑھنے پڑھانے کی تم تو کرتے تھے نصیحت
خاموش ہوگئے کیوں! پھوٹی ہماری قسمت
شیدا تھا تو ہمارا ہم جاں نثار تیرے
تو ہم پہ تھا فدا ہم خدمت گذار تیرے
او جانشین قاسم، درد جگر کے مرہم
زندہ رہیں گے جب تک، تیرا کریں گے ماتم
پھولے پھلے تمہاری اولاد تا قیامت
ہو عمر بھر نہ کوئی بھی مبتلائے آفت
عمر طویل پاویں یا رب حبیب رحمان
محزوں ان کو دیکھا پھر ان کو دیکھیں خنداں
دارالعلوم کو تو دارالسرور کردے
ان قلبہائے مضطر کو پھر خوشی سے بھر دے
یہ چشمۂ ہدایت جاری رہے ہمیشہ
اور دستگیر فضل باری رہے ہمیشہ[1]

[1] سوانح حیات، ص: ۴۵-۴۷۔

دوسرا فارسی مرثیہ
(آہ درد منداں)

از حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ

یہ مرثیہ حضرت حکیم الاسلامؒ نے فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے اس جلسۂ تعزیت میں پڑھا، جو دارالعلوم میں آپ کی وفات کے بعد منعقد ہوا، اس مرثیہ کو سن کر پورے جلسہ پر گریہ طاری ہو گیا تھا۔

ملجائے کساں و بے کساں رفت | ماوائے ضعیف وناتواں رفت
مطلوب قلوب طالبان رفت | محبوب دل جہانیاں رفت
گنجینۂ فیض بے کراں رفت | قسّام زبزم قاسماں رفت
راس زمن وپناہ ایماں | سرحلقۂ بزم مؤمناں رفت
سر دائرۂ علوم تقویٰ | محمود حبیب عالماں رفت
تسکین خواطر کریماں | ہیہات کہ از جہاں چساں رفت
باغ است وبہار خاک برسر | کز گلشن علم باغباں رفت
طفلان چمن بزرد روئی | شادابی ونکہت گلاں رفت
اے وائے چمن چنیں خزانے | گل رفت ونسیم گلستاں رفت
آں رفت کہ رفتنش زعالم | گویا زہمہ جہاں تواں رفت
آں راہ نمائے دین احمدؐ | آں قدر فزائے قدسیاں رفت
آں صدر نشین مرکز علم | آں قدر فزائے قدسیاں رفت
آں قاسم علم و ابن قاسمؒ | از حلقۂ قاسمی دواں رفت

دارائے علوم حافظ احمد بگذاشتہ نام وخود نہاں رفت

ماندیم زمرکز عقیدت افسوس کہ قبلۂ دلاں رفت

اورفت کہ رفت رعب وہیبت او رفت کہ شیر نیستاں رفت

اے طیبؔ وطاہرؔ شکستہ الصبر کہ پیرِ دو دماں رفت

تسلیم کہ رفت پیر سالے لیک آہ کہ ہمت جواں رفت

انداختہ خرقۂ یتیمی بردوشِ شما سوئے جناں رفت

اندوختہ زاد راہ عقبیٰ از راہ زمیں بآسماں رفت

برداشتہ دل زما غربا از غربتِ رہ رہ جناں رفت

رفتہ جہاں کہ رفتنی بود حیفے کہ زدہر ناگہاں رفت

ناسودہ بہ ملک تن چو جانش تسبیح کناں رواں دواں رفت

برلوحِ جبیں نوشتہ مومن از کلکِ قضاء عرق چناں رفت

لاریب شہید موت غربت رفتہ بحایات جاوداں رفت

پیمودہ سبیل حق تعالیٰ باموت شہادت ہم عناں رفت

مہمان شہ دکن شدہ پس مہماں سوئے شاہ آسماں رفت

در خطۂ صالحین نہفتہ بر خطۂ امر رب نہاں رفت

بگذاشتہ زود دوش احباب بردوش وسرِ فرشتگان رفت

بگذاستہ ایں سرائے فانی باطائر قدس آشیاں رفت

بادلق گدا بطبع شاہی پیوستہ بماند وہم چناں رفت

باگریہ کناں بسیل اشکیم واں خندہ زناں بجاوداں رفت

مائیم وفتادگی ودوری اوبر در قرب بے گماں رفت

پایاب نمود منزل ہجر قطرہ سوئے بحرے بے کراں رفت

پابند ہوائے شوق گشتہ　　　ذرہ سوئے آفتاب جاں رفت
رحمت بہ تن وران تو باد　　　اے آنکہ زجان بہ جانستاں رفت[۱]

تیسرا عربی مرثیہ

یہ مرثیہ کے اشعار حضرت شیخ الادب رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں جو آپ نے حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کی وفات پر عربی میں تحریر فرمائے، آپ لکھتے ہیں:

قصيدة— في رثاء المولىٰ الهمام— البحر العلام— مولانا الحاج محمد احمد صاحب مدير دارالعلوم الديوبندية الذى مات قدس سره غريباً، وكان ارتحل لبعض حوائج دارالعلوم فمرض في حيدر آباد فتعجل في العود الى وطنه ولبّى داعى الموت ولم يفز بالوصل الى الوطن.

نعى الناعون شيخاً ذا حفاظ　　　جليلاً ماجداً بالفضل احرى

خبر دینے والوں نے ایک جلیل القدر خود دار باحمیت صاحب مجد بزرگ کی وفات کی خبر پہنچائی جو فضیلت کے اعلیٰ درجہ کے مستحق تھے۔

نبيلاً فاضلاً شهماً ذكياً　　　مطيعاً ربّه نهياً وأمرا

آپ صاحب فضل وکمال، خوددار، باوقار قائد، انتہائی ذہین تھے اور اپنے پروردگار کے امر ونہی کی کامل اطاعت کرنے والے تھے۔

سلالةَ قاسم الخيرات نكدباً　　　وفياً حائزاً اجراً و ذخراً

محاسن اور دعوت حق میں قاسم الخیرات (یعنی حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ) کے خلف صادق تھے، بایں ہمہ اجر کو پوری طرح حاصل کرنے

---

[۱] سوانح حیات، ص: ۴۵-۴۷۔

والے اور بہترین ذخیرہ تھے۔

صبوراً فی المصائب والرزایا و فی السراء کان یزید شکراً

آپ جلیل القدر شیخ مصائب اور حوادثات کے وقت صبر واستقلال سے
کام لیتے تھے اور خوشی کے وقت بہت ہی زیادہ حمد وشکر ادا کیا کرتے تھے۔

لعطشی العلم کالعسل المصفی و للعلماء کان اجل بحراً

تشنگانِ علوم کے حق میں خالص اور صاف شہد تھے اور علماء کے واسطے ایک
بہت بڑے دریا تھے۔

واعتق علمه اسراء جهل سبی احسانه عبداً وحرا

اس کے پاکیزہ علم نے اسیران جہل کی بیڑیاں کاٹ ڈالیں اور اس کے
احسان نے آزاد وغلام کو مسخر کرلیا۔

شهیداً مات مغترباً غریباً فکلهم بحور الدمع اجریٰ

آپ نے حالت سفر میں پردیس میں شہادت کی وفات پائی اسی واسطے ہم
سب آنسوؤں کے دریا بہا رہے ہیں۔

فکم من أعینٍ قد بیضتها دموعٌ قد جرت بیضاً وحمرا

خون کے سرخ آنسوؤں نے اور پیپ کے سفید آنسوؤں نے جاری ہوکر
کتنی ہی ماتم کناں آنکھوں کو سفید کرڈالا اور ان کو اندھا کردیا۔

فقدنا قاسم الخیرات علماً و زهداً ثم تقوٰی ثم فقرا

قاسم الخیراتؒ کے علم اور زہد تقویٰ اور فقر کو ہم نے آج کھودیا ہے۔

و کنا آملین بان نراه یخجل وجهه شمساً و بدراً

''آہ'' ہم تو امید لگائے ہوئے تھے کہ عنقریب ایک ایسی ذات کی
زیارت کریں گے جس کا مبارک چہرہ آفتاب اور چاند کو شرمادیتا ہے۔

و یسمعنا ورود نظام ملک سمی خلیفتین اضاء دھراً

اور وہ بابرکت شیخ ہم کو حضرت نظام بادشاہ دکن کے ورود مسعود کی خوشخبری سنائیں گے جو سابق خلفاء راشدین میں سے دو جلیل القدر خلیفہ کے ہم نام ہے (یعنی عثمانؓ اور علیؓ کے) اور جس نے زمانہ کو اپنے انوار فیوض سے جگمگا دیا۔

ملیک عادل یقظ أبی خبعثنة شجیع فاق عصرا

وہ عادل بیدار مغز، اولوالعزم، صاحب حزم و استقلال معدن شجاعت بادشاہ ہے جو تمام زمانہ میں خاص فوقیت اور امتیاز کا مالک ہے۔

له جود حکاه الغیث طوراً اذا استمطرته والبحر اخری

اور وہ بادشاہ ایک ایسی جود و عطا کا مالک ہے کہ اس کے بخشش کی کبھی بادل نقل اتارتا ہے جب اس سے بارش کا مطالبہ ہو اور کبھی دریا اس کی حکایت کرتا ہے۔

یحب الناس ماشاء وا ولکن له قلب ببیض المجد مقری

تمام دنیا کے آدمی جو چاہتے ہیں اس کو محبوب بنا لیتے ہیں لیکن اس بادشاہ کو ایک ایسا قلب منزہ دیا گیا ہے جو عظمت اور مجد کے روشن لباس سے مفتون ہے۔

و لکنا سمعنا ان قدراً من الله العظیم السد مجری

مگر افسوس! ہم نے سنا کہ خداوند برتر و بالا کی قضاء و قدر نے تدبیر کا راستہ ہی بند کر دیا۔

و لبی داعی الله الذی لا مرد له و أن خدعا ومکرا

اور ہمارے شیخ نے اس داعی اجل کو لبیک کہا جس کو کوئی رد نہیں کر سکتا، اگر چہ ہم ہزار حیلے اور تدبیر کریں۔

له خلد و للخدام حزن رأینا موته خیرا وشرا

آج اس مخدوم خلد آشیاں کے حصہ میں تو خلد ہے اور خدام کو حزن والم حصہ میں ملا ہے، تعجب ہے کہ اس کی ایک موت خیر و شر کے دو منظر ہم کو دکھا رہی ہے۔

فیامن همه دارالعلوم اللتی اجریتها بحرا و نهرا

اے وہ عظیم ہستی جس کی جولان گاہ دارالعلوم تھا جس کو آپ نے سمندر اور دریا بنا کر بہا دیا۔

سعیت لما بناہ ابوک سعیاً فحزت الاجر ثم حویت برا

آپ نے یقیناً اس تعمیر کی تکمیل میں کامیاب کوشش فرمائی جس کی بنیاد آپ کے والد ماجد نے ڈالی تھی، لہٰذا آپ نے ہر قسم کی عظمت اور نیک نامی حاصل کر لی۔

ولم ندفنک کلا بل دفنا علوم هدی فد فنک ما أمرا

اور ہم نے آج محض آپ کے جسم کو ہرگز دفن نہیں کیا؛ بلکہ ساتھ ہی علوم ہدایت کو بھی پیوند خاک کر دیا، آہ! یہ آپ کی تدفین کس قدر تلخ ہے۔

حییت مجددا وبقیت فردا وقد تربت شرکاً ثم کفرا

آپ نے مجدد بن کر زندگی بسر کی اور آپ ہمیشہ یکتا رہے، آپ نے شرک اور کفر کو مٹی میں گاڑ دیا۔

بعدت عن الذی ما فیه نص و عما جاء ما فارقت شبراً

آپ ان بدعات سے ہمیشہ بعید رہے جن کی کوئی صریح نص نہ تھی اور آپ ایسے فعل سے ایک بالشت بھی کبھی نہیں ہٹے جن کے استحباب میں کوئی نص آئی تھی۔

و قد اجریت بحر الدمع منا و قد اودعت فی الاکباد جمرا

آپ نے ہمیں داغ مفارقت دے کر ہماری آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہا دئے اور ہمارے قلب وجگر میں غم واندوہ کی چنگاریاں بھر دیں۔

بقینا هائمین بلا أنیس کانا لم نجد خلا و خمرا

آج ہم پریشان حال بے مونس وغمگسار کھڑے ہیں، گویا ہمیں مخلص غمخوار عفو و درگذر سے کام لینے والا کوئی شفیق کبھی میسر ہی نہیں ہوا تھا۔

تعزینا إذا خطب دھانا بفقدک فقد فقدنا الآن صبرا

جب ہم پر کوئی بلا اچانک آپڑتی ہے تو آپ ہم کو صبر کی تلقین کیا کرتے تھے مگر افسوس! ہم نے آج آپ کو کیا کھویا کہ صبر ہی گم ہو گیا۔

تداوینا إذا جئناک مرضی حیاری فی المسائل مثل سکری

جب ہم بیمار ہو کر مسائل اور مشکل معاملات میں بدمستوں کی طرح حیران وسرگرداں آپ کے پاس جاتے تھے تو آپ ہمارا علاج اور تیمارداری کیا کرتے تھے۔

فیعطی ربنا جناتِ عدن لاحمد فائق الاقران طرا

ہمارا پروردگار اس احمد کو جنات عدن عطاء فرمائے جو تمام اقران سے فائق تھے۔

و قدس سرہ من فضل رب رؤوف واسع للعبد سترا

اور اس کی اسرار مقدس ومطہر ہوں اس رب رؤوف کے فضل وکرم سے جو بندوں پر مغفرت اور رحمت کے پردوں کو پھیلا دیتا ہے۔

الھی فاسْقِ من انھار خلد دفین اللحد احمد حاز قدرا

خداوند! جنت خلد کی نہروں سے سیراب فرما اس دفین لحد کو جن کا نام مبارک حضرت احمد صاحب ہے جس نے اعلیٰ مراتب کو حاصل کیا۔

و عفوا عن ذنوب قد جناھا و صفحا عنہ جاھر او اسرا

اور اس کی تمام لغزشوں کو معاف فرما اگر ان سے ہوئے ہوں اور ان کے تمام ڈھکے وچھپے گناہ پر قلم عفو کھینچ دے۔

و ابق حبیب رحمان قرونا و قرنا بعدھا و ھلم جراً

خداوند! حضرت مولانا حبیب الرحمان کے ظل ہمایوں کو مدتوں اور قرنوں قائم رکھ اور پھر اسی طرح سالہا سال تک[1]۔

---

[1] سوانح حیات حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہویؒ، ص ۷۳-۷۸۔

گیارہواں باب

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ
کچھ نمایاں محاسن و اوصاف

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ بہت سی خوبیوں کا مرقع تھے، ان کی زندگی میں کردار کی عظمت اور فکر و فن کی بلندی ہم رکاب دکھتی ہے، آپ ایک خوش مزاج، سدا بہار، سراپا اخلاق، متواضع، ملنسار، علم پرور، بلند نگاہ، عالی حوصلہ، پروقار اور سنجیدہ انسان تھے، اور پوری طرح اقبال کے اس شعر کے مصداق ؎

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رخت سفر، میر کارواں کے لئے

حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ نے اپنے نپے تلے الفاظ میں آپ کی خاکہ نگاری اور محاسن کا ایک خوبصورت گلدستہ تیار کیا ہے، اس کی تراوش کتاب کی دلاویزی میں بالیقین اضافہ کرے گی، آپ لکھتے ہیں:

"حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے فرزند دار العلوم سے فارغ اور اسی ادارہ کے صدر مہتمم، چوڑا چکلا جسم، سرخ سفید، گھنی ڈاڑھی، وجاہت ان کے قدم لیتی، دماغ کے بادشاہ، دل کے فقیر، نازک

گود میں پلے ہوئے، جن کے لیے خدام کی نیاز مندیاں دست بستہ حاضر رہتیں، بھولے اس قدر کہ سکّوں میں بھی فرق نہ کر پاتے، کف دست پر رکھ کر دریافت فرماتے یہ کون سا سکہ ہے، حدت مزاج اس قدر کہ بڑوں کے پتے ان کے سامنے آتے ہوئے پانی ہوتے، لباس فاخرہ، انتہائی نفاست پسند، پلنگ پر سفید چادر بار بار بدلی جاتی[۱]''۔

عظمت و وقار

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ بہت ہی باوقار اور سنجیدہ تھے، اس لیے سب پر آپ کی عظمت اور وجاہت کا اثر قائم تھا، آپ احاطۂ دار العلوم میں قدم رکھتے تو اساتذہ وطلبہ میں ایک قسم کا سناٹا چھا جاتا جو جہاں ہوتا وہیں کھڑا کا کھڑا رہ جاتا، علامہ ابراہیم بلیاویؒ کا بیان ہے کہ دور سے انہیں آتا دیکھ کر طلبہ باہر ہوتے تو کمروں میں گھس جاتے[۲]۔

آپ چلتے تو عموماً نیچی نگاہ کر کے چلتے، چال میں وقار اور متانت ہوتی تھی، ان کے سامنے پہنچ کر ایک ہیبت محسوس ہوتی تھی۔

تمام اکابر واصاغر آپ کی ذات اور آپ کی رائے کا بے حد احترام کرتے تھے، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں تدبیریں تو ہزار کرلوں گا مگر حضرت مولانا احمد صاحب کی سی وجاہت کہاں سے لاؤں گا، اس لیے جس موقع پر ان کا ترکش، تدبیر کے تیروں سے خالی ہو جاتا تھا، اور ضرورت پڑتی تھی کہ اب وجاہت اور رعب اور حکم سے کام لیا جائے تو وہاں حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کو آگے کر دیتے تھے، اور ان کی ہیبت سے وہ مشکل مرحلہ منٹوں میں حل ہو جاتا تھا۔

---

۱ لالہ وگل: ص ۳۵۔

۲ دار العلوم کی پچاس مثالی شخصیات، ص ۹۱۔ ۳ ایضاً ص ۹۶

علامہ ابراہیم بلیاویؒ کا بیان ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ ہمیشہ تراویح کی نماز دارالعلوم کی مسجد میں ادا فرماتے تھے، جہاں آپ کے ساتھ حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ بھی آپ کے ساتھ تراویح پڑھا کرتے تھے، مالٹا کی روانگی سے چند سال قبل، حضرت شیخ الہندؒ نے بعض اعزہ کی فرمائش واصرار پر دولت خانہ ہی پر تراویح پڑھنے کا ارادہ فرمایا، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ اور حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کی خواہش تھی کہ حضرت شیخ الہندؒ تراویح دارالعلوم کی مسجد میں ادا کریں، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ نے حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سے فرمایا کہ اس گتھی کو آپ ہی حل فرمائیں، اور اس کی تدبیر یہی ہے کہ آپ حضرت سے صرف اتنا پوچھ لیں کہ حضرت تراویح امسال کہاں پڑھیں گے، چناں چہ حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ وہاں تشریف لے گئے اور حضرت سے پوچھا، حضرت نے اپنی عادت کے مطابق لجاجت آمیز لہجہ میں فرمایا کہ بھائی حافظ جی، میں اب کمزور ہو گیا ہوں، رات کو مدرسہ آنا جانا کچھ دشوار سا ہو گیا ہے اس پر حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے فرمایا کہ میں تو صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ آپ تراویح کہاں پڑھیں گے؟ آپ جہاں بھی پڑھیں، ہمیں بھی وہیں پڑھنا ہے آپ کو چھوڑنا نہیں، اس پر سماجت کے لہجہ میں فرمایا کہ نہیں تم تراویح مدرسہ ہی میں پڑھو مجھے یہیں مکان پر رہنے دو، اس پر مولانا محمد احمد صاحبؒ ذرا غصہ اور مایوسی آمیز لہجہ میں فرمایا کہ بہت اچھا اور اٹھ کر چلے گئے، مہتمم صاحبؒ ابھی تیس چالیس قدم ہی چلے ہوں گے کہ حضرت اٹھے کمرہ میں سے اپنی لاٹھی لی اور مولانا محمد احمد صاحبؒ کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے، حضرت گھر میں داخل ہو چکے تھے، جا کر آواز دی تو حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کی والدہ ماجدہ خود دروازہ پر تشریف لائیں، حضرت شیخ الہند ان کا بے حد احترام فرمایا کرتے تھے، حضرت کی والدہ نے فرمایا: محمود حسن! حضرت قاسم کے کیا کئی بیٹے ہیں کہ ایک کو چھوڑ کر

دوسرے کو پکڑنا ہے، تمھیں شرم کرنی چاہیے، اس پر حضرت شیخ الہندؒ نے بہت عاجزی سے فرمایا کہ قصور معاف کردیجئے، میں تراویح ساتھ ہی پڑھوں گا[1]۔

ایک مرتبہ کتب خانہ دارالعلوم میں تقسیم اسباق کا سلسلہ جاری تھا، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب صحیح مسلم حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کو دینا چاہتے تھے، وہ مانتے نہ تھے، جب حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی تفہیم کوئی اثر نہ دکھا سکی، تو انہوں نے چپکے سے حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے پاس آدمی بھیج دیا کہ وہ بھی کتب خانہ میں تشریف لے آویں، اور واقعہ کی صورت حال ان سے کہہ دی، حضرت ممدوح اچانک حلقہ مدرسین میں تشریف لے آئے، صحیح مسلم کا ذکر آیا تو فرمایا: مولانا شبیر صاحب یہ کتاب اپنے نام لکھو، انھوں نے کچھ عذر بیان کرنا چاہا فرمایا: پہلے سبق لکھو، پھر بولو، انھوں نے آخر کار سبق لکھ دیا اور سبق شروع کر دیا[2]۔

حضرت الامام حجۃ الاسلام محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے فرزند ہونے اور ذاتی شرافت کی وجہ سے اکابرین آپ کا بے حد احترام فرماتے تھے، حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ رقم طراز ہیں:

> حضرت شیخ الہندؒ باوجود یہ کہ حضرت ممدوح کے استاد بھی تھے، اور فخر الاسلام مولانا محمد احمد صاحبؒ کا قلب بھی ان کی استادی کی عظمت سے بھرپور تھا، لیکن مجھے یاد ہے کہ جب کبھی حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ اپنی صاحبزادگی اور مخدوم زادگی کے رنگ میں ہوتے اور شیخ الہند آجاتے تو ادھر سے ناز اور ادھر سے نیاز قابل دید ہوتا تھا، بعض اوقات تو نہایت نیازمندی سے حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے سامنے ہاتھ جوڑ لیتے اور پاؤں تک پکڑ لیتے تھے، مولوی عزیز احمد صاحب نگینوی مرحوم نے بیان کیا

---

[1] دارالعلوم کی پچاس مثالی شخصیات، ص ۹۷۔
[2] پچاس مثالی شخصیات، ص ۹۷۔

ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ فرمایا کرتے تھے کہ محمد احمد صاحبؒ کا میرے دل میں اتنا احترام ہے کہ اگر وہ پاخانہ کی کوئی ٹوکری اٹھانے کو بھی مجھ سے کہیں تو میں اس کی تعمیل کو اپنی عزت سمجھوں گا''۔

یہ واقعہ ہے کہ استاذ کی نسبت کا احترام جو ہمارے اسلاف کی زندگی میں رکھتا ہے، یہی ان کی علمی عظمت کا راز ہے، حضرت حکیم الاسلامؒ لکھتے ہیں:

''حضرت شیخ الہند حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے سامنے استاذ ہوتے ہوئے بھی ان کی صاحبزادگی کے سبب اسی طرح مودب اور نیاز مندانہ بیٹھتے تھے کہ آج مشائخ کے سامنے ان کے مرید و متوسلین بھی وہ شان نیاز اختیار نہیں کرسکتے یہ معمولی بات تھی کہ جب حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ حضرت شیخ الہند کے مکان پر تشریف لے جاتے اور حضرت شیخ صحن مکان میں چار پائی پر بیٹھے ہوئے ہوتے دروازہ کے سامنے کی سڑک کی لمبی مسافت سے جہاں مولانا محمد احمد صاحب آتے ہوئے حضرت شیخ کو نظر پڑ جاتے تھے تو حضرت چار پائی چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے تھے، اور اس وقت تک کھڑے رہتے تھے جب تک مولانا محمد احمد صاحبؒ مکان میں پہونچ کر اپنی جگہ بیٹھ نہ جائیں اور ان کے بیٹھانے کی صورت یہ ہوتی تھی کہ حضرت شیخ کرسی منگواتے اسے اپنے سرہانے بچھاتے، جب حضرت مولانا احمد صاحبؒ اس پر بیٹھ جاتے، تب حضرت چار پائی پر بیٹھ جاتے تھے''۔

''حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب مدظلہ حال صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند نے فرمایا کہ میں بھی ان کرسی لانے والے لوگوں میں سے ہوں اور میں نے بھی حضرت شیخ الہندؒ کی ایماء پر کرسی لاکر، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے لیے بچھائی ہے[1]''۔

---

[1] پچاس مثالی شخصیات، ص:۹۔

اسی قسم کا یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے:

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اپنی تقریر میں ذکر فرمایا کرتے تھے کہ حضرت شیخ الہندؒ کے مالٹا سے آنے کے بعد حضرت کی مردانہ نشست کے سامنے کے کمرے میں بند کواڑ کھول کر میں اچانک گیا تو یہ منظر دیکھ کر کہ دونوں مخدوم زادے ابن قاسم حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ اور ابن رشید حضرت حکیم مسعود گنگوہی تخت پر ہیں اور حضرت شیخ الہند تخت سے نیچے ان دونوں کے سامنے مؤدب بیٹھے ہیں اور رو رہے ہیں، اور ہاتھ جوڑے ہوئے انتہائی نیاز مندی سے کہہ رہے ہیں کہ میں نے آپ دونوں کا کوئی حق واجب ادا نہیں کیا، اب میرے مرنے کا وقت ہے اور دونوں بزرگوں (حضرت قاسمؒ اور حضرت گنگوہیؒ) کو منھ دکھانا ہے تو میں انہیں ان کے صاحبزادوں کے بارے میں کیا جواب دوں گا؟ تم دونوں کوئی کلمہ تسلی کا میرے لیے کہہ دو کہ میں وہی کلمہ ان بزرگوں کے سامنے کہہ دوں اور قیامت کے دن یہ بزرگ خود تم سے کچھ پوچھیں تو تم بھی کلمۂ خیر کہنا کہ یہ ناکارہ خادم ہمارا خادم ہی رہا اور ہم سے الگ نہیں ہوا[1]۔

اللہ اکبر! دیکھنے کی بات یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ تو حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد اور حضرت حکیم صاحب شیخ الہند کے مرید ہیں، لیکن شاگرد اور مرید کے آگے اس قدر نیاز مندانہ طریقہ یہی وہ چیزیں تھیں جس نے پوری جماعت کو ان کے سامنے جھکا دیا تھا، جس سے حضرت قاسمؒ و رشیدؒ کے بعد بھی جماعت میں مرکزیت قائم رہی اور اب دلوں میں آئینی طور پر مرکز جماعت حضرت مولانا محمد احمد صاحب تصور کیے جانے لگے، جس کا ظہور اندرون اور بیرون معاملات میں نمایاں رہتا تھا۔

مولانا مبارک علی صاحب نائب مہتمم دارالعلوم کا بیان ہے کہ اگر کسی معاملہ

---

[1] پچاس مثالی شخصیات، ص: ۹۔

میں حضرت شیخ الہندؒ اور دوسرے اکابر کا باہم اختلاف رائے ہوتا تو حضرت شیخ الہندؒ آخری فیصلہ حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ پر چھوڑ دیتے اور مولانا محمد احمد صاحبؒ نے اس بارے میں جوں ہی ایک لفظ کہہ دیتے تو حضرت شیخ فوراً ادھر جھک جاتے تھے، اور بطور رغبت اسے تسلیم فرمالیتے، خواہ ان کی رائے کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور اس طرح اختلاف ختم ہو جاتا[1]۔

صاف گوئی اور ظاہر و باطن کی یکسانیت

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کی صاف گوئی اور ظاہر و باطن کی یکسانی معروف تھی، ہر ایک سے نہایت صاف بے لاگ اور بے جھجک کلام فرماتے، یہ ممکن نہ تھا کہ آپ کے دل میں کچھ ہو اور وہ زبان پر نہ آئے، کسی کی بات سے تکلیف ہوئی تو فوراً ناگواری کا اظہار کر دیتے، اور دل صاف ہوتا تو موم کی طرح نرم ہو جاتے، حضرت حکیم الاسلامؒ لکھتے ہیں:

> ''آپ سریع الغضب تھے، غصہ آتا تو ایک دم آتا اور ایک دم بات کھری کھری فرماتے تھے، اور دوسرے کی صفائی پیش کر دینے پر اس مجلس میں ایک دم فرو ہو جاتا اور اس معتوب پر بے حد مہربان ہو جاتے تھے اور غیر معمولی شفقت فرماتے[2]''۔

حضرت حکیم الاسلامؒ مزید لکھتے ہیں:

> ''حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کی بعض اور بھی خصوصیات ممتاز اور معروف تھیں، ان میں سب سے زیادہ نمایاں ان کے ظاہر و باطن کی یکسانی تھی، وہ اپنی فطری ساخت کے لحاظ سے اس پر قدرت ہی نہیں رکھتے کہ دل میں کچھ رکھیں اور ظاہر کچھ رکھیں، یا مکنونات قلب میں بطور تدبیر ہی کچھ کھولیں، اور کچھ

---

[1] دار العلوم دیو بند کی پچاس مثالی شخصیات، ص ۹۱۔

[2] ایضاً، ص: ۹۲۔

چھپالیں، ان کی ہر قلبی کیفیت رنج ہو یا خوشی، فوراً چہرہ پر نمایاں ہو جاتی تھی جن کو وہ فطرتاً چھپا ہی نہیں سکتے تھے"۔

کسی سے خوش ہوتے تو ظاہر و باطن خوش، رنجیدہ ہوتے تو ظاہر و باطن رنجیدہ، خلفت طبیعت بے لوث تھی، اخلاص اور اعتماد علی اللہ کا مادہ نمایاں رہتا تھا[1]۔

ان کے طریق اہتمام میں بھی رسمی تدبیر یا جوڑ توڑ یا مصلحت اندیشیوں اور دفع الوقتیوں کا نشان نہ تھا، معاملہ دوٹوک صاف صاف اور کھلا ہوا ہوتا تھا، جس سے دوست و دشمن یکساں مطمئن رہتے تھے۔

جرأت و دبدبہ

آپ کی ایک صفت آپ کی ہمت و جرأت تھی، آپ بہت عالی حوصلہ اور جری تھے، آپ کی یہ صفت کئی مقامات پر بہت کھل کر سامنے آئی، اگر طلبہ کا اختلاف دوسرے لوگوں سے ہوتا، اور لوگ طلبۂ دارالعلوم کو پریشان کرتے تو آپ یکا یک وتنہا لوگوں کے سامنے آتے اور طلبہ کی حمایت کرتے، حضرت حکیم الاسلام ؒ لکھتے ہیں:

"اسی طرح جرأت مندانہ اقدام کے سلسلے میں مراعات کے مواقع پر طلبہ کی حمایت اور پشت پناہی کرتے ہوئے ایک ایک طالب علم کے لیے سینہ سپر ہو کر پورے پورے مجامع کے سامنے تنہا آجاتے تھے، کسی کا خوف یا رعب نہیں مانتے تھے، اکثر ایسے مواقع پر یہ جملہ فرماتے کہ کیا تم نے ان طلبہ کو لاوارث سمجھا ہے، جسے ان کے سامنے آنا ہو تو سر پر توا باندھ کر آئے[2]"۔

ظاہر ہے یہ طلبہ پر ان کی شفقت اور ان کی جرأت کی اعلیٰ مثال ہے۔

ایک دفعہ ارکان شوریٰ اور دیوبند کے بعض بزرگوں کا اختلاف ہوا، اس اختلاف نے شدت اختیار کی، مجلس شوریٰ کی میٹنگ چل رہی تھی کہ کسی نے آکر یہ خبر

---

[1] دارالعلوم دیوبند کی پچاس مثالی شخصیات، ص: ۹۷-۹۸۔

[2] ایضاً، ص: ۹۶۔

دی کہ دوسری جماعت نے مسجد چھتہ کے اس کمرے پر بھی قبضہ کرلیا ہے، جو حضرت نانوتویؒ کی رہائش گاہ تھا، اور اس پر تالا ڈال دیا گیا ہے، ارباب مجلس بڑی تشویش میں مبتلا ہوگئے اور قبضہ بحال کرنے کی تدابیر پر غور کرنے لگے، مخالفین کی قوت کے پیش نظر ایسا لگ رہا تھا کہ بلا قوت قبضہ نہیں کیا جاسکے گا اور قوت نہیں تھی، بلکہ مادی قوت زیادہ تر فریق مخالف کے ہاتھ میں تھی، اسی غور وفکر کے دوران حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ مجلس سے اٹھے، اور اہل مجلس سے فرمایا کہ میں ابھی حاضر ہوا اور سیدھے مسجد چھتہ پہنچے جب کہ صحن مخالف جماعت سے بھرا ہوا تھا، کافی خطرہ کا سامان تھا، اور اس وقت کی نوعیت یہ تھی کہ جان وآبرو دونوں ہی خطرات میں گھری ہوئی تھیں، مولانا محمد احمد صاحبؒ نے اسی مجمع میں بآواز بلند خطاب کرتے ہوئے، مجمع کے صدر نشین سے کہا! حجرہ کی کنجیاں دلوایئے، مجمع پر سکوت چھا گیا، منٹ بھر کے بعد وہ بزرگ اٹھے اور حجرہ کے تالے میں کنجیاں ڈال کر اپنی جگہ آبیٹھے، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے تالا لگا کر کنجی جیب میں رکھی، اور مجلس شوریٰ میں لاکر پیش کردی کہ حجرہ پر قبضہ لے آیا ہوں، یہ کنجی حاضر ہے، ارباب مجلس اس جرأت پر حیران رہ گئے اور کہا کہ اگر آپ اطلاع کرکے جاتے تو ہم کبھی نہ جانے دیتے[1]۔

یقین محکم

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے قلب کی ایک خاص حالت تھی جب کوئی بھی حادثہ پیش آتا تو ہر تعلق اور علاقہ کو چھوڑ کر بلکہ اس سے بیگانہ محض بن کر صرف حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوجاتے اور اس پر قلبی گہرائیوں سے پورا بھروسہ کرکے ہر غیر سے اجنبی محض اور ایسے بے واسطہ ہوجاتے جیسے ان لوگوں سے انہیں کبھی کوئی معمولی واسطہ بھی نہ تھا، کچھ ایسے ہی احوال ان کی بیماری اور تکلیف پر بہت زیادہ کراہ اور ہائے ہائے اور اظہار درد وتکلیف ہوتا تھا اور بعض دفعہ بڑے بڑے شدید مرضوں

---

[1] دیکھیے پچاس مثالی شخصیات، ص ۹۷-۹۸۔

کے حملے ہوئے اور ساکت محض رہتے، عرصہ کے بعد پتہ چلتا کہ فلاں بیماری شدید آئی تھی، جو چلی بھی گئی ہے، اور کبھی دوا کا اہتمام فرماتے ورنہ عام حالات میں دوا بالکل نہیں کرتے تھے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ راوی ہیں کہ:

''ایک دن معمولی سی بیماری میں کراہنے کا سلسلہ جاری تھا تو میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ غیر معمولی طور پر یہ کراہنا کہیں توکل رضا بالقضاء کے منافی تو نہیں؟ تو ہنس کر فرمایا، نالائق ہمیں نصیحت کرنے کے لیے بیٹھا ہے اور پھر فرمایا کہ بیٹھ جاؤ، اور فرمایا کہ میں نے اپنے تین بزرگوں کو صرف دیکھا ہی نہیں بلکہ برتا ہے، میرے پیر و مرشد حضرت اقدس حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ میرے والد ماجد حضرت نانوتویؒ اور میرے سرپرست اور مربی حضرت گنگوہی بیماری کے معاملہ میں ان تینوں کے تین حال تھے، حضرت حاجی صاحبؒ کا حال تو یہ تھا کہ معمولی سی بیماری بھی آجاتی تو کول کراہ سے مکان سر پر اٹھا لیتے، بعض خدام نے عرض کیا کہ حضرت یہ عبدیت کے منافی تو نہیں؟ تو فرمایا کہ کیا میں اپنے اللہ کے سامنے بہادر بنوں؟ کہ آپ کا ہر ابتلاء اور امتحان برداشت کرنے کی مجھ میں طاقت ہے، اور میں ہر آزمائش کو اٹھا سکتا ہوں، فرمایا کہ بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ معمولی سی معمولی ابتلاء میں بھی اپنا ضعف اور عجز بے چارگی آدمی ظاہر کر دے اور عرض کر دے کہ یا اللہ میں تو بہت کمزور اور ضعیف بندہ ہوں مجھ میں تیری آزمائش اٹھانے کی طاقت کہاں، یہی عبدیت ہے۔

حضرت والد ماجد مولانا نانوتویؒ کا یہ حال تھا کہ بڑی سے بڑی بیماری آجاتی تو کسی کو پتہ نہ دیتے، اس قدر ضبط و تحمل ہوتا تھا کہ کسی کو بیماری کا احساس بھی نہیں ہو سکتا تھا، مہینوں میں اتفاقیہ اگر ضمن کلام میں حضرت ہی کی زبان سے

کبھی اظہار ہو گیا تو پتہ چل جاتا تھا کہ کسی شدید مرض کا حملہ ہوا تھا۔
عرض کیا گیا کہ ظاہر ہو جاتا تو کچھ نہ کچھ تدارک اور دفع مرض کی تدبیر ہو سکتی تھی، فرمایا حق تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بھی آئے اسے تسلیم و رضا کے ساتھ قبول کرنا چاہیے اور گردن جھکا دینی چاہیے کہ "ہر چہ از دوست می رسد نکو راست" یہ عبدیت اور فنا ہے کہ کچھ بھی ہو آدمی اف نہ کرے اور معاملہ حق تعالیٰ کے سپرد کر دے، جو کچھ کہے ان سے کہے۔ انما اشکو بثی و حزنی الی الله.
جب طبیب مطلق وہ ہے اور بیمار اور اس کی بیماری کا خبیر مطلق بھی وہی ہے تو وہی بندہ کی مصلحت سے واقف ہے، اس لیے تفویض مطلق پر عمل کرنا اور تسلیم و رضا کا شیوہ اختیار کرنا ہی مقام عبدیت ہے۔
اور فرمایا کہ حضرت گنگوہی کا حال بیماری میں یہ تھا کہ نہ تو کولتے نہ کراہتے، نہ ساکت رہتے بلکہ علاج کی طرف زیادہ توجہ ہوتی اور اہتمام ہوتا کہ طبیب کو بلاؤ اور دوا کا انتظام کرو اور پرہیز یہ ہونا چاہیے اور غذا فلاں ہونی چاہیے اور فرماتے کی بیماری میں علاج کا اہتمام سنت ہے اور سنت کی پیروی ہی مقام عبدیت ہے کہ آدمی اپنا طبعی جذبہ چھوڑ کر شریعت کے اوامر کی پیروی کرے اور مقام طبیعت سے ہجرت کر کے وطن شریعت میں جا بسے کہ یہی بندگی اور یہی مقام عبودیت کا تقاضا ہے، غرض بندگی اور عبدیت کے مختلف چولے نکلے، یہی بندگی اور عبدیت ایک جگہ اظہار ضعف و بے چارگی کے چولہ میں نمایاں ہوئی اور ایک جگہ تفویض اور تسلیم و تربیت کی شکل میں ظاہر ہوئی اور ایک جگہ اتباع سنت اور پیروی شریعت کی صورت میں کھلی اور تینوں رنگ بلاشبہ اپنی اپنی جہت سے عبدیت ہی کے ہیں۔
حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے یہ تین واقعہ سنا کر فرمایا کہ جب میں بیمار

ہوتا ہوں تو کبھی تو حضرت پیر و مرشد کے حال کی پیروی کرتا ہوں، کبھی اپنے حضرت قبلہ والد ماجد کے حال کی اور کبھی اپنے مربی اور استاذ حضرت گنگوہیؒ کے حال کی اور یہ تینوں حال چوں کہ عبدیت کے ہیں اس لیے میں کسی حال کی بھی پیروی میں عبدیت ورضا بالقضاء سے الگ نہیں ہوتا[1]۔

اس واقعہ سے حضرت کی للّٰہیت اور عبدیت صاف طور پر نمایاں ہوتی ہے، حضرت حکیم الاسلامؒ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ کیفیات ان ہی قلوب پر طاری ہوسکتی ہیں جنہوں نے محنتیں کر کے اخلاص للّٰہ کا مقام رفیع پر حاصل کرلیا، وہ اسی کا اثر تھا کہ باوجود یکہ حق تعالیٰ نے دنیوی لحاظ سے سب کچھ دیا تھا، جان بھی اور مال بھی اور مال کے سلسلہ میں جائیداد، باغ، مکانات، سب ہی کچھ تھے اور آخر میں حیدر آباد کی عدالت عالیہ کے مفتی کی حیثیت سے ایک ہزار روپے ماہوار مشاہرہ بھی تھا ڈھائی سو روپیہ ماہوار سرکاری منصب بھی تھا جو بہت پہلے سے حیدر آباد سے جاری تھا لیکن روپیہ پیسہ سے لگاؤ کبھی نہیں ہوا، نئے سکوں میں جب یہ چوڑی دونی جو چوکور اور گول کونوں کی ہے چلی اور اس کے ساتھ نئی اکنی گول اور جھالردار کناروں کی چلی تو ان کے چلن سے بہت کافی عرصہ کے بعد ایک دن کسی کے ہاتھ میں یہ نئی دونی اکنی دیکھ کر فرمایا کہ کیا یہ سکہ ہے اور کیا یہ ہندوستان ہی میں چلتا ہے؟ اس پر ہم سب ہنسنے لگے تو انہیں اس ہنسی پر حیرت ہوئی، جیب میں کبھی نہیں رکھتے تھے اور نہ عام حالات میں پیسہ کو کبھی چھوتے تھے، دار العلوم کی تنخواہ نہ کبھی خود وصول کی نہ انہیں یہ پتہ رہتا تھا کہ کتنی تنخواہ ہے یا زمین یا باغ کی کتنی آمدنی ہے، کس طرح ہے اور کون لاتا ہے[2]۔

---

[1] دیکھیے: پچاس مثالی شخصیات، ص ۱۰۵-۱۰۷۔

[2] پچاس مثالی شخصیات، ص: ۱۰۷۔

اکابر واسلاف کا ذکر

آپ کی مجلس اکابر واسلاف کے تذکرے سے لبریز رہتی تھی، حضرت حکیم الاسلامؒ لکھتے ہیں:

"مجلس میں زید عمر بکر کا ذکر کاذب نہیں ہوتا بلکہ اکابر واسلاف کے واقعات بکثرت بیان فرمایا کرتے تھے اور ان کی سیرت وسوانح محفوظ بھی بہت تھی، مجلس زیادہ تر بیان احوال وبیان مسائل ودلائل سے معمور ہوتی تھی، رمضان شریف میں تراویح کے بعد کی مجلس ایک یادگار مجلس ہوا کرتی تھی، جس میں حضرت ممدوح حضرت شیخ الہندؒ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ اور دوسرے اساتذہ وطلبہ شریک ہوتے تھے، اور اس میں ایمان تازہ کرنے والی باتیں ہوا کرتی تھیں، مجھے جس قدر بھی اکابر کے واقعات محفوظ ہیں زیادہ تر انہیں مجالس کی شرکت کا نتیجہ ہیں، مجلسیں کبھی کبھی درسگاہ نودرہ کے سامنے صحن میں اور کبھی احاطہ مسجد میں منعقد ہوا کرتی تھیں، جب کہ مسجد مدرسہ زیر تعمیر اور آخر میں دارالمشورہ میں ہونے لگی تھیں[1]۔

دارالعلوم کا کام اسی طرح حسن نظام سے چل رہا تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کی روانگی حج اور اسی دوران اسیر مالٹا کا مرحلہ پیش آگیا جس میں پانچ سال کی مدت صرف ہوگئی اور واپسی پر پانچ چھ ماہ حیات رہ کر حضرت نے داعی اجل کو لبیک کہا اور واصل بحق ہوئے تو یہیں سے دارالعلوم کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا، اور اب دارالعلوم کی قوت کا مدار ومرکز تنہا حضرت صاحب ٹھہر گئے اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ان کے حبیب خاص اور ان کے مخلص معاون ہوئے، صدارت تدریس پر علامہ دہر فرید عصر یگانہ زمانہ عالم بے بدل فاضل بے مثل محدث وقت حافظ حدیث حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ متمکن ہوئے جو ان دونوں بزرگوں کے

[1] دارالعلوم کی پچاس مثالی شخصیات، ص ۱۰۹۔

شاگرد اور طبقہ تلامذی میں سے تھے، حضرت شیخ الہند تو مولانا محمد احمد صاحب کی غیر معمولی توقیر باوجود خود استاذ ہونے کے ان کی مخدوم زادگی کی عظمت کی بناء پر کرتے تھے اور حضرت شاہ صاحب ان کی توقیر وتکریم علاوہ اس صاحبزادگی کی عظمت کے خود اپنا استاذ ہونے کی حیثیت سے بھی کرتے۔

ادھر حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ ان کے علم وفضل تقوی وتقدس حفظ فہم اور وجاہت وعزت کی بناء پر باوجود شاہ صاحب کے شاگرد ہونے کے استادوں جیسی توقیر سے پیش آتے، اس لیے دار العلوم کی ترقیات میں بجائے کسی کمی کے اور اضافہ ہوا اور اس کے حلقہ اثر کی ہمہ گیری روز افزوں ہوتی رہی، حضرت شاہ صاحبؒ اور ان کی اطاعت کو اپنا فخر سمجھتے تھے اور وہ شاہ صاحب کی موجودگی کو دار العلوم کے لیے باعث فخر سمجھتے اور ان کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے، اسی قلبی یگانگت سے دار العلوم کی عظمت وشان دنیا کی نگاہوں میں پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔

سخاوت

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ اعلی درجہ کے فیاض اور سخی تھے، ان کا دستر خوان بڑا کشادہ تھا، شاید ہی ایسا کوئی دن ہو، جس میں ان کے یہاں کسی نے کھانا نہ کھایا ہو۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ رقم طراز ہیں:

> ’’دار العلوم کے اساتذہ وطلبہ پر حد درجہ شفیق تھے، کتنے ہی طلبہ کی شادیاں بھی آپ کی گود میں ہوئیں، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کی شادی ہوئی تو دس سال تک ان کو اپنے یہاں مہمان رکھا، اور کھانا بھی اپنے ساتھ کھلاتے، حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ بھی کئی سال تک آپ کے گھر مہمان رہے[1]‘‘۔

---

[1] پچاس مثالی شخصیات، ص ۱۰۱۔

ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

''سخاوت اور فراخدلی کی مثال تھی، مہمانداری اور مہمان نوازی میں شغف تھا، روزانہ دو چار دس مہمان دستر خوان پر ہوتے تھے جس دن کوئی مہمان نہ ہوتا تو مدرسہ کی چھٹی ہونے پر دروازہ مدرسہ پر کچھ دیر رک جاتے اور اساتذہ میں سے جو گزرتا اسے گھر ساتھ لے آتے اور کھانے میں شریک فرماتے، مولانا عبیداللہ سندھی اور حضرت قبلہ مولانا العلام محمد انور شاہ قدس سرہ کو دس سال تک اپنے سے جدا نہیں ہونے دیا، اپنے ساتھ ہی کھانا کھلاتے اخلاص اور اعتماد علی اللہ میں راسخ القدم تھے اور دوسری ممتاز اخلاقی قوتیں آپ کی شیوہ ہوگئی تھیں''۔[1]

طلباء پر شفقت

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کو دارالعلوم سے غیر معمولی تعلق اور انس تھا، اسی تعلق کا نتیجہ تھا کہ وہ طلبہ کی سہولیات کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے، اگر کسی طالب علم کا کسی مقامی باشندے سے اختلاف ہوتا، تو طلبہ کی حمایت میں سینہ سپر ہو جاتے اور یہ بھی فرماتے: کیا تم نے ان طلبہ کو لاوارث سمجھا ہے۔

حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ لکھتے ہیں:

''اگر کسی طالب علم کی وفات ہوتی تو اس کے کمرے کے سامنے بیٹھ کر تعزیت لیتے، اور جب تک اس کی تکفین و تدفین نہ ہو جاتی، گھر واپس تشریف نہ لاتے، گویا طلبہ کے ساتھ اولاد کا سا معاملہ تھا''۔[2]

شاہ صاحبؒ اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''(حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ) قرآن اور مسجد کے احترام میں منفرد

---

۱ پچاس مثالی شخصیات، ص ۹۷۔

۲ لالۂ و گل: ص ۳۶۔

تھے، حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے سنا ہے کہ دار العلوم کی مسجد میں مغرب کی نماز ادا فرمائی، نوافل سے فراغت پر گھر تشریف لے چلے تو ایک طالب علم کو مسجد میں لیٹے ہوئے دیکھا جس کے پاؤں بجانب قبلہ تھے، مولانا محمد احمد صاحبؒ نے وہیں دستی تنبیہ فرمائی، اور امداد طعام بھی مدرسہ سے بند کر دی گئی، اس وقت دار العلوم کا کاروبار وسیع نہیں تھا، ادھر بندش طعام کا حکم جاری ہوتا ادھر اس کے اثرات سامنے آجاتے، دو روز کے بعد کسی ضرورت سے مولانا محمد احمد صاحبؒ گشت کے لیے نکلے تو یہ طالب اپنے کمرے میں چھپا ہوا درخت کے پتے کھا رہا تھا، دریافت کرنے پر بتایا کہ حضرت نے امداد بند فرمادی، مرحوم پر گریہ طاری ہوگیا اور بہت دیر تک خود وہ طالب علم کے ساتھ مصروف بکا رہے، طالب علم کی خوش قسمتی کہ اسی وقت آستانہ عالیہ سے کھانا جاری ہوا[1]"۔

یہ واقعہ اپنے اندر صدق واخلاص کے کئی اہم مناظر رکھتا ہے۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ:

۱- حضرت فخر الاسلام رحمۃ اللہ علیہ شعائر اسلام کا حد درجہ احترام فرماتے تھے، طالب علم کے بجانب قبلہ پیر پھیلانے پر اتنے ناراض ہوئے کہ دستی تنبیہ بھی فرمائی اور کھانا بھی بند کر دیا، حالاں کہ طلبہ پر آپ کی شفقت معروف و مشہور ہے۔

۲- آپ طلبہ کے احوال کی نگہداشت اور دیکھ ریکھ میں کوتاہی نہیں فرماتے تھے، یہی وجہ ہے کہ کمرہ میں چھپ کر پتہ کھانے والے طالب علم کے احوال سے بھی آپ واقف ہوگئے۔

۳- اس وقت کے طلبہ کا اخلاص فی العلم دیکھیے کہ پتہ کھانا گوارہ کرلیا مگر علم سے

---

[1] لالہ وگل: ص ۳۵۔

رشتہ نہیں توڑا، اس طرح کے واقعات راہِ علم میں سلف کی خارا شگافی اور غیر معمولی صبر و تحمل کی یاد تازہ کرتے ہیں، یہ واقعہ ہے کہ دار العلوم کی عظمت و شوکت کا محل، اسی طرح کے اخلاص و وفا اور صدق و صفا سے بنے ہوئے کرداروں نے تراشے ہیں۔

۴- یہ واقعہ حضرت فخر الاسلامؒ کی طلباء پر شفقت و عنایت پر بھی شاہد عدل ہے، آپ سے طالب علم کی یہ حالت دیکھی نہیں گئی، آپ مصروف گریہ ہو گئے اور طالب علم کا کھانا جاری فرمایا۔

لیکن شفقت کے ساتھ ساتھ تربیتی امور سے غفلت بھی نہیں برتتے تھے ضرورت پڑتی تو تادیبی کاروائی بھی کرتے تھے، حضرت حکیم الاسلامؒ لکھتے ہیں:

''تربیت کی ایک خاص شان تھی، جو انتظامی رنگ میں نمایاں ہوتی تھی، آنکھ کی گھورسے بہت کام لیتے تھے جس کا اثر قلوب پر پڑتا تھا، جزئی جزئی منکرات میں طلبہ پر روک ٹوک فرماتے تھے اور بعض اوقات درسگاہ نوردرہ کے سامنے صحن دار العلوم میں ایسے طلباء کو زدوکوب کراتے اور پھر فہمائش نصیحت فرماتے[1]''۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے تعلق

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کو حضرت شاہ صاحبؒ سے بے پناہ تعلق اور شغف تھا، آپ حضرت شاہ صاحبؒ کے علم و فضل، تقوی و تقدس، حفظ و فہم اور اخلاص و للّٰہیت کے بڑے مداح تھے، حضرت شاہ صاحبؒ نے جب ہندوستان سے حجاز ہجرت کا ارادہ فرمایا تھا اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ نے شادی کی تدبیر سے شاہ صاحبؒ کو روکنا چاہا تو حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ ہی کے اثر و وجاہت سے یہ تدبیر کامیاب ہو سکی۔

---

[1] پچاس مثالی شخصیات، ص:۹۷۔

جب حضرت شاہ صاحبؒ کی شادی ہوئی تو حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے شاہ صاحبؒ کو اور ان کی اہلیہ کو اپنے گھر اتارا، شاہ صاحبؒ کی اہلیہ کو بہو کی طرح دس سال تک گھر میں رکھا، اور ہر چیز کا انتظام فرمایا۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ رقم طراز ہیں:

''حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کا شغف حضرت شاہ صاحبؒ سے اس درجہ بڑھا کہ دارالعلوم کی ترقی کی خاطر حضرت شاہ صاحبؒ کو دس سال تک اپنا مہمان رکھا اور ان کے کھانے کا بار دارالعلوم پر ڈالنا گوارا نہیں فرمایا، ان کی ضروریات کی رعایت فرماتے حتی کہ آخر میں حضرت شاہ صاحبؒ کی شادی بھی خود ہی کی اور ان کی اہلیہ محترمہ کو بحیثیت دلہن اپنے یہاں اتر اولیمہ کیا اور گھر پر رکھا''۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی، حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بے انتہا عزت واحترام فرماتے، درج ذیل واقعہ آپسی تعلقات کے کئی گوشوں کو ایک ساتھ نمایاں کرتا ہے۔

حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ ''نقش دوام'' میں لکھتے ہیں:

''دارالعلوم دیوبند کے داخلی قضیہ کے دوران مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے براہِ راست یہ روایت میں نے سنی کہ شاہ صاحبؒ ہنگامہ کے شبابی اوقات میں دیوبند سے کشمیر روانہ ہوئے اور کشمیر میں طویل قیام کے بعد جب دیوبند واپسی ہوئی تو مولانا محمد احمد صاحبؒ ابن حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے تعلقات میں پیدا شدہ فاصلہ کو سمیٹنے کی ایک نئی صورت نکالی، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ حضرت شاہ صاحب کے استاذ بھی تھے، جس روز شاہ صاحبؒ کشمیر سے دیوبند پہونچے، تو مولانا محمد احمد صاحبؒ تنہا رہائشی مکان پر پہونچ گئے، شاہ صاحبؒ مولانا محمد احمد

صاحبؒ کوتشریف لاتے ہوئے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے، مولانا محمد احمد صاحبؒ نے کھڑے کھڑے فرمایا کہ:

''شاہ صاحب! آپ پر میرا کچھ حق ہے یا نہیں''

شاگرد سرو قد کھڑا ہو گیا اور عرض کیا کہ:

''حضرت! اگر آپ میری چمڑی کو جوتہ بنا کر پاؤں میں پہن لیں تو بھی آپ کا حق ادا نہیں ہو سکتا''۔

استاذ کا منور چہرہ ایک سعادت مند شاگرد کا جواب سن کر مسرتوں سے جگمگایا، حکم ہوا اگر یہ بات ہے تو ابھی دارالعلوم تشریف لے چلیے بلا چوں و چرا اس حکم کی تکمیل کی گئی[1]۔

اس واقعہ سے دونوں کے آپسی تعلقات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ والیانِ ملک کی نظر میں

حضرت فخر الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی ذات اس دور میں پوری جماعت کے لیے ذمہ دار کی حیثیت رکھتی تھی، آپ کو جماعت کے تمام اکابر و اصاغر کا اعتماد حاصل تھا، اس آپسی خوشگوار تعلقات اور باہمی احترام و توقیر سے دارالعلوم کو بہت فائدہ ہوا، مختلف ریاستوں کے ذمہ داروں نے دارالعلوم کے احوال سے دلچسپی لی، دارالعلوم کے وفود بلائے اور ہر ممکن خدمات بھی پیش کیں، حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اس باہمی اعتماد و باہمی توقیر و عظمت اور آپس کے خوشگوار تر تعلقات نے دارالعلوم کو بہت آگے بڑھا دیا اور اب اس کے اثرات علمی حلقوں سے گزر کر حکام اور والیان ملک پر بھی پڑنے لگے، نواب صاحب بہاول پور نے

---

[1] نقش دوام، ص ۱۰۷۔

حضرت مولانا محمد احمد صاحب کو مدعو کیا، اور آپ ایک وفد کی صورت میں بہاول پور تشریف لے گئے، ریاست نے دارالعلوم کی کافی خدمت کی اور حضرت ممدوح کو نواب صاحب کے دربار سے خلعت عطا ہوا تھا، یہ واقعہ حضرت گنگوہیؒ کی حیات کے زمانہ کا ہے"۔

اس کے بعد نواب ڈھاکہ نواب سلیم اللہ خاں صاحب نے ڈھاکہ میں دارالعلوم کا ایک وفد مدعو کیا، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے اس کے افراد کی تعیین فرمائی۔

اس میں حضرت تھانویؒ حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحبؒ حضرت مدنیؒ (حسن اتفاق سے اس وقت مدینہ طیبہ سے آئے ہوئے تھے) اور دارالعلوم میں مقیم تھے، اور بھی متعدد بزرگ تھے، وفد کا کچھ قیام کلکتہ رہا اور وہاں کی فضا علم سے سیراب ہوتی رہی، پھر ڈھاکہ پہنچا، نواب سلیم اللہ خاں نے ان اکابر کی بہت کچھ آؤ بھگت کی اور ان کی علمی و عملی فیوض سے استفادہ کیا۔

اسی طرح والیٔ بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم نے حضرت مولانا محمد احمد صاحب کو دعوت دی اور دارالعلوم کی کافی مدد کی، ڈھائی سو روپے ماہوار مستقل امداد بھی بھوپال سے جاری ہوئی۔

مسٹر مانٹیگو وزیر ہند جب انگلستان سے ہندوستان آئے تو حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے مسلمانوں کے پرسنل لاء کے تحفظ اجراء کے سلسلہ میں ایک وفد کے ساتھ ان سے دہلی جا کر ملاقات کی اور محکمہ قضاء قائم کرنے پر زور دیا، اس وفد نے دیوبند کے متعدد فضلاء ساتھ لئے اور آخر کار اس کا اثر حکومت نے قبول کرتے ہوئے یادداشت مانگی جسے آپ نے پیش فرمایا اور معاملہ عرصہ تک چلتا رہا"۔[1]

❁❁❁

[1] پچاس مثالی شخصیات، ص ۱۰۵-۱۱۱۔

بارہواں باب

حضرت فخر الاسلامؒ کی تحریریں

صاحب زادہ حجۃ الاسلام فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق مہتمم دارالعلوم دیو بند نے بہت کم لکھا یا کم محفوظ رہا کیوں کہ جو تحریرات ہمارے سامنے ہیں فتوؤں کو چھوڑ کر (جن کا ذکر مستقل باب کے تحت کیا گیا) چھ یا سات تحریرات ہی دستیاب ہیں البتہ دارالعلوم کے محافظ خانہ میں کچھ تحریرات کے پائے جانے کا امکان تھا وہاں رجوع کرنے پر یہ جواب ملا کہ وہاں کی تحریرات اس قدر بوسیدہ ہیں جن سے استفادہ کسی صورت میں ممکن نہیں موجودہ تحریرات میں تقریباً چار تحریرات وہ ہیں جو دارالعلوم کے رسالہ ''القاسم والرشید'' میں وقتاً فوقتاً استقبال عرضداشت آمد رمضان اور تربیت طلبہ کی صورت میں شائع ہوئیں ان تمام تحریرات کا محور دارالعلوم ہے ایک تو اعلیٰ حضرت خلد اللہ کا دارالعلوم میں استقبال ہے اور دارالعلوم کے لیے مالی امداد پر ان کا شکریہ اور عزت وجلال وترقی وعمر درازی کی دعاء کے الفاظ کچھ اس طرح:

''اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ کی ان گراں مایہ انعامات ثواب نعم کے تشکر وامتنان کے اظہار کے لیے ہم فقیروں کے پاس بجز دعاء ہائے سحری کے اور کیا ہے ہندوستان کے مسلمانوں نے عموماً اور حامیان دارالعلوم سے جن کی تعداد

بحمد اللہ اس وقت لاکھوں سے متجاوز ہے ہم امید کرتے ہیں کہ دولت آصفیہ حماہا اللہ تعالیٰ اور اس کے خسرو عالی تبار رفیع الجناب منیع القدر ادام اللہ سلطنۃ کے عروج آفتاب اقبال و عزت جلال و ترقی و عمر درازی کے لیے متفق ہو کر دعاء کریں" شعر

تا جہاں باشد بہ نیکی در جہانت باد نام
ایں دعاء برانس و جاں گشت از دل و جاں فرض ہم

اس پوری تحریر میں حضرت فخر الاسلامؒ نے سلاطین دکن کی دار العلوم کے تئیں مالی خدمات کو سراہا اور تہنیت و قصائد سے نوازا ہے جیسا کہ ایک منتظم کا فرض ہے۔

اس سلسلے کی دوسری تحریر دار الحدیث کی عرضداشت ہے جس میں جمیع مسلمین کو مخاطب کر کے بڑے ہی فلسفیانہ انداز میں دار الحدیث کی تعمیر کے لیے تعاون کرنے کی درخواست کی ہے سب سے پہلے علم حدیث اور اس کی اہمیت پر مختصر گفتگو کرتے ہوئے حدیث کی مختلف درسگاہوں کا تذکرہ کیا ہے پھر دار الحدیث کے لیے تعاون کی درخواست یوں کی ہے:

"ہمیں امید ہے کہ اب بھی اسی جوش و رغبت سے مسلمان متوجہ ہوں گے بار بار عرضداشتیں پیش کرنے اور توجہ دلانے کی ضرورت نہ پڑے گی جس قدر تعویق اس میں ہو چکی ہے اس کی تلافی اس طرح کر دی جائے گی کہ مسلمانوں کا ہر ایک طبقہ یک لخت اس کی طرف متوجہ ہو جائے اور دکھلا دے کہ ابھی ان میں اسلامی روح موجود ہے وہ علم حدیث کی قدر دانی اور رأس المال ایمانی کہ حفاظت میں اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کو ذریعہ فوز فلاح سمجھتے ہیں"۔

یہاں دار الحدیث کا مجوزہ نقشہ بھی تحریر فرمایا ہے اور اس کی تکمیل کے مفید مشورے بھی دیئے ہیں۔

''دارالحدیث کے ۱۳؍ کمرے چھوٹے بڑے ہیں سب سے بڑا کمرہ ۶۸؍ فٹ طول ۳۵؍ فٹ عرض کا ہے ہر ایک کمرے کا تخمینہ جدا کر دیا گیا ہے مسلمانوں میں والیان ملک سے عام درجہ تک مختلف طبقات ہیں امداد کی صورتیں بھی مختلف ہیں کوئی صاحب ایک دو کمرے کے مستقل متکفل ہو جائیں کسی ضلع، شہر، قصبے کے باشندے مل کر کوئی کمرہ بنائیں عام مسلمان قلیل و کثیر رقم سے امداد فرمائیں خدام دارالعلوم منشاء اہل خیر کا اتباع کریں گے''۔

اور آخر میں گورنمنٹ و گورنر وغیرہ کا بھی شکریہ ادا کیا گیا ہے

''دارالعلوم کا ان مشکلات حالیہ پر غالب آنا گورنمنٹ عالیہ کی خاص عنایات ہز آرنر نواب لفٹنٹ گورنر صوبہ متحد سر جیمس میسٹن بہادر کی فوق الفوق توجہات حکام ضلع کہ بیش بہا امداد کا نتیجہ ہے جس کا ادنی کرشمہ گندے نالے کا سرزمین دارالعلوم سے بالکل جدا کر دینا ہے ناسپاسی ہوگی اگر ہم دل و جان سے منت بذری اور شکر گذاری نہ کریں۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین''۔

دارالعلوم کی موجودہ دارالحدیث وہی ہے جس کو فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند نے عرض داشتیں کر کے تعمیر کرایا تھا جو آج بھی اپنی شان و شوکت اور علمی فیوض و برکات کی ایک اعلیٰ مثال ہے اور پچھلے ۷۵؍ برسوں سے ایسی مضبوط اور اٹل ہے جیسا ایک مؤمن کامل کا ایمان، یہ تعمیر فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے دور اہتمام کی سب سے دل کش اور جاذب عمارت ہے تاریخ دارالعلوم میں اس پر کچھ اس انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے:

''جس طرح دارالعلوم دیوبند کو یہ شرف و امتیاز حاصل ہے کہ ہندوستان بھر میں یہ وہ پہلی درسگاہ ہے جو عین زوال علم کے وقت مسلمانوں کے عام چندے سے قائم ہوئی اسی طرح اس کو یہ تقدم و فضیلت بھی حاصل ہے کہ

دارالعلوم کا دارالحدیث ہندوستان میں پہلی عمارت ہے جو اس نام سے عالم وجود میں آئی اس میں شک نہیں کہ اسلامی عہد کے ہندوستان میں جا بجا مدارس موجود تھے اور ایک ایک ذرہ علم کی روشنی سے منور تھا لیکن مدارس کی اس کثرت و بہتات کے باوجود ہندوستان میں کوئی عمارت دارالحدیث کے نام سے اس سے پیشتر نہیں بنی، ہندوستان کی سرزمین پر یہ پہلا موقع تھا کہ دارالحدیث کے نام سے ایک بڑی عمارت بنانے کا فیصلہ کیا گیا''۔

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کی اس سلسلے کی تیسری تحریر آمد رمضان ہے جس میں رمضان کے آمد کی بشارت ہے اس کے فیوض و برکات سے لوگوں کو آگاہ کیا ہے اس مقالے کی شروعات ایک باموقع شعر سے کی گئی ہے ؎

اے مومنو! نوید ہے دریائے عام کی
آئے ہیں دن صیام کے راتیں قیام کی

اس کے بعد باقاعدہ طور پر رمضان المبارک کی اہمیت پر اس قدر خوبصورت نثر سے سماں باندھا ہے جس کا متحمل رمضان جیسا عظیم مہینہ ہی ہو سکتا ہے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''آسمان پر رمضان المبارک کا چاند جلوہ گر ہے زمین اس کی نورانیت سے جگمگا رہی ہے جود وسخا کی مخمل کا فرش بچھا ہوا ہے رافت کے فوارے جوش زن عنایت کے گلدستے رکھے ہوئے مغفرت کے پھنکے کھنچ رہے ہیں قلم کے شامیانے تنے ہوئے ہیں نور کی قندیلیں روشن ہیں رحمت کے گلاب پاش چھڑ کے جا رہے ہیں بندہ نوازی کی گھٹائیں اُمڈی چلی آ رہی ہیں انعام وعطا کی بارش کا آغاز ہے، نسیم رحمت سن سن چلتی ہے اور دلوں کی خزاں رسیدہ کلیوں کو اپنی مسیحائی سے زندہ جاوید بنا دیتی ہیں، تیس دن تک یہی برکات ہیں دن عید اور رات شب برات ہے منادی ندا کرتا ہے

کہ اے رضائے مولیٰ کے طلب کرنے والو! اس دربار میں شریک ہو جاؤ، گنہگارو! گناہ سے باز آجاؤ"۔

رمضان کا استقبال اس سے خوبصورت نثر میں کیا ہوسکتا ہے۔

اس کے بعد رمضان میں صدقہ وزکوٰۃ کی فضیلت پر روشنی ڈالتے ہوئے موصوف اپنے مقصد اصلی کی طرف رجوع ہوتے ہیں جیسا کہ مذکورہ صفحات میں ذکر کیا گیا کہ موصوف کی تمام تحریروں کا محور دارالعلوم ہی ہے اور ہونا بھی چاہیے کیوں کہ موصوف ہی اس کے منتظم ہیں اسی لیے تمام تحریروں میں خواہ عنوان کچھ بھی ہو دارالعلوم کا ذکر ضروری ہے کیوں کہ اس وقت دارالعلوم مالی اعتبار سے اس قدر مضبوط نہیں تھا جتنا کہ آج ہے اس لیے مالی امداد کی درخواست ضرور کرتے ہیں:

"ہماری درخواست ہے اس ماہ مبارک میں جب آپ زکوٰۃ وصدقات فرض یا نفل ادا کریں تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان روحانی فرزندوں اور اپنے مقتدر مہمانوں کو بھی یاد رکھیں جو اپنے وطن اور اعزاء کو چھوڑے ہوئے غربت کی حالت میں ہماری زیرنگرانی اپنے پاکیزہ مقصد تحصیل علوم دینیہ میں لگے ہوئے ہیں اور دنیا کے عیش وآرام کو انھوں نے اس ایک مقصد پر قربان کر کے دین واسلام کے احیاء اور بقاء کے لیے اپنی جانوں کو وقف کر دیا ہے"۔

دارالعلوم ہی فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کا اوڑھنا بچھونا ہے اسی لیے انھوں نے اپنی پوری زندگی وقف کر دی یہ پہلے مہتمم ہیں جن کے ذریعہ دارالعلوم ملکی سطح پر مکمل طور پر متعارف ہوا اور اس کی شہرت بیرون ملک بھی شروع ہوگئی جس کی تکمیل ان کے فرزند ارجمند حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے دور اہتمام میں ہوئی یہی دراصل دارالعلوم کا کلائمیکس ہے۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے دارالعلوم کی کہانی کی ابتداء

ہوئی فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ اس کا وسط ہیں اور حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اس کا منتہی، یہ دور دار العلوم کے عروج کا منتہائے کمال ہے، خدا اس کو استقلال بخشے آمین۔ حالاں کہ

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے دور اہتمام میں تعمیری سلسلہ اس دار الحدیث تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ دار العلوم کا تعمیری سلسلہ بہت آگے تک پہنچا آپ کے دور تک دار العلوم میں ''نودرہ'' نام کی صرف ایک ہی عمارت تھی یہی دار العلوم کا بنیادی اثاثہ تھا جس میں طلبہ کی درسگاہیں بھی اور قیام گاہ بھی قیام کے لیے باقاعدہ کوئی عمارت نہ تھی طلبہ کی ضرورت کے لحاظ سے یہ عمارت نہایت تنگ تھی چناں چہ فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ اس سلسلے میں کافی متفکر تھے آخر کار آپ کے تفکر نے عملی جامہ پہنا اور دار العلوم کی تعمیرات کا سلسلہ شروع ہوا، سب سے پہلے دار الطلبہ کی تعمیر کا آغاز ہوا آپ نے اس تعمیر کے لیے اہل خیر مسلمانوں سے تعاون کی اپیل کی مسلمانوں نے اس کار خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس تعمیر میں نواب شاہ جہاں بیگم والی بھوپال کا نام قابل ذکر ہے انھوں نے دار الطلبہ کی تعمیر کے لیے ایک گراں قدر رقم عنایت فرمائی، حیدر آباد کے مسلمانوں نے بھی دل کھول کر حصہ لیا، مولوی شوکت حسین صاحب نے دار العلوم کی اپیل پر حیدر آباد دکن سے اپنی جدو جہد سے سات ہزار روپے چندہ کر کے کمروں کے تعمیر کے لیے بھیجے، اس طرح یہ عمارت پایۂ تکمیل کو پہونچی۔

آپ کے دور کی دوسری اہم تعمیر کتب خانہ ہے اس سے پہلے کتب خانہ ''نودرہ'' کے کچھ کمروں میں محدود تھا چونکہ کتابیں محدود تھیں اس لیے کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی؛ مگر جب فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ دور اہتمام میں

دار العلوم کی چہار طرفہ شہرت ہوئی اس کی طرف طلبہ کا سیلاب اُمڈا، کتابوں میں بھی روز افزوں اضافہ ہونے لگا، نودرہ کے کمرے ناکافی ثابت ہوئے مستقل کتب خانہ کی ضرورت محسوس ہوئی؛ کیوں کہ کتب خانہ یا لائبریری ایک ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر کوئی مدرسہ یا یونیورسٹی مکمل نہیں سمجھی جاتی، فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ جیسا مفکر شخص اس ضرورت کو کیونکر محسوس نہ کرتا، اسی کے پیش نظر ۲ر صفر المظفر ۱۳۲۴ھ کو ایک بڑے مجمع میں اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا، یہ عمارت دو منزلہ ہے، نیچے دار الصنائع وغیرہ ہیں اور اوپر کی منزل میں کتب خانہ ہے، جس میں فرش سے چھت تک الماریاں لگی ہوئی ہیں، الحمدللہ آج اس کتب خانہ میں دنیا کی دینی و علمی کتابوں کا نادر و نایاب ذخیرہ موجود ہے، اور یہ سب فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کی محنتوں کا نتیجہ ہے۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء.

اس کے بعد اسی دور میں مسجد قدیم کی تعمیر کا آغاز ہوا اس سے پہلے طلبہ نماز قرب و جوار کے مساجد میں اداء کرتے تھے جس سے طلبہ کا تعلیمی نقصان ہوتا اور بارش وغیرہ میں مزید دقتیں پیش آتیں، اس کے علاوہ طلبہ کی بڑھتی ضروریات خود اس کی متقاضی تھیں کہ دار العلوم کے احاطہ میں ایک مسجد ہو، اگر چہ دار الطلبہ کی تعمیر کے مجوزہ نقشہ کے ساتھ ہی اس اہم ضرورت کا بھی اعلان کیا جا چکا تھا، مگر مالی مشکلات کی وجہ سے اس تعمیر کو التواء میں رکھا گیا، چناں چہ رجب ۱۳۲۵ھ میں زمین خریدی گئی اور اس کے ایک سال بعد مسجد کی تعمیر کا انتظام بھی کر دیا گیا ۴ر ربیع الاول ۱۳۲۷ھ کو مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا، یہ مسجد سنگ آرٹ کا بہترین نمونہ ہے۔

دار جدید جیسی پرشکوہ و عالی شان عمارت کی بنیاد بھی فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے ہی دور میں رکھی گئی جس کی تکمیل آپ کے لائق فرزند حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کے دور میں ہوئی۔

---

[1] اس کی تفصیل تاریخ دار العلوم، ج ۱ ص ۲۵۵ پر مذکور ہے۔

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے دورِ اہتمام میں جہاں دار العلوم تعمیری اعتبار سے کافی مضبوط و مستحکم ہوا، وہیں کئی اہم شعبوں کا قیام عمل میں آیا یہی مصروفیات ہیں جن کی وجہ سے فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ جیسی عبقری شخصیت کی تحریرات اس قدر کم ہیں کیونکہ آپ دار العلوم کی انتظامی تعلیمی و تعمیری و تدریسی امور میں اس قدر مشغول رہے کہ آپ کو مستقل تحریرات کا موقعہ نہ ملا، حالاں کہ ماہنامہ ''القاسم'' جیسے رسالہ کا اجراء آپ ہی کی ایماء پر عمل میں آیا اس کے باوجود اپنی عدیم الفرصتی کی بناء پر آپ زیادہ نہ لکھ سکے مگر جو کچھ لکھا یا محفوظ ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اگر آپ کو انتظامی و تدریسی امور سے فرصت ملتی تو آپ کی تحریرات کا سلسلہ ایک یادگار اور قابل استفادہ ورثہ ہوتا یہاں تحریرات کے باب میں تعمیرات وغیرہ کا اس لیے ذکر کیا گیا تا کہ قارئین اندازہ کر سکیں کہ وہ کونسی مصروفیات تھیں جن کی وجہ سے فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے اس قدر کم لکھا یہاں تعمیرات کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا گیا حالانکہ تعمیرات کا مفصل ذکر باب ہفتم میں کر دیا گیا ہے۔

ضابطہ جامعہ نظامیہ عثمانیہ

۱۹۳۰ء میں فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کو حیدر آباد کی صدارتِ عالیہ کے عہدۂ افتاء پر مقرر کیا گیا، موصوف دار العلوم دیوبند کے کاموں میں غایت درجے منہمک تھے مصروفیات کا تقاضا یہ تھا کہ آپ اس عہدے سے انکار کر دیتے؛ مگر یہاں بھی دار العلوم کا مفاد پیش نظر تھا؛ کیوں کہ دار العلوم اور حیدر آباد کے مابین جو دیرینہ تعلقات تھے ان کو نظر انداز کرنا آسان نہ تھا، چناں چہ آپ ۴ ربیع الاول کو دکن روانہ ہوئے اور وہاں صدارت عالیہ کے صدر مفتی کے منصب پر تین سال کے لیے فائز ہوئے، البتہ اس دوران بھی آپ دار العلوم کی خدمات بخوبی انجام دیتے رہے۔

نظام دکن کی بڑے لمبے عرصے سے خواہش تھی کہ کوئی ایسا عالم یہاں آئے جو صدارت عالیہ کے صدر مفتی کے منصب پر فائز ہو اور شریعت کی تنفیذ میں معاون و مددگار ثابت ہو، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کی شہرت و عظمت ان کے دل میں پہلے ہی سے گھر کیے ہوئے تھی اور وہ حضرت موصوف سے حد درجہ متأثر تھے، کہ انھوں نے دارالعلوم سے درخواست کی کہ حضرت کو اس منصب کے لیے بھیجا جائے، حضرتؒ نے مفاد دارالعلوم کے لیے اس درخواست کو قبول کیا اور آپ وہاں کے لیے روانہ ہوئے۔

نظام دکن کا مقصد صرف عہدۂ افتاء کی تقرری نہیں تھی؛ بلکہ وہ آپ کی انتظامی و علمی صلاحیت سے اس قدر متأثر تھے کہ آپ کو مدرسہ جامعہ نظامیہ عثمانیہ کی انتظامی و اصلاحی خدمات بھی آپ کے سپرد کیں اور درخواست کی کہ مدرسہ نظامیہ کے سابقہ حالات کو دیکھ کر اصلاح و ترقی کے لیے مفید تجاویز پیش کریں، چناں چہ فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے تحریری شکل میں جو تجاویز پیش کیں ان کا نام ضابطہ جامعہ نظامیہ رکھا گیا، یہ تجاویز کچھ اصول ہیں جن کو دفعات کی شکل میں بیان کیا گیا، یہ ۱۸/ دفعات ہیں جن کے تحت کچھ عنوانات ہیں مثلاً مفاد جامعہ نظامیہ، ضابطہ انتظامی جامعہ نظامیہ، فرائض مجلس انتظامی، شعبہ جات انتظامی، فرائض ناظم تعلیمات، مہتمم جامعہ کے فرائض وغیرہ یہ تمام عناوین انتظامی ڈھانچہ کو مستحکم کرنے کے لیے ہر ایک شعبہ اور منتظم کے کچھ اصول و فرائض ہیں جن کے پیش نظر آگاہ کیا گیا ہے کہ جامعہ کا فرض لوگوں کے تئیں کیا ہوگا اور لوگوں پر اس کی کیا ذمہ داریاں ہوگی یہ اس قسم کا ایجنڈا (منشور) ہے جو کسی ادارہ، انجمن یہ تحریک کے لیے تیار کیا جاتا ہے، جن پر عمل کر کے معینہ اغراض و مقاصد کو بروئے کار لایا جاتا ہے، جامعہ نظامیہ ایک دینی ادارہ ہے اسی لیے اس کا منشور اسلامی طرز پر ترتیب دیا گیا ہے، یہ طرز پہلے بہ عنوان ''تعلیم بطریق اہل سنت والجماعت'' سامنے آیا۔ اس عنوان کے تحت جو دفعات ہیں ان کا اجمالاً یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔

دفعہ- ۱: مدرسۂ نظامیہ میں اہل السنّت والجماعت کے طریقہ پر علوم عربیہ دینیہ کی اعلیٰ تعلیم دی جائے گی اور اس کے خلاف کسی دوسرے طریقہ پر دینا اصول مدرسہ اور ارادۂ بانی کے خلاف ہوگا لہٰذا کسی وقت اس میں تغیر وتبدل نہ ہو سکے گا۔ لیکن چوں کہ ہندوستان کے باشندوں کا طریقہ بالعموم حنفی ہے اس لیے بانی مدرسہ نے اس طریقہ کی پابندی رکھنا لازم قرار دیا ہے اس کے خلاف کبھی نہ ہو سکے گا لیکن اگر اس کے ساتھ مذہب اربعہ مجتہدین میں سے علاوہ مذہب حنفی کے دوسرے طریقہ کے مقلد تعلیم پانا چاہیں تو تعلیم پا سکیں گے اور اگر ان کے لیے اس مذہب کے درس کی ضرورت بھی پیش آئے گی تو ایسے مدرسوں کا تقرر خلاف اصول مدرسہ نہ ہوگا۔

دفعہ- ۲: اس مدرسہ کے ارکان انتظامی مدرسین اور جملہ کار پرواز وہی اشخاص ہو سکیں گے جو سنی حنفی طریقہ کے پابند ہوں لیکن جیسا کہ مقلدین مذاہب اربعہ کے متعلق دفعہ (۱) میں استثناء کیا گیا ہے، اس دفعہ میں استثناء سمجھنا چاہیے، ارکان مجلس میں دو ثلث علماء کا ہونا لازمی ہے۔

نوٹ: حضرت فخر الاسلامؒ کی مندرجہ ذیل تحریر معروف ہے جو مطبوعہ بھی ہے، قارئین کے استفادہ کے لیے پیش ہے:

مدرسہ اسلامی عربی دیوبند کا زرین ماضی اور مستقبل

مدرسہ دارالعلوم دیوبند میں ہر تیسرے چوتھے سال اپنے فضلاء کو دستار فضیلت عطاء کرنے کا طریقہ عام تھا، مگر ۱۳۰۱ھ کے بعد یہ سلسلۂ دستار بندی بعض وجوہات کے سبب موقوف رہا فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں پھر اس کی نشاۃ ثانیہ ہوئی اور تقریباً ۲۷ رسال کے بعد مدرسے میں پھر وہی منظر پیش آیا جس میں ۲۶ رسال کے فارغ التحصیل علماء کو دستار فضیلت عطاء کی گئیں، یہ عظیم الشان جلسہ دستار بندی ۶-۷-۸ ربیع الاول ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۷-۱۸-۱۹ر

اپریل ۱۹۱۰ء کو منعقد کیا گیا۔

فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے اس مقالے کو اسی جلسہ میں پڑھ کر سنایا کیونکہ موصوف اپنی بات ایک بڑے مجمع کے سامنے رکھنا چاہتے تھے، اور اس سے اچھا مجمع اور کیا ہو سکتا ہے جو آپ کے ابتدائی کلمات سے واضح ہے:

”الحمد للہ! الحمد للہ! آج ایسا مجمع ہے جس میں ہر طبقہ و ہر سمت کے مسلمان دلی شوق و رغبت سے محض لوجہ اللہ جمع ہیں، شاید یہ کہنا بالکل صحیح ہو کہ مسلمانوں کا ایسا اجتماع کسی کو دیکھنا نصیب نہیں ہوا اور یہ دن نہ صرف مدرسہ دیوبند کی تاریخ بلکہ مسلمانوں کی قومی و مذہبی روایات میں یادر ہنے والا ہے۔

خادمانِ مدرسہ اگر اس پر فخر کریں گے تو بیجا نہیں کہ ان کی سادہ اور بے تکلف دعوت کو قبول کر کے ان کو یہ موقع دیا گیا کہ وہ مدرسہ کے عملی نتائج کو دکھلا کر اپنے خیالات کا پورا اظہار کر سکیں“۔

اس مقالے میں موصوف کے پیش نظر مسلمانوں کی مذہبی اور دینی ضرورت ہے وہ امت کو بلا تفریق ایک پلیٹ فارم پر لانا چاہتے ہیں دار العلوم نے مسلمانوں کے لیے جو دینی و مذہبی خدمات انجام دی ہیں یا جو آئندہ لائحہ عمل ہے اس کا ذکر موصوف نے یوں کیا ہے:

”مدرسہ اسلامیہ دیوبند“ مسلمانوں کا مذہبی مرکز، ان کے قلوب اور خیالات کا مرجع ہے، وہ ضرور اس کو سن کر اور دیکھ کر محظوظ ہوں گے کہ مدرسہ نے ان کی مذہبی خدمات کس حد تک انجام دی ہیں۔ وہ ضرور اس کے متوقع ہیں کہ مدرسہ کے گذشتہ حالات اُن کے سامنے عرض کئے جائیں اور جو خیالات آئندہ کے لئے مرکوز ہیں وہ ظاہر کئے جائیں اور یہ بھی بتلایا جائے کہ مدرسہ نے کن اصول کا پابند ہو کر مذہبی خدمات کی ہیں“۔

مدرسہ دیوبند نے مسلمانوں کے لیے ماضی میں اہم دینی فرائض انجام دیئے

ہیں اس مقالے کا مرکزی کردار دارالعلوم کا پلیٹ فارم ہے، کیونکہ جمیع مسلمین اس کے ماضی کے کردار سے مطمئن اور مستقبل سے پرامید ہیں۔

فخرالاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقالے کو دو حصے میں تقسیم کیا ہے تمہید کے طور پر سب سے پہلے مسلمانوں کی مذہبی اور دینی ضروریات اور ان کی کوششوں کے کچھ اصول بیان کئے ہیں، مسلمانوں میں بڑھتے ہوئے دینی رجحانات کو صراحتے ہوئے ایک پلیٹ فارم پر متحد ہونے کی تلقین کی ہے، دراصل یہ وہ دور ہے جب مسلمانوں میں دینی بیداری تو پیدا ہو رہی تھی مگر وہ اتحاد جیسی عظیم نعمت سے محروم ہوتے جارہے تھے، فخرالاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ جیسا عظیم رہنما اس امر سے حد درجہ متفکر ہے، پہلے تو موصوف مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "لیکن بڑی مسرت یہ ہے کہ مسلمان جو اپنی گزشتہ عظمت اور اقتدار کے نشہ میں مست اپنے منافع و مضار سے غافل تھے، اُن میں بھی ایک قسم کی تحریک پیدا ہو کر جوش و مستعدی کی صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔ وہ بھی اپنی حالت کو سنبھالنے میں اور اصلاح و ترقی کی فکر میں مشغول ہو گئے ہیں، اُن کی باوقعت اور مقتدر جماعتیں جابجا اس غرض کے لئے قائم ہو گئی ہیں کہ مسلمان بھی تمام شعبہ ہائے ترقی میں قدم بڑھائیں اور دنیا کی کسی قوم کے پیچھے نہ رہیں، جابجا اصلاحِ معاش، درستی معاد، اشاعت اسلام کی انجمنیں اور مدارس قائم ہو گئے اور ہوتے جاتے ہیں۔ مسلمان بھی اپنی ہمت واستطاعت کے موافق دلچسپی ظاہر کرنے اور امداد دینے کے لئے آمادہ و مستعد نظر آتے ہیں۔ یہ ایک ایسا دلفریب منظر ہے کہ مسلمان اُس پر جتنا بھی فخر کریں تھوڑا ہے اور اگر وہ یہ سمجھنے لگیں کہ ان کی دعا "ربنا آتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة" کی قبولیت کا وقت آیا ہے تو بیجا نہیں ہے"۔

مذکورہ بالا اقتباس میں مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے دینی رجحانات کی جہاں ستائش ہے وہیں آئندہ تحریر میں انتشار جیسی مہلک بیماری سے مایوسی کا بھی اظہار کیا ہے:

''مگر ایک مبصر اور حقیقت شناس کبھی اس حالت پر مطمئن نہیں ہوسکتا کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اُن کی قوت کا شیرازہ منتشر ہے اور ان کے خیالات مختلف اور باہم دگر مخالف، وہ جس قدر قوت کے ساتھ کوشش کرتے ہیں ایک دوسرے سے دور ہوتے جاتے ہیں، اُن کی مثال بالکل اُن دو شہسواروں کی ہے جو نہایت تیزی کے ساتھ جاتے ہیں لیکن ایک کا رخ مشرق کی طرف اور دوسرے کا مغرب کی جانب ہے، ظاہر ہے کہ وہ جتنی سرعت سے دوڑیں گے اتنا ہی بُعد بڑھتا جائے گا۔

یہ حالت کہ باوجود ایسی سرگرم کوششوں کے جو سر برآوردہ جماعتوں کی طرف سے ظہور پذیر ہیں عملی نتائج مترتب نہ ہوں اتحاد کی جگہ اختلاف بڑھتا جائے، ترقی کی جگہ تنزل کے گڑھے میں گرتے جائیں، مایوس کر دینے والی اور زیادہ خطرناک ہے''۔

اٹھارویں صدی کا آخر اور انیسویں صدی کا آغاز وہ دور ہے جب مسلمانوں کی مختلف فکری جماعتیں عمل میں آئیں، جن کے مقاصد ایک ہوتے ہوئے بھی مختلف ہیں اس سے مسلمانوں کا اتحاد متزلزل ہو رہا ہے، موصوف ان اصلاحی جماعتوں کی تائید تو کرتے ہیں مگر تمام جماعتوں کو سراہتے ہوئے آپسی اختلافات سے بچنے کے لیے تلقین کرتے ہیں:

''ہمارا ہرگز یہ خیال نہیں کہ مصلحوں کی کوشش میں کمی ہے یا ان کے اغراض و مقاصد نا تمام ہیں یا اُن کی نیتوں میں خلل و فساد ہے۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ سب کی مشترک غرض مسلمانوں کی اصلاح، اُن کو ہر قسم کی خوبیوں اور اخلاق

سے آراستہ کرنا، اُن کو طرق معاش کا سکھلانا، علومِ آخرت سے آگاہ و باخبر کرنا، معاشرت کے طریقوں سے واقف کرنا، غیروں کے دستبرد اور حملوں سے بچانا ہے۔ یہ اغراض جس قدر مبارک ہیں ظاہر ہے کسی ایک فرد کو بھی اُس میں کلام نہیں ہوسکتا، مگر بااین ہمہ بہتر نتائج کا مرتب نہ ہونا بجائے اصلاح کے فساد و اختلاف کا بڑھتے جانا ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر عقلاء کو غور کرنا ضروری ہوگیا ہے۔ ہمیں تھوڑی دیر کے لئے نفسانی خیالات کو ترک کردینا اور اپنی رائے کی تحسین و ترویج سے قطع نظر کرلینا چاہئے۔ ہم کو کسی کی عیب جوئی کے درپے نہ ہونا چاہئے بلکہ سکون و اطمینانِ قلب کے ساتھ اس کی اصلی لم اور وجہ دریافت کرنی چاہئے۔ ہم کو سمجھ لینا چاہئے کہ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، اگر ہم میں سے کسی کی نادانی اور سوء تدبیری سے کشتی کو نقصان پہنچا تو آفت سے محفوظ کوئی بھی نہ رہے گا''۔

اس تمہید کے بعد موصوف نے مقالے کے پہلے حصے میں اسلام کی مکمل تعلیمات تحریر فرمائی ہیں اسلام کی اصلی حالت کو پیش کرنے کے لیے قرن اول کے حالات اور مختصر تاریخ اسلام کو نہایت علمی انداز میں پیش کیا ہے، صحابہ کا آپسی اتحاد، دین کے تئیں اخلاص، تبلیغ دین وغیرہ پر روشنی ڈالتے ہوئے مختلف احادیث کو بطور دلیل پیش کیا ہے، فروعی اختلافات تو کچھ صحابہ کے یہاں پائے جاتے تھے، مگر ان کے یہاں اصول دین کے اندر کبھی کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا، چونکہ آپ کا مقصد اصولی اختلاف سے امت کو باز رکھنا ہے، چناں چہ اس سلسلے میں ایک حدیث پیش کرتے ہوئے اس کی وضاحت کچھ اس طرح کی ہے:

''رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام علاتی (یعنی باپ شریک) بھائی بہن ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ گو ہر نبی کی شریعت کے احکام جدا جدا ہیں مگر اصول سب کے ایک ہیں۔ صحابہؓ کی یہی سب سے بڑی اور روشن

خصوصیت تھی کہ گو مسائلِ فروعی میں باہم اختلاف ہوتا تھا، سیاست وانتظامِ ملک کے طریقے مختلف تھے مگر اصول میں سب متفق تھے اور اس امر میں بعینہٖ انبیاء علیہم السلام کی مثال اور نمونہ تھے۔ اسی وجہ سے صحابہؓ کے زمانہ مین اصولِ دین کے اندر اختلاف پیدا نہیں ہوا، صحابہؓ کے حالات اور طریقے مختلف تھے۔ بعض بالکل زہد اور انقطاع کی حالت میں بسر کرتے تھے اور یکسور ہتے تھے۔ بعض تعلیم وتحدیث واشاعتِ علوم میں مصروف تھے، بعض کی تمام عمر جہاد اور تبلیغ اسلام، توسیعِ فتوحات میں گزری اور خلفاء اربعہ جیسے جلیل القدر حضرات انتظامِ خلافت، تمہیدِ قواعد اور نظام وضوابط سلطنت قائم کرنے میں مصروف رہے۔ بایں ہمہ اصل معاملہ میں سب کے سب متفق الخیال واللفظ تھے۔

صحابہ کرام میں اصول دین میں اختلاف نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے قلوب میں فراست ایمانی راسخ ہو چکی تھی تزکیۂ نفس وتہذیب اخلاق نے ان کے باطن کو منور کر دیا تھا وہ توکل رضاء تسلیم وتفویض پر راسخ القدم تھے موصوف نے نہایت عالمانہ انداز میں یہی نسخہ تجویز فرمایا ہے، آپ نے مقالے کے اس حصے پر اسی لیے اس قدر زور صرف کیا ہے تا کہ مسلمان سمجھ لیں کہ ہماری دینی بنیادیں کس قدر مضبوط ہیں اور مستقبل میں ہم پر کس طرح ان کی حفاظت لازم ہے دراصل یہی دارالعلوم کا ماضی ہے، کیونکہ دارالعلوم کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو قرنِ اول سے جوڑنا ہے، حضرت فرماتے ہیں:

"مدرسہ دیوبند کے افتتاح میں بھی بالکل قرونِ اولیٰ کی شان اور سادگی کا زمانہ یاد آتا ہے، جو عمل واخلاص سے ہوتا ہے، اگرچہ کیسی ہی سادگی سے ہو دیر پا ہوتا ہے، ظاہری شان وشوکت کا اثر زیادہ عرصہ تک نہیں رہتا، جامع اشبیلیہ اور جامعہ فسطاط کا موازنہ کر کے دیکھ لیا جائے، جامع فسطاط صحابہؓ کی قائم کی ہوئی تھی اور نہایت سادہ، جامع اشبیلیہ خلفائے مروانیہ کی بنائی ہوئی

ہے اور نہایت پر تکلف، مگر مورخین کا اتفاق ہے کہ اس سادگی میں جو دل بستگی ہے وہ وہاں کی شان و نمود میں نہیں۔ مدرسہ دیو بند کا افتتاح دیو بند جیسی گم نام بستی میں چھتہ مسجد کے انار کے درخت کے نیچے ہوا۔ جناب مولانا ملا محمود صاحب دیو بندی مدرس تھے اور مولانا محمود حسن صاحب پہلے طالب علم تھے، جنہوں نے کتاب کھولی، مدرسہ دیو بند نے اس سادگی کے ساتھ وجود میں قدم رکھا اور حسب قاعدہ اسلام تدریجی ترقی کرتا گیا مگر بانیوں کے اخلاص کی یہ خیر و برکت ہے کہ آج وہ ہر طرح سے مسلمانوں کے لئے موجب فخر ہے۔ مدرسہ کی ظاہری شان بھی دلفریب ہے اور اُس کے سب سے پہلے طالب علم آج تمام ہندوستان کے مقتدا اور امام مانے جاتے ہیں''۔

باضابطہ طور سے موصوف نے مدرسہ اسلامیہ دیو بند کے حالات بیان کئے ہیں ابتدائی حالات کا ذکر کرتے ہوئے والد محترم امام العصر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور رشید احمد گنگوہی صاحبؒ وغیرہ کی دار العلوم کے وجود کے تئیں کوششوں کو لوگوں سے متعارف کرایا ہے بعد میں مدرسہ سے مسلمانوں کو جو فوائد پہنچے یا پہنچنے والے ہیں اس کا اظہار یوں فرمایا ہے:

''مدرسہ اسلامیہ دیو بند کو علماء دیو بند کے ایسے افراد نے قائم فرمایا جو اپنے زمانہ میں صحابہؓ کے سچے نمونہ تھے، علم و عمل میں انہیں اصول کے پابند تھے۔ زہد و تقویٰ، اتباعِ احکام میں انہیں کے قدم بقدم تھے، شریعت و طریقت کے جامع تھے، ان کے علوم راسخ تھے اور ان کی عمر کا اکثر حصہ ریاضت و مجاہدات، خلوت و گوشہ نشینی میں گزرا تھا۔ ان کی تواضع و انکسار کا یہ حال تھا کہ کسی بات میں اپنے آپ کو ممتاز نہ سمجھتے تھے۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانی دار العلوم باایں علوم و معارف و کمال علمی و عملی جس کا ایک عالم شاہد ہے فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے میں اور دیوار میں کچھ فرق نہیں سمجھتا۔ کبھی یہ فرمایا

کرتے کہ اگر علم کا نام نہ ہوتا تو کسی کو یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ قاسم دنیا میں آیا تھا، اللہ اکبر، یہ ہے شانِ اہل اللہ اور راسخین فی العلم کی۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے دربار کے حاضر ہونے والے ہزارہا آدمی موجود ہیں، انہوں نے مولانا کے حلقہ درس، تحقیق مسائل اور اجتہاد و تفقہ اور تحدیث اور جواب مسائل کی شان کو دیکھا اور طالبین حق کی جماعتوں کو حاضر دربار ہوتے اور شرابِ محبت سے سرشار ہوتے دیکھا ہے۔ مولاناؒ نے بارہا شاگردوں کی جماعت کو مخاطب کر کے فرمایا کہ" واللہ میں تم سب کو اپنے سے علم میں افضل جانتا ہوں:

یہی وہ مقدس اخیارِ امت تھے جو شریعت وطریقت کے حقیقۃً جامع اور سلف صالحین کے سچے پیرو کہلائے جاسکتے ہیں، جن کی ہر ادا مسلمانوں کے گزشتہ دلفریب منظر کو پیش کرتی تھی، اُن کی ایک شان اگر امام ابوحنیفہؒ کے اجتہاد و تفقہ، امام بخاریؒ کی روایت وحفظِ حدیث، امام اشعری و ماتریدیؒ کے کلام و مناظرہ، امام الحرمین کے تبحر، امام غزالیؒ کی جامعیت و تحقیق اور مدرسہ نظامیہ بغداد میں ان کے درس کی کیفیت کو یاد دلاتی تھی تو دوسری شان حضرت جنیدؒ و شبلیؒ، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ معین الدین چشتیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، شیخ بہاؤ الدین نقشبندیؒ کے حلقۂ ارشاد و تلقین کا منظر پیش کرتی تھی، اُن کے فیض سے اگر ایک جانب طلبہ اپنے دامنوں کو علوم و معارف کے انمول جواہرات سے بھرتے تھے تو دوسری طرف مشتاقانِ جمال خداوندی اور طالبانِ راہِ سلوک جام محبت سے سرشار ہو کر رات دن ذوق وشوق سے خانقاہ قدوسیہ کو ذکر اللہ کی دلکش آوازوں سے گونجا دیتے تھے، سلف صالحین کا کامل نمونہ اس پچھلے زمانہ میں ان حضرات کے سوا کہاں دیکھا گیا اور اس جامعیت کا منظر مشتاق نگاہوں کو اگر ملا تو نانوتہ اور

گنگوہ کی مقدس سرزمین پر۔ الغرض یہ حضرات مدرسہ کے بانی اور اس کے محافظ و سرپرست تھے“۔

علمی نثر کی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ مدلل ہو، جو بات پیش کی جائے اس کو دلیل سے مستحکم کیا جائے، اسی طرح ادبی نثر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آمد ہو تصنع نہ ہو، سلیس ہو ثقیل نہ ہو، قاری کو اس کی قرأت گراں نہ محسوس ہو، سیدھے سادھے اور عام فہم الفاظ میں مافی الضمیر کی ادائیگی کردی گئی ہو، جملے چھوٹے چھوٹے اور باہم مرتبط ہوں، گفتگو مخاطب کے لحاظ سے کی جائے، دراصل علی گڑھ تحریک کے بعد اسی قسم کی نثر کو قبول عام حاصل ہوئی۔

حضرت فخر الاسلامؒ کا یہی امتیاز ہے کہ ان کی تحریرات میں کم و بیش یہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں آپ جہاں علمی گفتگو کرتے ہیں وہاں اپنی بات کو قرآن و حدیث سے مستحکم کرتے ہیں، جابجا اردو اور فارسی کے اصلاحی اشعار بھی پیش کرتے ہیں، ماقل و دل کے لحاظ سے بات کو گھمانے پھرانے کے بجائے کم سے کم موثر الفاظ میں پیش کردیتے ہیں۔ جہاں کہیں پس منظر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہاں نہایت مختصر مگر جامع انداز میں پس منظر بیان کرتے ہوئے مدعا پیش کردیتے ہیں، اس سے مخاطب کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے، آپ کی تحریرات میں ترسیل بدرجۂ اتم موجود ہے، موصوف مخاطب کے لحاظ سے گفتگو کرتے ہیں، جب نظام دکن کو مخاطب کرتے ہیں تو ان کے شایان شان پرشکوہ الفاظ تحریر فرماتے ہیں، اسی طرح جب علماء اور طلبہ سے مخاطب ہوتے ہیں تو جا بجا احادیث و قرآنی آیتوں کا ذکر کرتے ہیں اور جب عوام سے خطاب کرتے ہیں تو سیدھی سادی بیانیہ اور عام فہم گفتگو پر قناعت کرتے ہیں۔ اس سے آپ کے تبحر علمی اور حکیمانہ فکر کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اور یہی دراصل عین فصاحت ہے کہ گفتگو مقتضیٰ حال کے مطابق کی جائے یعنی جیسا مخاطب ویسی گفتگو۔

نوٹ: گذشتہ صفحات میں فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب کی

تحریرات کا تجزیہ پیش کیا گیا اس میں کئی چھوٹے چھوٹے مضامین بھی شامل ہیں جو وقتاً فوقتاً دارالعلوم کے رسالہ ''القاسم والرشید'' میں شائع ہوئے البتہ اس میں دو بڑے مقالے (ضابطہ مدرسہ عثمانیہ، اور دارالعلوم کا زرین ماضی اور مستقبل) بھی شامل ہیں، ان تمام کے تجزیہ کے بعد آخر میں دونوں طویل تحریرات کا متن بھی شامل کیا جارہا ہے تاکہ یہ تحریرات امتدادِ زمانہ کی نذر نہ ہوجائے، کیونکہ موصوف کی کئی تحریرات ضائع ہو گئیں جن کا ذکر تو ملتا ہے مگر باضابطہ متن کہیں موجود نہیں۔

نوٹ: اگلے صفحہ پر حضرت کے قلم سے نکلی ہوئی اس جامع تحریر کو جس میں دارالعلوم کے ماضی کے اہم واقعات مذکور ہیں برائے استفادہ پیش کیا جارہا ہے:

مدرسہ اسلامی عربی دیوبند کا زرین ماضی اور مستقبل

بقلم: فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ

یہ مقالہ عظیم الشان جلسۂ دستار بندی منعقدہ ۶-۷-۸/ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ
مطابق ۱۷-۱۸-۱۹/اپریل ۱۹۱۰ء میں پیش کیا گیا

"الحمد للّٰه نحمدهٗ و نستعینهٗ و نستغفرهٗ و نؤمن به و نتوکل علیه و نعوذ باللّٰه من شرور انفسنا ومن سیاٰت اعمالنا من یهده اللّٰه فلا مضل له ومن یضلله فلا هادی له و نشهد ان سیدنا و مولانا محمدا عبدهٗ و رسوله. امابعد:

الحمد للّٰه! آج ایسا مجمع ہے جس میں ہر طبقہ و ہر سمت کے مسلمان دلی شوق ورغبت سے محض لوجہ اللہ جمع ہیں، شاید یہ کہنا بالکل صحیح ہو کہ مسلمانوں کا ایسا اجتماع کسی کو دیکھنا نصیب نہیں ہوا اور یہ دن نہ صرف مدرسہ دیوبند کی تاریخ بلکہ مسلمانوں کی قومی ومذہبی روایات میں یادر ہنے والا ہے۔

خادمانِ مدرسہ اگراس پر فخر کریں گے تو بیجا نہیں کہ ان کی سادہ اور بے تکلف دعوت کو قبول کر کے ان کو یہ موقع دیا گیا کہ وہ مدرسہ کے عملی نتائج کو دکھلا کر اپنے خیالات کا پورا اظہار کر سکیں۔

"مدرسہ اسلامیہ دیوبند" مسلمانوں کا مذہبی مرکز، ان کے قلوب اور خیالات کا مرجع ہے، وہ ضرور اس کو سن کر اور دیکھ کر محظوظ ہوں گے کہ مدرسہ نے ان کی مذہبی خدمات کس حد تک انجام دی ہیں۔ وہ ضرور اس کے متوقع ہیں کہ مدرسہ کے گذشتہ حالات اُن کے سامنے عرض کیے جائیں اور جو خیالات آئندہ کے لئے مرکوز ہیں وہ

ظاہر کئے جائیں اور یہ بھی بتلایا جائے کہ مدرسہ نے کن اصول کا پابند ہو کر مذہبی خدمات کی ہیں، اسی بنا پر میں اپنے اس ضروری مضمون کے دو حصے کرتا ہوں۔

لیکن اس سے قبل اس کے ان عنوانوں پر کچھ لکھا جائے بطور تمہید مسلمانوں کی مذہبی و دینی ضروریات اور اُن کی کوششوں کے اصول بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

یوں تو دنیا کی تمام اقوام جدوجہد کے میدان میں کوششیں کرنے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں مصروف ہیں۔ سلاطین سے لے کر رعایا تک سب آدمی اسی دُھن میں لگے ہوئے ہیں، انہیں خیالات میں منہمک ہیں، والیانِ ملک ہیں کہ اپنے خوشگوار مشاغل کو چھوڑ کر قومی و مذہبی مجالس میں شریک ہونے اور عام افراد کے برابر بیٹھنے میں دریغ نہ کرتے۔

لیکن بڑی مسرت یہ ہے کہ مسلمان جو اپنی گذشتہ عظمت اور اقتدار کے نشہ میں مست اپنے منافع و مضار سے غافل تھے، اُن میں بھی ایک قسم کی تحریک پیدا ہو کر جوش و مستعدی کی صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔ وہ بھی اپنی حالت کو سنبھالنے میں اور اصلاح و ترقی کی فکر میں مشغول ہو گئے ہیں، اُن کی باوقعت اور مقتدر جماعتیں جابجا اس غرض کے لئے قائم ہو گئی ہیں کہ مسلمان بھی تمام شعبہائے ترقی میں قدم بڑھائیں اور دنیا کی کسی قوم کے پیچھے نہ رہیں، جابجا اصلاحِ معاش، درستی معاد، اشاعت اسلام کی انجمنیں اور مدارس قائم ہو گئے اور ہوتے جا رہے ہیں۔ مسلمان بھی اپنی ہمت و استطاعت کے موافق دلچسپی ظاہر کرنے اور امداد دینے کے لئے آمادہ و مستعد نظر آتے ہیں۔ یہ ایک ایسا دلفریب منظر ہے کہ مسلمان اُس پر جتنا بھی فخر کریں تھوڑا ہے اور اگر وہ یہ سمجھنے لگیں کہ ان کی دعا "ربنا آتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة" کی قبولیت کا وقت آیا ہے تو بیجا نہیں ہے۔

مگر ایک مبصر اور حقیقت شناس کبھی اس حالت پر مطمئن نہیں ہو سکتا؛ کیوں

کہ وہ جانتا ہے کہ اُن کی قوت کا شیرازہ منتشر ہے اور ان کے خیالات مختلف اور باہم دگر مخالف، وہ جس قدر قوت کے ساتھ کوشش کرتے ہیں ایک دوسرے سے دور ہوتے جاتے ہیں، اُن کی مثال بالکل اُن دو شہسواروں کی ہے جو نہایت تیزی کے ساتھ جاتے ہیں لیکن ایک کا رخ مشرق کی طرف اور دوسرے کا مغرب کی جانب ہے، ظاہر ہے کہ وہ جتنی سرعت سے دوڑیں گے اتنا ہی بُعد بڑھتا جائے گا۔

یہ حالت کہ باوجود ایسی سرگرم کوششوں کے جو سربرآوردہ جماعتوں کی طرف سے ظہور پذیر ہیں، عملی نتائج مرتب نہ ہوں اتحاد کی جگہ اختلاف بڑھتا جائے، ترقی کی جگہ تنزلی کے گڑھے میں گرتے جائیں، مایوس کردینے والی اور زیادہ خطرناک ہے۔

ہمارا ہرگز یہ خیال نہیں کہ مصلحوں کی کوشش میں کمی ہے یا ان کے اغراض و مقاصد ناتمام ہیں یا اُن کی نیتوں میں خلل وفساد ہے۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ سب کی مشترک غرض مسلمانوں کی اصلاح، اُن کو ہر قسم کی خوبیوں اور اخلاق سے آراستہ کرنا، اُن کو طرق معاش کا سکھلانا، علومِ آخرت سے آگاہ و باخبر کرنا، معاشرت کے طریقوں سے واقف کرنا، غیروں کی دستبردار ارحملوں سے بچانا ہے۔ یہ اغراض جس قدر مبارک ہیں ظاہر ہے۔ کسی ایک فرد کو بھی اُس میں کلام نہیں ہوسکتا، مگر باایں ہمہ بہتر نتائج کا مرتب نہ ہونا بجائے اصلاح کے فساد و اختلاف کا بڑھتے جانا ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر عقلاء کو غور کرنا ضروری ہوگیا ہے۔ ہمیں تھوڑی دیر کے لئے نفسانی خیالات کو ترک کردینا اور اپنی رائے کی تحسین و ترویج سے قطع نظر کرلینا چاہئے۔ ہم کو کسی کی عیب جوئی کے درپے نہ ہونا چاہئے بلکہ سکون واطمینانِ قلب کے ساتھ اس کی اصلی لِم اور وجہ دریافت کرنی چاہئے۔ ہم کو سمجھ لینا چاہئے کہ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، اگر ہم میں سے کسی کی نادانی اور سوء تدبیری سے کشتی کو نقصان پہنچا تو آفت سے محفوظ کوئی بھی نہ رہے گا۔

فطری طور پر مسلمانوں کے قلوب میں مذہب کی محبت رسوخ و استحکام کے

ساتھ قائم ہے، وہ جانتے ہیں کہ جب دینی عقائد اور فروعی اعمال سے واقف اور اُن پر عامل نہ ہوں گے، سلسلۂ مذہب میں پابند نہ ہوں گے، کسی امر میں ترقی نہیں کر سکتے، اگر کچھ بھی کی تو نا قابل اعتبار ہوگی۔ مسلمانوں کو نہ اُس پر کچھ فخر ہوگا، نہ مسرت۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود ایک گونہ آزادی کے جس کا اثر پھیلتا جاتا تھا، اب عام طور پر خیالات میں انقلاب ہے، مذہب وعلوم اسلام کو سنبھالنا فرض عین سمجھا جارہا ہے لیکن اس آمادگی وطلب صادق کے ساتھ اگر کمی ہے تو صرف یہ کہ ہم نے اسلام کی اصلی تعلیم اور اس کے پاکیزہ ماحول کو سمجھا نہیں۔ ہم چاہتے ہیں اور بدل چاہتے ہیں کہ ہم میں اسلامی کمالات پیدا ہوں، ہم میں اسلامی اخلاق کا رنگ و بو سما جائے۔ ہم ایک کامل و مکمل مسلمان کہلائے جاسکیں، ہم اس کے دلدادہ ہیں کہ اسلاف کی شاہراہ پر چل کر منزلِ مقصود تک پہنچیں، اپنی کھوئی ہوئی عزت و دولت کو حاصل کریں پھر اس صدقِ نیت و بذلِ ہمت کے بعد وہ کیا چیز ہے جس نے ہم کو ناکام رکھا۔ ہماری سب تدابیر بیکار ثابت ہوئیں، وہ صرف ایک ہی بات ہے کہ ''ہم نے اسلامی اصول کو مضبوط نہیں پکڑا، اسلاف کے حالات کو قصے کہانیوں سے زیادہ وقعت کے ساتھ نہیں سنا۔'' ہم نے ان کے حالات سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش نہیں کی کہ کس بات نے ان کو اس درجہ پہنچایا۔

میرا دل چاہتا ہے کہ ایک ایسے مجمع میں جس کے اندر ہر طبقہ کے مسلمان موجود ہیں سادہ الفاظ میں بیان کردوں کہ ''اسلام نے ہم کو کیا سکھلایا ہے، ہمارے لئے کیا کیا طریقے اور اصول مقرر کئے ہیں۔'' اور یہ بھی ظاہر کردوں کہ مسلمانوں کے معاش و معاد کی ضرورتیں کس قدر اور اُن کی تدبیریں کیا ہیں؟

برادرانِ اسلام! اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کو اُس کی اصلی حالت میں دیکھیں اور بلاکم وکاست اُس حالت کا اندازہ کرسکیں جس پر مسلمان نشو ونما پاکر درجۂ کمال کو پہنچے تو ہم کو قرنِ اوّل کے حالات پر نظر ڈالنی چاہئے۔

آفتاب جب اُفقِ عالم کے قریب پہنچتا ہے تو اس کے نورانی آثار پہلے ہی

سے ظاہر ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ صبح صادق کے ہوتے ہی چھوٹے چھوٹے ستارے معدوم اور چمکدار ستارے مضمحل ہونے لگے ہیں۔ آفتاب رسالت و نبوت کے طلوع کا زمانہ آیا تو اس کے نورانی آثار نے ایک طرف اگر شیاطین کے راستے روک دیئے، جنات میں کھلبلی ڈال دی اور کاہنوں کو حیران و پریشان بنا دیا تو دوسری طرف بنی نوع انسان میں صلاحیت اور قبولِ حق کا مادہ آہستہ آہستہ پیدا کر دیا۔ اہل عرب جو رسومِ قبیحہ اور منکرات میں بال بال بندھے ہوئے تھے، ان کے اندر ایسی استعداد پیدا ہوگئی کہ ہادیٔ برحق کی ایک آواز کان میں پڑتے ہی لَبَّیک کہہ کر کھڑے ہوگئے۔ عرب کی مختصر حالت یہ تھی کہ بدترین رسوم و عقائد کے پابند تھے، بت پرستی و شرک گویا ان کے خمیر میں داخل تھا، بہت سے امور جو تمام اہل عقل کے نزدیک مذموم ہیں اہل عرب ان کو اچھا سمجھتے تھے، برہنہ ہو کر طواف کرنا عبادت جانتے تھے لیکن حضور سرورِ کائنات -صلی اللہ علیہ وسلم- تشریف لاتے ہی کیا ہو گیا۔ عرب کی حالت کیوں کر بدل گئی، حیرت انگیز قصہ ہے ایک کیمیا اثر نظر نے ان کو کندن بنا دیا۔ آپ کے ایک ساعت کے فیضِ صحبت نے نورِ ایمان سے اُن کے قلوب کو منور کر دیا، ان کے اندر وہ کمالات پیدا ہو گئے جو صدیوں کی محنت و ریاضت سے بھی حاصل نہیں ہوتے۔ اسلام و ایمان کے مراتب حاصل کر کے ایمان حقیقی اور ولایت کبریٰ تک پہنچ گئے، وہ دینِ خالص بن گئے، ان کے تمام علاقے غیر اللہ سے قطع ہو کر صرف ایک ذات وَحْدَهٗ لَا شَرِيْکَ لَهٗ کے ساتھ وابستہ ہو گئے، ان کے اعتقادات و عبادات و معاملات سب ایک آن میں درست ہو گئے۔ وہ مکارمِ اخلاق سے مزین ہو گئے، بت پرستی کی جگہ محبتِ خدا اور رسولؐ اُن کی رگ رگ میں جاگزیں ہو گئی۔ توحید میں اس درجہ راسخ العقیدہ ہو گئے کہ شرک کے وہم سے بھی بچتے تھے۔ حضرت عمرؓ حجرِ اسود کو بوسہ دیئے ہیں تو فرماتے ہیں: اعلم انک حجر لا تنفع ولا تضر ولو لا انی رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقبلک ماقبلتک (میں خوب جانتا ہوں کہ

تو پتھر ہے، نفع وضرر تیرے اختیار میں نہیں، اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو ہرگز بوسہ نہ دیتا)

بیعتِ رضوان کی جس قدر فضیلت ہے اُس کا اندازہ قرآن مجید کی ان آیات سے بخوبی ہوسکتا ہے:

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ

(بلا شبہ اللہ تعالیٰ مؤمنوں سے راضی ہوا جب کہ آپ کے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کرتے تھے)

مگر ایک روایت کے موافق حضرت عمرؓ کو یہ خبر پہنچی کہ بعض لوگ اُس کی زیارت کو آتے ہیں تو اس اندیشہ سے کہ اُس کی تعظیم حد شرع سے متجاوز ہو جائے اُس درخت کو کٹوا ڈالا۔

مقامِ رسالت کے ساتھ محبت و جاں نثاری ادب واتباع رضا کا یہ حال تھا کہ کسی نبی کے اصحاب کو یہ بات نصیب نہیں ہوئی۔ اپنے جان و مال کو آپ پر فدا کرتے تھے، جنگ احد میں طلحہ بن عبید اللہؓ نے اپنے ہاتھ کو آپ کے لئے سپر بنا دیا ور اس قدر تیر اس پر کھائے کہ ہاتھ شل ہو گیا۔

اسی معرکہ میں جب تھوڑی دیر کے لئے مسلمانوں کے پیر اکھڑے تو ابو طلحہؓ نے اپنے آپ کو سپر بنا کر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو محفوظ کر دیا اور نہایت عاجزی سے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! آپ باہر کو نہ دیکھئے، کوئی تیر آپ کو آ لگے، میرا سینہ حضورؐ کے سینہ کی ڈھال ہے۔

حدیبیہ میں عروہ بن مسعودؓ کی جانب کفار صلح کی گفتگو کرنے آئے تو دیکھا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ سلم تھوکتے ہیں تو اصحاب اپنے منہ اور ہاتھوں پر ملتے ہیں، آپ کے وضو کے پانی پر اس قدر جھگڑا ہوتا ہے کہ لڑائی کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ جب حکم فرماتے ہیں تو سب تعمیل کے لئے دوڑتے ہیں۔ آپ کے سامنے بات کرتے ہیں

تو نہایت پست آواز سے بات کرتے ہیں، نظر اٹھا کر دیکھ نہیں سکتے، عروہ یہ حال دیکھ کر حیران رہ گئے اور اپنے فریق سے کہا کہ میں قیصر و کسریٰ کے دربار میں بھی شریک ہوا ہوں مگر جو تعظیم و ادب یہاں دیکھا کہیں نہیں دیکھا۔

اثناء گفتگو میں عروہ اپنا ہاتھ ریشِ مبارک تک لیجاتے تو، اُن کا پوتا مغیرہ جو مسلمان ہو چکا تھا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کھڑا تھا، تلوار کے کنارے سے دادا کے ہاتھ کو ہٹا دیا کہ ریش مبارک سے ہاتھ علیحدہ رکھو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلقۃً بلند آواز تھے۔ جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گفتگو کرنے میں بھی آواز بلند ہو جاتی تھی، لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ (اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی کی آواز سے پر بلند مت کرو) تو حضرت عمرؓ اس قدر آہستہ بولنے لگے کہ استفسار کی نوبت آتی تھی۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اوّل ہی اوّل مدینہ منورہ میں تشریف فرما ہوئے تو حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مکان میں فروکش ہوئے اور اپنی آمد و رفت اور زیارت کرنے والوں کی سہولت کے خیال سے آپ نے نیچے مکان کو پسند فرمایا اور ابوایوبؓ اپنے اہل و عیال کو لے کر اوپر کے درجہ میں رہے لیکن ایک شب کو جب دفعۃً یہ خیال آیا کہ ہم اوپر ہیں تو نیند حرام ہو گئی اور دونوں میاں بیوی مکان کے ایک گوشہ میں لگے ہوئے بیٹھے رہے اور صبح ہی کو مکان چھوڑ دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ بھی جنگ بدر کے قیدیوں میں تھے، انصار نے اُن کو بوجہ قرابتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھڑانا چاہا تو یہ کہنا مناسب نہ سمجھا کہ ہم آپ کے چچا کو چھڑانا چاہتے ہیں بلکہ نہایت ادب سے یوں عرض کیا کہ ہم اپنے بھانجے کو چھڑانا چاہتے ہیں (حضرت عباسؓ رشتہ میں انصار کے بھانجے ہوتے تھے) یہ تھا کمالِ ادب جو صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے دلوں میں راسخ تھا۔

حضرت عمرؓ نے اپنے صاحبزادے پر حدِ شرعی جاری کر دی، محبتِ پدری ذرا مانع نہ ہو سکی، عبداللہ ابن اُبی منافقوں کے سردار نے یہ کہا تھا:

لَئِنْ رَّجَعْنَا اِلَی الْمَدِیْنَۃِ لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْھَا الْاَذَلَّ

اگراب کی دفعہ ہم مدینہ پہنچ گئے تو ہم دونوں فریقوں میں سے جو عزت والا ہے وہ ذلیلوں کو مدینہ سے نکال دے گا۔

سب سے پہلے جس شخص نے اُس کو اس گستاخی کا جواب دیا وہ اُس کے بیٹے تھے، جن کا نام بھی عبداللہ تھا اور وہ مومن مخلص تھے۔ مدینہ کے دروازے پر کھڑے ہو گئے اور اپنے باپ کو داخل ہونے سے روک دیا اور کہا کہ جب تک یہ اقرار نہ کرے گا، تو اور تیرا گروہ ذلیل ہیں مدینہ میں داخل نہیں ہونے دوں گا۔ حضرت عمرؓ نے عین میدانِ جنگ میں سپہ سالارِ اعظم خالد بن ولیدؓ کو معزولی کا حکم بھیج دیا، حضرت خالدب نے اس حکم کو سرآنکھوں پر رکھا اور افسری سے علیحدہ ہو کر معمولی سپاہی کی حیثیت میں بھی پہلے سے زیادہ تندہی اور مستعدی سے معرکہ آرائیاں دکھلائیں، کیا کوئی اس توکل اور پابندیٔ احکامِ شرع کی مثال پیش کر سکتا ہے؟ جو دونوں حضرت سے ظہور پذیر ہوئیں۔

صحابہؓ کی سی باریک بینی اور احکام شرع میں احتیاط بھی کسی کو نصیب نہیں ہوئی، بڑے بڑے واقعات کو چھوڑ کر ایک دو معمولی باتیں عرض کی جاتی ہیں، جن سے آپ حضرات خود ہی قیاس کر سکیں گے۔ غدر اور عہد شکنی کی شریعت میں سخت ممانعت آئی ہے۔ ایک دفعہ اسلامی لشکر کے امیر نے وقت معین تک غنیم سے صلح کر لی، لیکن اندر ہی اندر سامانِ جنگ کرتے اور دشمن کی حد سے قریب ہوتے رہے اور مدتِ صلح ختم ہوتے ہی لڑائی شروع کر دی۔ ایک صحابی گھوڑا دوڑاتے ہوئے امیر لشکر کے پاس آئے اور فرمایا: اللہ اکبر وفائاً لا غدر (خیال کیجئے کہ ان کی باریک نظر کہاں پہنچی۔ یہ حالت صرف انہیں کی نہ تھی جو سالہا سال خدمت میں رہے بلکہ جن پر ایک دفعہ بھی

نظرِ رحمت پڑ جاتی تھی اُن کا بھی یہی حال ہو جاتا تھا۔

ثمامہ بن اُثال یمن کا سردار مسلمانوں کا بڑا دشمن، آپ سے سخت عداوت رکھنے والا تھا، جب وہ گرفتار ہو کر آیا تو آپ نے اُس کو مسجد کے ستون سے بندھوا دیا اور صبح کی نماز کے بعد فرمایا: مَاعِندک یا ثُمامة (ثمامہ تمہارا کیا حال ہے؟) عرض کیا اِن تَقتُل تَقتُل ذا د و ان تُنعِمُ تُنعَمُ علیٰ شاکر (اگر آپ قتل کریں گے تو مستحقِ قتل کو اور احسان کریں گے تو شکر گزار پر) دوسرے روز آپؐ نے پھر وہی ارشاد فرمایا، انہوں نے وہی جواب دیا، تیسرے روز پھر وہی ارشاد فرمایا اور انہوں نے پھر وہی جواب دیا، اس وقت آپ نے ان کو کھول دینے کا حکم دیا اور وہ فوراً ایمان لائے اور اول درجہ کے محبت کرنے والے اور عاشق بن گئے۔

خیال فرمایئے کہ باوجود ایمان کے راسخ ہونے اور آپ کی نظر رحمت کے مسخر ہو جانے کے محض اس وجہ سے تاخیر کی کہ ایمان لانا خوفِ قتل پر محمول نہ ہو۔

ایثار اور مکارمِ اخلاق کی جو مثالیں صحابہؓ قائم فرما گئے ہیں عجیب وغریب ہیں۔ حذیفہ عدوی فرماتے ہیں کہ میں یرموک کے معرکہ میں اپنے چچازاد بھائی کو مقتولین میں تلاش کرنے نکلا اور تھوڑا پانی ساتھ لیا کہ اگر کچھ رمق ہوئی تو پانی پلا دوں گا، دیکھا تو وہ مقتولین کے درمیان زندگی کی آخری حالت میں تھے، میں نے پوچھا کہ پانی پلاؤں؟ اشارہ سے کہا ''ہاں'' اتنے میں قریب سے ایک شخص نے آہ کی، میرے بھائی نے اشارہ سے کہا اُن کو پلاؤ، وہاں گیا تو دیکھا کہ ہشام بن العاص تھے، اُن سے پوچھا کہ پانی پلاؤں؟ تو اشارہ سے کہا ''ہاں پلاؤ'' اتنے میں دوسری طرف سے آواز آئی کہ ''ہائے پانی'' ہشام نے اشارہ کیا کہ وہاں لے جاؤ، میں وہاں لے گیا تو وہ صاحب انتقال فرما چکے تھے، واپس آیا تو ہشام بھی زندہ نہ تھے، بھائی کے پاس پہنچا تو وہ بھی ختم ہو چکے تھے، یہ تھا حقیقی ایثار جو قرنِ اول میں مسلمانوں کے لئے بمنزلہ امر طبعی بن گیا تھا۔

صحابہؓ کے اخلاص وللٰہیت کا حال رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کوہِ احد کے برابر سونا خرچ کرے تو صحابہ کے آدھ سیر جو کی برابری نہیں کرسکتا۔ عبادات میں لذت ودل بستگی کی یہ کیفیت تھی کہ بڑی سے بڑی تکلیف بھی ان کو مانع نہ ہوسکتی تھی، ایک رات کو جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو صحابیوں کو ایک گھاٹی کی نگہبانی کے لئے مامور فرمایا، جس طرف دشمن کے چڑھ آنے کا اندیشہ تھا، اُن میں سے ایک سوگئے اور دوسرے نماز میں مشغول ہوگئے۔ اسی حالت میں ایک تیر آکر لگا اور خون جاری ہوگیا مگر انہوں نے نماز کو نہ چھوڑا، نماز ختم کرچکے تو رفیق کو اطلاع کی، انہوں نے کہا کہ پہلے سے کیوں خبر نہ کی۔ انہوں نے فرمایا کہ میں ایک سورت پڑھ رہا تھا، دل نے گوارہ نہ کیا کہ اس کو چھوڑ دوں۔

الغرض رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وفیضِ صحبت نے صحابہ کو کامل و مکمل بنادیا، اُن کے اندر وہ کمالات پیدا ہوگئے جو سالہا سال کی ریاضت ومجاہدہ سے حاصل نہیں ہوتے۔ آپ نے اُن کو محض عقائد وعبادات ظاہری ہی کی تعلیم نہیں دی بلکہ فنا وبقا کے تمام مقامات طے کرا کے اعلیٰ مراتب محبت واحسان تک پہنچادیا۔

حضرت حنظلہ کا حال احادیث میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ راستہ میں ابوبکر صدیقؓ سے ملاقات ہوئی تو اُن سے کہا کہ: نَافَقَ حَنْظَلَةُ (حنظلہ تو منافق ہوگیا) ابوبکرؓ نے کہا کیوں؟ کہا کہ ہم رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم آنکھ سے دیکھ رہے ہیں، گھر جاتے ہیں اور اہل وعیال کے مدارات میں مصروف ہوتے ہیں تو وہ حالت نہیں رہتی۔ ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ یہ بات تو ہمیں بھی پیش آتی ہے۔ دونوں نے حاضر ہوکر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔ ارشاد فرمایا کہ اگر ہر وقت یکساں حال رہتا تو ملائکہ تم سے راستوں میں اور بچھونوں پر مصافحہ کرتے۔ اس واقعہ سے صحابہؓ کے علوِ مرتبت اور باریک بینی دونوں کا حال معلوم ہوگیا۔ اس فرق کو کہ جو بات آپ کے سامنے ہوتی ہے

بعد میں کم ہو جاتی ہے نفاق سے تعبیر کیا۔

اصحابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات در بارۂ عبادات و محبت خدا اور رسولؐ اور اُس میں ہمہ تن انہماک و مشغولی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو دوسری جانب اصلاً التفات نہ تھا، دنیا و مافیہا کو ایک نظر دیکھنا نہ چاہتے تھے لیکن بایں ہمہ اس حالت نے اُن کو دنیا کی ترقیات سے نہیں روکا، عبادات و اعمال کی پختگی کسی ذریعۂ ترقی سے مانع نہ آئی۔ وہ دنیا کے معاملات، تجارت و زراعت وغیرہ سے غافل نہ تھے۔ ملک گیری، سیاستِ مدن، تدبیر مملکت، اشاعتِ تہذیب و تمدن میں وہ کمال دکھلایا کہ ہزاروں برس کی متمدن قومیں انگشت بدنداں رہ گئیں۔

بعض صحابہؓ میں زہد اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ روپیہ پیسہ کو پاس رکھنا قطعاً حرام سمجھتے تھے۔ حضرت ابوذرؓ دوسرے جلیل القدر صحابہؓ کے حالات معروف و مشہور ہیں اور بعض صحابہؓ دولت و ثروت میں ممتاز و مشہور تھے۔ جیسے خلیفۂ ثالث عثمان ذی النورینؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، لیکن طبقۂ اول کا زہد اُن کو کسی امر سے مانع نہ تھا۔ وہ اسی زہد کی حالت میں انتظامِ سلطنت فرماتے تھے۔

حضرت عمرؓ نے عمیر بن سعد کو والی بنا کر بھیجا اور ایک سال کے بعد حسابات اور حالات پیش کرنے کے لئے طلب فرمایا تو وہ اس شان سے تشریف لائے کہ پانی کا ظرف، توشہ دان اور پیالہ کمر پر تھا، لاٹھی ہاتھ میں، حضرت عمرؓ نے اس حالت میں دیکھ کر فرمایا کہ ''تم نے خیانت کی یا وہ ملک اچھا نہیں ہے۔'' عمیر بن سعد نے عرض کیا کہ امیر المؤمنین کیا اللہ تعالیٰ بدگمانی سے منع نہیں فرماتا؟ میں تو تمام دنیا کو اپنے ساتھ کھینچے لا رہا ہوں۔ فرمایا کہ دنیا کی کون سی چیز تمہارے پاس ہے؟ عرض کیا کہ لاٹھی ہے، جس پر سہارا لگاتا اور دشمن کو دفع کرتا ہوں۔ توشہ دان ہے، جس میں کھانے کا سامان رکھتا ہوں۔ مشکیزہ ہے جس میں وضو اور پینے کے لئے پانی رکھتا ہوں۔ پیالہ ہے جس سے وضو کرتا ہوں اور پانی پیتا ہوں۔ اب دنیا کی کون سی چیز رہ گئی، جو کچھ ہے

اسی کے تابع ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ کھڑے ہوئے اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر جا کر خوب روئے اور دعا کی کہ "الٰہی مجھ کو میرے دونوں ساتھیوں کے پاس پہنچا دے، بغیر اس کے کہ رسوا ہوں یا کسی حالت کو بدلوں۔ اس کے بعد آپ نے عمیرؓ سے وہاں کے انتظام و حالات کے متعلق سوال کیا، جس کو انہوں نے بیان کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم اپنی حکومت پر واپس جاؤ۔ انہوں نے عرض کیا کہ اب آپ مجھے گھر جانے کی اجازت دید یجئے۔ آپ نے اجازت دیدی لیکن تجسس حال کے لئے ایک شخص کو سو دینار دے کر اُن کے گھر بھیجا اور فرمایا کہ اگر وہ فی الواقع ایسے ہی تنگ دست ہوں تو سو دینار اُن کو دیدینا، یہ شخص اُن کے یہاں گئے اور تین روز مہمان رہ کر دیکھا، سوائے جو اور زیت کے کچھ نہ تھا، اُس وقت وہ سو دینار اُن کو دیدیئے مگر انہوں نے اسی وقت پرانے پوستین کو پھاڑ کر پانچ پانچ چھ چھ دینار کی پوٹلیاں باندھ کر پڑوسیوں کو بھجوا دیں۔

ایک شخص کو حضرت عمرؓ نے چار سو دینار دے کر حضرت ابو عبیدہؓ کے پاس بھیجا کہ دیکھو کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے اسی وقت لونڈی کو بلا کر فرمایا کہ اس قدر دینار فلاں کے پاس لے جاؤ، اس قدر فلاں کے پاس۔ غرض سب کو تقسیم کر دیا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے اسی قدر دینار دے کر حضرت معاذؓ کے پاس بھیجا۔ انہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ سب بھائی ایک دوسرے کے مثل ہیں۔ خیال فرمایئے کہ حضرت عمیرؓ حاکم بنا کر بھیجے گئے۔ ملک کا انتظام کرتے تھے اور اُن کے زہد کا یہ حال تھا حضرت ابو عبیدہؓ سپہ سالار اعظم تھے اور دنیا سے بے تعلقی کی یہ کیفیت تھی لیکن اُن کا یہ زہد انتظامِ سلطنت اور توسیع فتوحات سے مانع نہ تھا۔

دوسری جانب مال دار اور صحت مند کی حالت دیکھ لیجئے۔ حضرت عثمانؓ کی ثروت و مالداری مشہور ہے۔ لیکن ان کا تمول ایک آن کے لئے بھی حق تعالیٰ سے غافل نہ بنا سکا، وہ تمول کی حالت میں ایسے ہی زاہد تھے جیسے حضرت ابوذرؓ فقر کی حالت میں۔

حضرت عثمانؓ نے مالداری کی بدولت وہ مرتبہ حاصل کیا کہ دوسرے زہد کے ساتھ نہ کر سکے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جیش عسرت کے لئے لوگوں کو ترغیب دلائی۔ صحابہؓ نے حسبِ حیثیت امداد کی۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے بہت زیادہ روپیہ خدمت شریف میں لا کر رکھ دیا۔ آپ اُس کو دستِ مبارک سے پلٹتے جاتے تھے اور یہ فرماتے جاتے تھے مَا علیٰ عثمان مَا عمل بعد الیوم (کچھ حرج نہیں اگر آج کے بعد عثمان کوئی بھی عمل نہ کریں)

حضرت ابو بکر صدیقؓ کا درجہ زہد و انقطاع عن الدنیا میں سب پر فائق تھا۔ جب صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا کہ مَنْ نُؤمِّرُ بَعْدَکَ (آپ کے بعد کس کو سردار بنائیں) تو آپ نے ارشاد فرمایا:

اِنْ تؤمر ابا بکرٍ تجدوہ زاھداً فی الدنیا راغباً فی الآخرۃ.

اگر تم ابو بکرؓ کو خلیفہ بناؤ گے تو ان کو دنیا سے بے تعلق اور آخرت کی طرف رغبت کرنے والا پاؤ گے۔

زہد آپ کے مخصوص اوصاف میں تھا، جس کا اس موقع پر حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر فرمایا لیکن آپ نے اسی زہد کے ساتھ خلافت کی بنیاد کو ایسی حالت میں مستحکم فرمایا کہ لوگوں میں تشویش تھی۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا صدمہ علیحدہ سوہانِ روح تھا اور جگہ جگہ سے قبائل عرب کی سرکشی اور ارتداد کی خبروں نے علیحدہ پریشان کر رکھا تھا۔ سب سے پہلے جس واقعہ نے ابو بکر صدیقؓ کے ثباتِ عزم و استقلال، رائے، فراست و خوش تدبیری کا سکہ بٹھایا وہ جیش اُسامہ کا روانہ کرنا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض وفات میں اسامہ بن زید کو امیر لشکر بنا کر روانہ فرمایا۔ اسامہؓ نے شہر سے باہر ڈیرہ ڈال دیا مگر روانہ نہ ہونے پائے تھے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی اور قبائلِ عرب نے سر اٹھایا۔ اکثر صحابہؓ کی یہ رائے تھی کہ ایسی حالت میں جب کہ گھر میں فساد ہے اسامہ رضی اللہ عنہ

کو بھیجنا مناسب نہیں ہے لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس عزم پر قائم رہے اور فرمایا کہ جس جھنڈے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باندھا تھا میں ہرگز نہ کھولوں گا، یہ تدبیر ایسی موثر اور کارگر ثابت ہوئی کہ جو قبائل آمادۂ فساد تھے مسلمانوں کو مطمئن اور قوی سمجھ کر بجائے خود خاموش رہے۔

بعض قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا۔ حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ ان سے جہاد نہ کیا جائے، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے نہایت استقلال کے ساتھ فرمایا کہ ''جو شخص رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک رسّی بھی زکوٰۃ میں دیتا تھا اور اب انکار کرے میں درگزر نہ کروں گا اور حضرت عمرؓ جیسے مدبر، تیز فہم، صائب الرائے، حق گو کو نہایت تیزی کے ساتھ فرمایا ''اَجبَارٌ فِی الْجَاھِلِیَۃِ، خَوَارٌ فِی الْاِسْلَامِ'' (جاہلیت کے زمانہ میں ایسے تیز وتند اور اسلام میں ضعیف وست) خیال کر لیجئے جس شخص کے دل میں تمام دنیا کی حقیقت پر پشہ کے برابر نہ تھی اور اس کو نظر التفات سے دیکھنا گوارا نہ کرتے تھے، وہ کس طرح خلافت کی بنیاد مستحکم کرتے ہیں، نظام مملکت قائم کر کے تبلیغ دین وتوسیع فتوحات کے لئے لشکر فراہم کرتے اور ہر ایک لشکر کے لئے لائق سے لائق افسر منتخب کرتے اور ہر ایک کو اُس کے مناسب ہدایات دیتے ہیں اور کس خوبی سے ملک کے اندرونی انتظام کو درست کر کے شام وروم، مصر وعراق تک سکہ بٹھلاتے ہیں، تمام محققین کا اتفاق ہے کہ گو فتوحات کی کثرت حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہوئی، مگر اصول سب کے حضرت ابوبکرؓ نے قائم فرمائے، یہ تھا دین کا جمع کرنا جو صحابہؓ کو حاصل تھا اور یہ تھے معنی رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً کے جن کو صحابہؓ نے سمجھا۔

صحابہؓ کی صفائی قلب فراستِ ایمانی، سلامتی ذہن کی یہ حالت تھی کہ بڑے بڑے مشکل معاملات دو چار باتوں میں طے ہو جاتے ہیں اور اختلاف رفع ہو جاتا تھا۔ خلافت جیسا اہم معاملہ اور انصار کا ایک طرف اس کا خواہش مند ہونا کہ مِنَّا اَمِیْرٌ

و مِنکم امیر (ایک سردار ہم انصار میں سے مقرر ہو اور ایک مہاجرین میں سے) مگر حضرت ابوبکرؓ کی ایک تقریر پر سب نے سر تسلیم خم کرلیا۔

یمامہ کی لڑائی کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر قرآن شریف کے جمع کرنے کی رائے پیش کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس رائے سے اختلاف کیا مگر آپ کے دو تین بار وَاللّٰہُ خَیۡرٌ فرمانے سے اُن پر بھی یہ امر منکشف ہو گیا، پھر دونوں نے زید بن ثابت کاتب وحی کو بلا کر یہ خدمت ان کے سپرد کرنی چاہی۔ انہوں نے بشدت اس سے انکار کیا مگر دونوں کے مکرر وَاللّٰہ خَیۡرٌ فرمانے سے اُن پر بھی یہ راز کھل گیا۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام علاتی (یعنی باپ شریک) بھائی بہن ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ گو ہر نبی کی شریعت کے احکام جدا جدا ہیں مگر اصول سب کے ایک ہیں۔ صحابہؓ کی یہی سب سے بڑی اور روشن خصوصیت تھی کہ گو مسائلِ فروعی میں باہم اختلاف ہوتا تھا، سیاست و انتظامِ ملک کے طریقے مختلف تھے مگر اصول میں سب متفق تھے اور اس امر میں بعینہٖ انبیاء علیہم السلام کی مثال اور نمونہ تھے۔ اسی وجہ سے صحابہؓ کے زمانہ مین اصولِ دین کے اندر اختلاف پیدا نہیں ہوا، صحابہؓ کے حالات اور طریقے مختلف تھے۔ بعض بالکل زہد اور انقطاع کی حالت میں بسر کرتے تھے اور یکسو رہتے تھے۔ بعض تعلیم و تحدیث و اشاعتِ علوم میں مصروف تھے، بعض کی تمام عمر جہاد اور تبلیغ اسلام، توسیعِ فتوحات میں گزری اور خلفاء اربعہ جیسے جلیل القدر حضرات انتظامِ خلافت، تمہیدِ قواعد اور نظام وضوابط سلطنت قائم کرنے میں مصروف رہے۔ بایں ہمہ اصل معاملہ میں سب کے سب متفق الخیال واللفظ تھے۔

یہ سب صحابہؓ ہی کا کمال تھا کہ جو زہد اور غنا ان کو فقر و فاقہ کے زمانہ میں حاصل تھا، وہی تمول اور تنعم کے زمانہ میں تھا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا ایک تو

وہ زمانہ تھا کہ دربارِ رسالت میں طالب علمانہ حیثیت سے صفہ پر پڑے رہتے تھے اور کچھ مل گیا تو کھالیا ورنہ فاقہ ہی سے پڑے رہے اور ایک وہ زمانہ آیا کہ ناک صاف کرنے کا رومال کتان کا رکھتے تھے اور خود ہی تعجب سے فرماتے تھے کہ ابو ہریرہ اپنی وہ حالت بھول گیا۔

صحابہؓ کا یہی کمال تھا جس نے اُن کو تمام امتوں سے افضل و بہتر بنا دیا، یہی وہ بات تھی جس کی وجہ سے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیم"

میرے صحابہؓ ستاروں کی مانند ہیں، جس کی اقتدا کرو گے ہدایت پاؤ گے۔

اور یہی وہ خصوصیت اور فضیلت تھی جس کی بنا پر ارشاد فرمایا:

وھا ما من احد من اصحابی یموت بارض الا بعث قائدا و نوراً لھم یوم القیامۃ

یعنی میرے صحابہؓ میں سے جو شخص کسی سرزمین پر وفات پائے گا وہ قیامت کے روز اُس سرزمین والوں کے لئے سردار اور نور ہوگا۔

صحابہؓ میں دربارۂ اصولِ دین اختلاف نہ ہونا اس کی وجہ کیا تھی؟ صرف یہی کہ ان کے قلوب میں فراست ایمانی راسخ ہو چکی تھی، تزکیۂ نفس و تہذیب اخلاق نے اُن کے باطن کو منور کر دیا تھا، اُن پر تمام حقائق و کمالات منکشف ہو چکے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے شریعت و طریقت کے تمام درجاتِ کمال طے ہو گئے تھے۔ توکل و رضا، تسلیم و تفویض پر راسخ القدم تھے، مقاماتِ فنا و بقا طے کر کے ہر آن قرب و مشاہدہ میں مشغول اور النھایہ ھی الرجوع الی البدایۃ کے پورے مصداق۔

یہ تھی جامعیت شریعت و طریقت جو صحابہؓ کو علی وجہ الکمال حاصل تھی اور اسی وجہ سے صحابہؓ کے علوم قطعی اور یقینی تھے، اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اگر مسائل فروعی

میں اختلاف موجبِ رحمت نہ ہوتا تو صحابہؓ اصولِ دین کی طرح ان میں بھی متفق ہوتے، یہی وہ دولتِ ایمانی وعرفانی ہے جس کی طرف آیت شریفہ: ”الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا“ میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

زمانۂ صحابہؓ کے بعد اگر چہ فروعی اختلاف کے ساتھ اصولِ دین میں بھی اختلاف ہو کر مسلمانوں میں نئے نئے فرقے پیدا ہو گئے۔ مگر ہر طبقہ میں ایسے لوگ ضرور موجود رہے جنہوں نے صحابہؓ کے طریقہ کو مضبوط ہاتھوں سے پکڑ کر اسلام اور مسلمانوں کی وہ خدمتیں کیں جو قیامت تک صفحۂ تاریخ پر قائم رہیں گی اور ہر قرن میں ایسے افراد موجود رہے جو صحابہؓ کے طریقے کے سچے پیرو تھے۔ اسلامی تاریخیں ایسے حضرات کے حالات سے بھری ہوئی ہیں مگر میں ان کو لکھ کر زیادہ طول دینا نہیں چاہتا۔ البتہ بطور مثال ایک بادشاہ کا حال بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ وہ ٹھیک صحابہؓ کے طریقے پر چل کر اسلام کو ترقی دیتا اور عظمت و جلال کے ساتھ فرائض سلطنت کرتا ہے۔

اسلام کی پانچ صدیاں گزر جانے کے بعد چھٹی صدی میں نورالدین پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنے زہد واتقا، تورع وتدین کے ساتھ جو کچھ کر دکھایا، مورخین بھی حیران ہیں۔ نورالدین کی سلطنت حجاز ویمن ومصر وشام وموصل جزیرہ وغیرہ تک پھیلی ہوئی تھی اور اس بنا پر حدود ملک کی حفاظت کے لئے ان کو کبوتروں کی ڈاک اور اُس کے باقاعدہ محکمے قائم کرنے پڑے تھے، رعب و داب سلطنت بھی ایسا تھا کہ بڑے بڑے امراء، وزراء سامنے بات نہ کر سکتے تھے۔ کئی رات دفعۃً اندر سے باہر نکل آئے تو شدتِ خوف سے پہرہ دار کا دم نکل گیا، لیکن اُس کے ساتھ زہد، اتباع شریعت، تقویٰ، توکل اعتماد علی اللہ کی کیفیت چند واقعات سے معلوم ہو سکتی ہے۔

اپنا کھانا، لباس، دیگر ضروریات صرف اُس آمدنی سے مخصوص کر دی تھی جو

اُن کی مملوکہ جائیداد سے ہوتی تھی، بیوی نے تنگی کی شکایت کی اور اضافہٗ ماہوار کی درخواست کی تو فرمایا کہ اُس کی خواہشیں پوری کر کے میں جہنم میں نہ جاؤں گا، میری چند دکانیں حلب میں ہیں، ان کی آمدنی سے اپنی ضروریات کو پورا کرلیا کرے۔

اکثر سلاطین نے رعایا پر ناجائز خلاف شرع ٹیکس لگا دیئے تھے، نورالدین کے ابتدائی زمانہ میں بھی وہ ٹیکس بجائے خود جاری تھے، مگر انہوں نے ارادہ کیا کہ سب کو موقوف کر کے قانونِ شریعت کے موافق محصول لیا جائے اور اسدالدین شیرکوہ سے اس کا مشورہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ اس قدر آمدنی کو موقوف کریں گے تو فوج کو تنخواہ کہاں سے دی جائے گی۔ ممالک کی نگرانی کیوں کر ہوگی؟ فرمایا کہ اگر یہ باتیں خلافِ شرع آمدنی پر موقوف ہیں تو یک لخت سب کو چھوڑ دوں گا، مجھے ضرورت نہیں ہے کہ ناجائز محصول وصول کر کے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کروں اور بالآخر مردانہ ہمت سے سب کو قطعاً موقوف کر کے تمام ملک میں منادی کرادی کہ اس وقت تک جو محصول لئے گئے مسلمان ان کو معاف کر دیں۔

نورالدین کے ملک میں جابجا لوٹ مار کی کثرت ہوگئی، اصل مجرمین کا پتہ نہ لگتا تھا، وزراء نے مشورہ دیا کہ سیاست سے کام لیجئے، شبہ پر لوگوں کو قتل کیجئے، امن قائم ہو جائے گا۔ جواب دیا کہ ہرگز نہیں، میں خلافِ حکم شرع حدود جاری نہ کروں گا۔ اللہ تعالیٰ بندوں کی مصلحت سے خوب واقف ہے۔ اگر امن قائم کرنے کی یہی صورت ہوتی تو ہم کو اس کی اجازت دی جاتی لیکن ان کے اخلاص اور کمالِ نیک نیتی و اتباع شریعت کا یہ اثر تھا کہ ملک میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی گی۔

ایک دفعہ سلطان نورالدین پر کسی شخص نے قاضی کی عدالت میں دعویٰ دائر کیا۔ قاضی نے چپراسی کو طلبی کا حکم دے کر بھیجا کہ سلطان فوراً حاضر ہو کر جواب دہی کریں۔ ایک سردار چپراسی سے یہ حال سن کر بطور تمسخر ہنستے ہوئے نورالدین کے پاس گئے اور کہا کہ حضور سوار ہو جائیں۔ فرمایا کہاں کو؟ کہا قاضی صاحب کا چپراسی کھڑا

ہے۔ اس پر فرمایا کہ پھر مذاق کی کیا بات ہے؟ مسلمانوں کو حکم یہ ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی طرف بلائے جائیں تو ان کو کہنا چاہیے کہ "ہم نے سنا اور اطاعت کی۔" یہ کہہ کر سوار ہو گئے۔

نورالدین مندوبات و مستحبات میں یہی اقتداء کرتے تھے، آپ کے یہاں علماء کا دربار ہوتا تھا، محدثین حدیثیں روایت کرتے تھے۔ ایک بار ایک محدث نے یہ حدیث روایت کی کہ فتح مکہ کے دن جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تمام صحابہؓ تلوار کو حمائل کیے ہوئے تھے۔ یہ سنتے ہی حکم دیا کہ کل ہماری سواری نکلے تو سب فوج کی تلواریں حمائل ہوں، حکم کی دیر تھی، رات بھر میں سامان تیار ہو گیا اور صبح ہی سواری اس شان سے نکلی، سبحان اللہ۔ ایک سچا اور پکا مسلمان صحابہؓ کے طریقِ عمل کو مضبوط پکڑ کر اس طرح انتظام سلطنت کرتا اور ملک کو معراجِ ترقی پر پہنچاتا۔

نورالدین نے ملک بھر میں مدارس، مساجد، خانقاہیں تعمیر کرا دیں اور شفاخانہ تو اِس شان کا قائم کیا کہ اس ترقی و تہذیب کے زمانہ میں بھی اُس کی نظیر ملنا مشکل ہے، وہ ایک طرف رعبِ سلطنت کو اس طرح قائم کرتا ہے کہ سلاطین بھی دم بخود رہتے ہیں۔ دوسری جانب ایک درویش کی صورت میں ٹاٹ کا لباس پہن کر عبادت میں مشغول ہوتا اور تزکیۂ نفس کرتا ہے۔ اس نے شریعت کے کسی حکم میں ترمیم، تحریف گوارا نہیں کی اور ترقی اسلام، اصلاح مسلمانان، توسیع ملک، انتظام سلطنت کو کسی ناجائز یا مشتبہ آمدنی پر معلق نہیں کیا۔ لیکن بایں ہمہ انتظامِ ملک کے بارے میں جو کچھ کر گیا سلاطین مابعد اُس کا اتباع بھی نہ کر سکے۔

برادرانِ اسلام! یہ ہیں اصول اسلام اور یہ ہے وہ شاہراہِ ترقی جس پر چل کر مسلمان منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ مجھے بالکل یقین ہے کہ تمام مسلمان اس امر کے خواہش مند ہیں کہ وہ اپنے اسلاف کے قدم بقدم چلیں، وہ اپنے بزرگوں کا نام نہایت عظمت سے لیتے اور ان کی اقتداء کو فخر سمجھتے ہیں۔ وہ اس پر مٹے ہوئے ہیں کہ

ہم میں ابوحنیفہ، شافعی، جنید وشبلی، اشعری وماتریدی، باقلانی وغزالیؒ ہر زمانہ میں پیدا ہوتے رہیں لیکن اُن کو یہ معلوم نہیں کہ وہ بندگانِ دین خدا اس اس درجہ تک کیوں کہ پہنچے، سالہا سال تو اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا، راتوں کو چراغ کے آگے آنکھیں سینکیں، تحصیل علوم کے بعد تزکیۂ نفس ومراقبہ ومجاہدہ میں مشغول ہوئے۔
حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو یہ حقیقت ومعرفت کی باتیں کیوں کر معلوم ہوئیں؟ فرمایا عن جلوسی بین یدی اللّٰہ ثلثین سنۃ (اللہ کے پاس تیس برس تک بیٹھنے سے) علماء شافعیہ میں ایک بہت بڑے امام گزرے ہیں جن کا لقب باز اشہب ہے، ان سے کسی نے سوال کیا کہ آپ کو یہ علوم کیوں کر حاصل ہوئے؟ فرمایا کہ ابوالقاسم جنید کی ہم نشینی کی برکت سے۔

ان علوم اور مرتبوں کے حصول کا یہی طریقہ ہے مگر ہم نے یہ سب طریقے چھوڑ دیئے۔ نہ وہ محنتیں، نہ وہ قویٰ، نہ وہ اخلاص، نہ اصولِ صحابہ پر قائم ہوں تو کیوں کر علم حال وقلب، قال وزبان پر آئے گا۔ تصوف بجائے خلوت گاہوں کے رسالوں اور اخباروں کی صورت میں ظاہر ہونے لگا، علوم وکمالات اسلامی سب متروک ہو کر صرف نقل وعبارت آرائی میں منحصر ہو گئے۔

میری غرض یہ نہیں ہے کہ میں کسی خاص جماعت پر نکتہ چینی کروں یا اس کی تنقیص کروں، حاشا وکلا میری غرض صرف یہ ہے کہ ہم اگر کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اُن اصول پر قائم ہو جائیں جو ہم کو بتلائے گئے ہیں اور جن کا بیان میں نے کسی قدر تفصیل سے کیا ہے۔ ہم اگر اُن اصول کو مضبوط ہاتھوں سے پکڑ لیں تو دین ودنیا کی نعمت حاصل ہو جائے، ہم میں زاہد ومتقی، درویش وعالم، محدث وفقیہ، مفسر ومتکلم، مہندس وریاضی داں، ادیب ومورخ، فلسفی وطبیب، سب ہی کچھ ہو جائیں۔ ہم پختہ مسلمان ہو کر امن ورفاہِ عام کے ذمہ دار بن سکتے ہیں اور گورنمنٹ کے ساتھ وفاداری اور جاں نثاری کر سکتے ہیں۔ ہم کو شریعت نے ہرگز یہ تعلیم نہیں دی کہ ہم غدر وبے وفائی، نقض

امن کریں، سلاطین اسلام نے جب تک شریعت کی پابندی کی، ہرگز اس کو گوارا نہیں کیا کہ رعایا میں سے کسی ایک متنفس کو خواہ وہ کسی مذہب وملّت کا ہو تکلیف پہنچے۔ مردمین میں مسلمانوں نے عیسائیوں کا گرجا جلادیا تھا، جس میں مال و جان کا نقصان ہوا۔ سلطانِ وقت نے مرتکبین جرم کو قتل وحبس دوام وجرمانہ وغیرہ کی سزائیں پرچے پر لکھ کر اور گولیاں بناکر تقسیم کردیں اور جس کے حصے میں جو سزا آئی جاری کردی۔ مسلمانوں سے اگر کوئی حرکت کبھی نازیبا وخلافِ شان ہوتی ہے تو صرف اسی وجہ سے کہ اصولِ مذہب کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔

برادرانِ اسلام! ہم اگر متفق ہوکر اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے جس کو میں نے بیان کیا، اس کو چھوڑ کر جو کچھ کیا جاتا ہے اس کا نتیجہ بجز اس اختلاف وتفرقہ کے کچھ نہیں ہے۔

علماء پر اکثر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ تنگ خیال ہیں، ذرا ذرا سی بات میں اسلام سے خارج کردیتے ہیں، یہ خیال بھی ایسا ہی غلط ہے جیسے اور باتیں۔ علماء سب سے زیادہ وسیع الخیال ہیں، وہ ہر ایک انجمن اور ہر ایک اسلامی جماعت کے دست وبازو بن کر کام کرسکتے ہیں، وہ صرف ایک ہی بات چاہتے ہیں اور بہ التجا اس کی درخواست کرتے ہیں کہ سب مسلمان صحابہؓ کے طریقے پر چلیں، وہ اسلام کے احکام اور اصول کو اپنی رائے سے بدلنے کی کوشش نہ کریں، بس اس کے بعد زراعت کریں یا تجارت، صنعت وحرفت سیکھیں، بڑے سے بڑا منصب حاصل کریں، سب کچھ زیبا ہے۔

علماء حقانی ہرگز کسی کو اسلام سے خارج کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔ اگر گنجائش نہ رہے تو دوسری بات ہے۔ آپ دیکھ لیجئے کہ علماء حقانی کی طرف سے کسی کی تکفیر شاذ ونادر ہی ہوتی ہے۔

مسلمانوں کو اس وقت ضرورت ہے کہ اُن میں ایسے علماء موجود رہیں جو سلف کے سچے جانشین اور علومِ اسلام کے حامل ومبلغ ہوں، اُن میں باکمال درویش

موجود ہیں، ان کی خانقاہیں آباد ہوں، ان کو ضرورت ہے کہ ان کے جوان علوم جدیدہ اور السنہ مغربیہ میں کمال حاصل کر کے ترقی دنیا کی منازل کو طے کریں، ان کو ضرورت ہے کہ اُن میں ایسی جماعتیں پیدا ہوں جو دونوں علوم کی جامع ہوں اور تبلیغ واشاعتِ اسلام کے کام کو بخوبی انجام دے سکیں۔ ان جماعتوں کے متفق الاصول ہو کر قائم ہونے سے مسلمانوں کے دین ودنیا درست ہو سکتے ہیں۔

علمِ حال بدونِ ریاضات ومجاہدات وگوشہ نشینی حاصل نہیں ہوسکتا۔ علوم دین میں بھی بدون طریقۂ سلف کمال حاصل نہیں ہوسکتا اور کبھی ایسے علماء جو راسخ فی العلم ہوں پیدا نہیں ہو سکتے، جب تک وہ طریقت وشریعت کے جامع نہ ہوں، علومِ معاش کو خاص انہیں کے طریقہ پر حاصل کرنا چاہئے، لیکن ان سب گروہوں کو جو اپنے علوم و فنون میں مختلف ہیں، یہ اصولِ دین وپابندیٔ احکام میں موافق ہونا چاہئے۔ علماء کو اگر کبھی کسی امر میں اختلاف ہوتا ہے تو صرف اسی وجہ سے کہ اصولِ دین اور طریقۂ سلف کو چھوڑ کر عقائد ومعاملات میں تبدیل وتحریف کر کے مسلمانوں کی اصلاح وتربیت کا سامان کیا جاتا ہے۔

ہم سب کو چاہئے کہ طریقۂ سلف کے موافق اتحادی صورت قائم کر کے تمام خدمتوں کو اپنی جماعتوں پر تقسیم کر دیں اور دیکھیں کہ جماعت علماء کیوں کر سب سے آگے ہوتی ہے۔

اس تمہید کے بعد مدرسہ اسلامیہ دیوبند کے حالات بیان کرنا چاہتا ہوں۔ وماتوفیقی الا باللہ۔

مدرسہ اسلامیہ دیوبند کے ابتدائی حالات اور اسکے نتائج وثمرات

مدرسہ اسلامیہ دیوبند کو علماء دیوبند کے ایسے افراد نے قائم فرمایا جو اپنے زمانہ میں صحابہؓ کے سچے نمونہ تھے، علم وعمل میں انہیں اصول کے پابند تھے۔ زہد وتقویٰ، اتباعِ احکام میں انہیں کے قدم بقدم تھے، شریعت وطریقت کے جامع تھے، ان کے

علوم میں راسخ تھے اور ان کی عمر کا اکثر حصہ ریاضت و مجاہدات، خلوت و گوشہ نشینی میں گزرا تھا۔ ان کی تواضع و انکسار کا یہ حال تھا کہ کسی بات میں اپنے آپ کو ممتاز نہ سمجھتے تھے۔ بانی دارالعلوم مولانا محمد قاسم صاحبؒ باایں علوم و معارف و کمال علمی و عملی جس کا ایک عالم شاہد ہے فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے میں اور دیوار میں کچھ فرق نہیں سمجھتا۔ کبھی یہ فرمایا کرتے کہ اگر علم کا نام نہ ہوتا تو کسی کو یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ قاسم دنیا میں آیا تھا، اللہ اکبر، یہ ہے شانِ اہل اللہ اور راسخین فی العلم کی۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے دربار کے حاضر ہونے والے ہزارہا آدمی موجود ہیں، انہوں نے مولانا کے حلقہ درس، تحقیق مسائل اور اجتہاد و تفقہ اور تحدیث اور جواب مسائل کی شان کو دیکھا اور طالبین حق کی جماعتوں کو حاضر دربار ہوتے اور شرابِ محبت سے سرشار ہوتے دیکھا ہے۔ مولاناؒ نے بارہا شاگردوں کی جماعت کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "واللہ میں تم سب کو اپنے سے اعلم و افضل جانتا ہوں۔"

یہی وہ مقدس اخیارِ امت تھے جو شریعت و طریقت کے حقیقۃً جامع اور سلف صالحین کے سچے پیرو کہلائے جا سکتے ہیں، جن کی ہر ادا مسلمانوں کے گزشتہ دلفریب منظر کو پیش کرتی تھی، اُن کی ایک شان اگر امام ابو حنیفہؒ کے اجتہاد و تفقہ، امام بخاریؒ کی روایت و حفظِ حدیث، امام اشعری و ماتریدیؒ کے کلام و مناظرہ، امام الحرمین کے تبحر، امام غزالیؒ کی جامعیت و تحقیق اور مدرسۂ نظامیہ بغداد میں ان کے درس کی کیفیت کو یاد دلاتی تھی تو دوسری شان حضرت جنید و شبلی، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ معین الدین چشتی، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ بہاؤ الدین نقشبندی کے حلقۂ ارشاد و تلقین کا منظر پیش کرتی تھی، اُن کے فیوض سے اگر ایک جانب طلبہ اپنے دامنوں کو علوم و معارف کے انمول جواہرات سے بھرتے تھے تو دوسری طرف مشتاقانِ جمال خداوندی اور طالبانِ راہِ سلوک جام محبت سے سرشار ہو کر رات دن ذوق و شوق سے خانقاہ قدوسیہ کو ذکر اللہ کی دلکش آوازوں سے گونجا دیتے تھے، سلف صالحین کا کامل نمونہ

اس پچھلے زمانہ میں ان حضرات کے سوا کہاں دیکھا گیا اور اس جامعیت کا منظر مشتاق نگاہوں کو اگر ملا تو نانوتہ اور گنگوہ کی مقدس سرزمین پر۔ الغرض یہ حضرات مدرسہ کے بانی اور اس کے محافظ و سرپرست تھے۔

مدرسہ دیوبند کا افتتاح

مدرسہ دیوبند کے افتتاح میں بھی بالکل قرونِ اولیٰ کی شان اور سادگی کا زمانہ یاد آتا ہے، جو عمل واخلاص سے ہوتا ہے، اگرچہ کیسی ہی سادگی سے ہو دیرپا ہوتا ہے، ظاہری شان وشوکت کا اثر زیادہ عرصہ تک نہیں رہتا، جامع اشبیلیہ اور جامع فسطاط کا موازنہ کر کے دیکھ لیا جائے، جامع فسطاط صحابہؓ کی قائم کی ہوئی تھی اور نہایت سادہ، جامع اشبیلیہ خلفائے مروانیہ کی بنائی ہوئی ہے اور نہایت پر تکلف، مگر مورخین کا اتفاق ہے کہ اس سادگی میں جو دل بستگی ہے وہ وہاں کی شان ونمود میں نہیں۔ مدرسہ دیوبند کا افتتاح دیوبند جیسی گم نام بستی میں چھتہ مسجد کے انار کے درخت کے نیچے ہوا۔ جناب مولانا ملا محمود صاحب دیوبندی مدرس تھے اور مولانا محمود حسن صاحب پہلے طالب علم تھے، جنہوں نے کتاب کھولی، مدرسہ دیوبند نے اس سادگی کے ساتھ وجود میں قدم رکھا اور حسب قاعدہ اسلام تدریجی ترقی کرتا گیا مگر بانیوں کے اخلاص کی یہ خیر و برکت ہے کہ آج وہ ہر طرح سے مسلمانوں کے لئے موجبِ فخر ہے۔ مدرسہ کی ظاہری شان بھی دلفریب ہے اور اُس کے سب سے پہلے طالب علم آج تمام ہندوستان کے مقتدا اور امام مانے جاتے ہیں۔

مدرسہ دیوبند کے فوائد و برکات

مدرسہ دیوبند کی بدولت مسلمانوں کو جس قدر فوائد پہنچے ہیں اُن کا شمار دشوار ہے، مسلمان کبھی اُس کے احسان سے سبک دوش نہیں ہو سکتے، علم اور علماءِ حقانی کا سلسلہ نمونہ سلف پر اُسی کے ذریعہ قائم رہا، علوم فقہ وحدیث و جملہ علوم اسلامیہ بلا افراط

تفریط اسی کے بدولت تروتازہ رہے، مسلمانوں کو عام غلط فہمی اور گمراہی سے اسی نے بچایا، مسلمانوں کے اعتقادات کی تصحیح اور اعمال کی درستی اسی کے ذریعہ ہوئی، مدرسہ دیوبند کے ہی فیض یافتہ علماء سے آج ہندوستان کی مذہبی قوت قائم ہے، سب حضرات غور سے ملاحظہ فرمائیں کہ اس جماعت میں کیسے کیسے مدرس، مصنف، واعظ، متکلم، مناظر، صاحبِ ارشاد و تلقین موجود ہیں، میں بالتفصیل ان حضرات کا ذکر کرنا نہیں چاہتا، مگر اس قدر عرض کر دینا ضروری جانتا ہوں کہ آج ہندوستان میں علومِ اسلامیہ کی سنبھالنے والی جماعت کے ارکانِ غالب کون ہیں؟ مولانا احمد حسن صاحب امروہی، مولانا محمود حسن صاحب، مولانا عبدالعلی صاحب، مولانا خلیل احمد صاحب، مولانا اشرف علی صاحب اور اسی پایہ کے دوسرے علماء وہ ہیں جن سے آج اسلامی علوم سرسبز و شاداب ہیں، اسی جماعت کے بعض پاکباز صاحب باطن اور مقدس نفوس کی اُن اندرونی کوششوں سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے جو راس ظاہری اور عام فیضان کے علاوہ وہ اپنے نور باطن سے مسلمانوں کے دلوں کو ایک تیز روشنی پہنچا رہے ہیں۔ ان کی تاثیرات نے دلوں کی اصلاح کرنے میں کیمیائی خاصیت دکھلائی ہے، ان کے پاکیزہ ہاتھوں پر سینکڑوں، ہزاروں مسلمانوں نے اپنے نفوس کو بیچ ڈالا ہے، ان کی حکومت اجسام پر نہیں دلوں پر ہے، اختیاری نہیں، اضطراری ہے، جابرانہ نہیں، ہادیانہ ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی روحانیت سے ہمیشہ اسلام نے نشو و نما پایا، معراجِ کمال پر پہنچا اور اب اُن کی بے حد قلت ہی سے اُس کے ضعیف ہونے کی صدائیں آنے لگیں۔

ان بزرگوں کے علاوہ جن کا ذکر ہم نام بنام کر چکے ہیں مدارس اسلامیہ کے اکثر مدرس جن میں بڑے بڑے مستعد اور جامع معقول و منقول علماء ہیں سب اسی درسگاہ کے فیض یافتہ ہیں، آج جس کا جو چاہے دعویٰ کرے، مدرسہ دیوبند میں جس قدر چاہے نقص نکالے، علماء دیوبند پر جو الزام چاہے لگائے، اپنی برتری اور تفوق کے

جتنے دلائل چاہے پیش کرے، مسلمانوں کو جس طریقے سے چاہے لبھائے، مگر ذرا انصاف کر کے یہ بات بتلادے کہ اس نے مسلمانوں کو اسلام پر قائم رکھنے، ان کو بداعتقادیوں سے بچانے، ان کے علمی و عملی بازو کو مستحکم کرنے کی کیا تدبیر کی؟ اشاعتِ اسلام کے لئے جس کی ضرورت سب سے اہم اور مقدم ہوگئی ہے کون سا ایسا طریقہ قائم کیا ہے کہ طلبہ عقائد پر پختہ رہ کر اشاعت کرسکیں۔ غیروں کے حملوں سے مسلمانوں کو بچادیں، اگر ایسا نہ ہو اور مسلمان خود آزاد، بدعقیدہ، گستاخ اور بے ادب ہو کر محض الفاظ و عبادات پر جان دینے والے، معانی و حقائق سے بے خبر اور غافل ہوں تو مسلمانوں تم ہی انصاف سے کہہ دو کہ کیا یہ اسلام کی ترقی ہے؟ اس کی مثال بالکل کالمستجیر من الرمضاء بالنار (یعنی اُس شخص کی سی ہے جو گرم ریتی سے بچ کر آگ میں پناہ لے) اس کے ساتھ ہی اپنے دینی مدرسہ کے حالات اور نتائج کو بغور دیکھو اور خود ہی فیصلہ کرلو کہ انصاف کیا ہے؟ اور تم کو سلف کی راہ پر چلانے والا کون ہے؟ ہاں اگر تمہارے لئے طریقہ سلف کے علاوہ کوئی اور راستہ کھل گیا ہے اور اصولِ اسلام وہ نہیں رہے جو ابتداء میں قائم کئے گئے تھے تو ہم اپنے اس سب بیان کو واپس لیتے ہیں، لیکن ایسا نہیں ہوسکتا اور مسلمان اُس کو چھوڑ کر کہیں فلاح نہیں پاسکتے۔ مسلمان اگر اصلی اور نمائشی، ضروری اور غیر ضروری کاموں میں تمیز نہ کریں **الاھم فالاھم** کے مسئلہ کو نہ سمجھیں تو ان کو اپنی بہبودی اور بہتری سے خود ہی مایوس ہوجانا چاہئے کہ ہم مسلمانوں کے تمام طبقوں کو جن میں امراء، والیانِ ریاست، جاگیردار، تجار، ملازمت پیشہ، اہل صنعت و حرفت، صاحب سیف و قلم، جدید و قدیم تعلیم یافتہ، سب ہی لوگ شامل ہیں، ایک شاہراہ پر ڈال کر زہد کے ساتھ ثروت کو، فقر کے ساتھ غنا کو، توکل کے ساتھ تدبیر کو، علم کے ساتھ عمل کو، شریعت کے ساتھ طریقت کو جمع کر کے دکھلادیں اور سب کے سب ایک سلسلہ کے پابند ہو کر ہر صیغہ میں سبقت لے جاتے ہوئے دیکھے جائیں، صحابہؓ کی طرح **ملوک فی النهار و رهبان فی اللیل** (دن میں بادشاہ اور رات میں

زاہد و عابد) کے پورے مصداق ہوں اور دکھلا دیں کہ پختہ مسلمان ہو کر کیا نہیں کر سکتے، مسلمانو! شاید میرا یہ کہنا بدیر سمجھ میں آئے، مگر میں سچ کہتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ ہم میں کچھ خرابیاں ہیں وہ صرف اسی وجہ سے ہیں کہ ہم نے اپنے اصول اور سلف کے طریقہ کو چھوڑ دیا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم میں کچھ علم رہا بھی تو زبانی۔ علم حال وتزکیۂ نفس تو بالکل گم ہے اور نہ ہم کو اس کی فکر، اس سے بھی زیادہ غلط فہمی یہ واقع ہو رہی ہے کہ ہم اُن متوکلین اور منقطعین عن الدنیا کو جو دنیا کو ترک کر کے بیٹھ گئے ہیں، حقارت کی نظر سے دیکھتے اور ان کو بے کار اور بے کاری سکھلانے والے جانتے ہیں، حالاں کہ مسلمانوں میں ایسے طبقہ کا وجود بھی ضروری ہے اور سچ پوچھو تو کارخانۂ عالم کا وجود زیادہ تر اسی طبقہ کے سہارے قائم ہے۔

چندہ کے مدارس کا وجود

مدرسہ دیوبند کے قیام سے پہلے مسلمانوں کو مدارس قائم کرنے، چندہ وصول کرنے، روئیدادوں کے شائع کرنے، مسلمانوں کو جمع کر کے عملی نتائج دکھلانے کا طریقہ معلوم نہ تھا، مسلمان اُسی اپنی سابقہ عظمت اور تفوق کے غرہ میں تھے، حالاں کہ ان کے اندر گھن لگنا شروع ہو گیا تھا، وہ زمانہ آہی گیا تھا کہ پرانے علماء اٹھ جاتے اور درس وتدریس کا سلسلہ گم ہو جاتا، بانیانِ مدرسہ کی فراستِ ایمانی نے اس آنے والی حالت کا ادراک اور اندازہ کر کے فوراً اس مدرسہ کی بنیاد محض چندہ اور وہ بھی دیوبند جیسی گمنام اور غریب بستی کے چندہ سے ڈال دی، دیوبند کی تقلید میں دوسری جگہ سے بھی امدادیں ہوئیں، دیوبند میں اس شان سے مدرسہ کا قائم ہونا تھا کہ مسلمانوں کو یہ راہ معلوم ہو گئی۔ چھ ماہ بعد خاص سہارنپور میں چند مقدس نفوس نے مدرسہ مظاہر العلوم کی بنیاد قائم کر دی، پھر تو کیا تھا، جگہ جگہ ہر چھوٹی بڑی بستی میں مدرسے جاری ہو گئے، چندہ کی ایسی سہل ترکیب تھی کہ کسی کو کچھ بھی دقت پیش نہ آئی، یہاں تک کہ یہ سلسلہ

صرف مذہبی مدارس پر منحصر نہ رہا، بلکہ ہر قسم کے مدارس، اسکول اور کالج قائم ہو گئے، روئیداد کا طبع کرانا، حسابات ونتائج کا شائع کرنا بھی مدرسہ دیوبند ہی نے شروع کیا۔ اس سے قبل مسلمان اس کو جانتے بھی نہ تھے، یہ وہ باتیں ہیں جن کو مسلمانوں نے فوراً ہی اختیار کرنا شروع کر دیا اور ظاہر ہے کہ شرکاء چندہ کے اطمینان کی صورت اس سے بہتر کیا ہو سکتی تھی۔ مدرسہ دیوبند کا یہ احسان طبقۂ مذہب سے متجاوز ہو کر سب جماعتوں کو شامل اور عام ہو گیا۔

جلسہ دستار بندی، اس کی ضرورت اور فوائد

مدرسہ کی مفید اور قابل عمل تقلید تجاویز میں سب سے بڑھ کر بہتر اور موجب اطمینان امر انعقاد جلسۂ دستار بندی تھا، بانیانِ مدرسہ نے مسلمانوں کو ان کی امداد و اعانت کے عملی نتائج دکھلانے کے واسطے ہر تیسرے، چوتھے سال فارغ التحصیل علماء کو دستار فضیلت عطا کرنے کا طریقہ جاری فرمایا۔

شکریہ اور انعام کے موقع پر خلعت وملبوس کا عطا کرنا احادیث سے ثابت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب ابن زہیر صاحبِ قصیدہ بانت سُعاد کو چادر مبارک عطا فرمائی، جو خلفاء مروانیہ کے پاس سے منتقل ہو کر خلفاء عباسیہ اور اب سلاطین عثمانیہ کے یہاں محفوظ ہے۔ کعب ان مالک نے اُس شخص کو جو قبول توبہ کی بشارت لے کر سب سے پہلے آئے تھے کپڑے اتار دیئے، مشائخ اپنے خلفاء اور جانشینوں کو خرقہ و کلاہ عطا فرماتے تھے۔

سند اور اجازت کا دینا قرونِ اولیٰ سے مروی اور داخل دین سمجھا گیا ہے، اگر سند و اجازت کا طریقہ نہ ہوتا تو دین کے تمام معاملات مخلوط ہو جاتے، اس سند و اجازت کی ایک صورت عطاء دستار ہے، جو درجہ تکمیل کی علامت سمجھی گئی ہے، عطائے دستار میں ایک قسم کی فوقیت ہے جو سند میں نہیں، منصب اقتداء وامامت کا ہر شخص مستحق

نہیں ہوسکتا۔ دعویٰ استحقاق سے کسی کو یہ منصب حاصل نہیں ہوتا، علماء ورثۂ انبیاء ہیں، ان کے قول وفعل کو عام مسلمان بنظرِ اتباع دیکھتے ہیں، یہ گروہ فی الحقیقت دین کا حامل اور محافظ ہوتا ہے، اساتذہ اور ائمہ فن کی طرف سے کسی کو عطائے دستار کے یہی معنی ہیں کہ یہ شخص ہمارے نزدیک اپنی قابلیت اور استعداد کے اعتبار سے اس درجہ کا ہوگیا ہے کہ لوگ اُس کے قول پر اعتماد کرسکیں۔ انعقاد جلسہ ودستار بندی میں ادھر تو یہ فائدہ کہ اہل دستار کی لیاقت اور مسلمانوں پر اُن کی قابلیت کا اظہار ہوجائے، دوسرے طلبہ کو ترغیب وتحریص ہو اور بڑا فائدہ یہ کہ مسلمان اپنی اعانت کے عملی نتائج کو دیکھ کر مطمئن اور امداد مدرسہ میں زیادہ کوشاں ہوں، یہ اور اسی قسم کے وجوہات تھیں جن کی بنا پر بانیانِ مدرسہ نے یہ مبارک طریقہ جاری فرما کر دوسرے مدارسِ اسلامیہ کو بھی اس کے اجراء کا موقع دیا، اُن بزرگوں کے اخلاص وللّٰہیت کی برکت تھی کہ اُس زمانہ میں جن حضرات کو دستار فضیلت ملی ان میں سے اکثر شہرۂ آفاق، مقبول خلائق، مقتداءِ وقت اور مرجع خاص وعام بنے ہوئے ہیں''۔

جلسۂ حال کے امتیازات

اگرچہ سلسلۂ دستار بندی ۱۳۰۱ھ کے بعد بعض اسباب سے موقوف رہا، مگر بحمداللہ مدرسہ کی فیض رسانی میں کچھ کمی نہ آئی، لائق سے لائق علماء تیار کیے گئے۔ اور اب ستائیس سال کے بعد مدرسہ میں پھر وہی منظر پیش ہوگا، جس میں ۲۶/سال کے فارغ التحصیل علماء کو دستار فضیلت دی جاوے گی۔

سابق جلسے اور حال کا جلسہ یوں تو نوعیت میں یکساں ہے مگر ان میں کچھ مابہ الامتیاز بھی گزشتہ زمانہ میں جن حضرات کو دستار بندی ہوئی، اگرچہ انھوں نے اس وقت تک کوئی خاص شہرت حاصل نہ کی تھی مگر ان کے اساتذہ کی دوربین نظر نے ان کے آئندہ حالات کا ادراک کرلیا تھا؛ لیکن اب جن علماء کو دستار بندی ہوگی ان کی

حالت مختلف ہے، ان میں سے بہتوں نے تحصیل علوم کے بعد مشغلہ علمی درس، وتدریس، تحریر وتقریر، تالیف وتصنیف میں ان کا کمال مسلم ہے، یہ وہ لوگ ہیں جن کی ہر قرن میں ضرورت ہے، اور جن کی نسبت ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے دوسرے اقران پر ہر بات میں فائق ہیں وہ اپنے اسلاف کے سچے جانشین، وراثت انبیاء کے حقیقی مستحق ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کو بلا تامل دعوے کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے کہ جس فن میں جس طرح جی چاہے ان کو آزمالیا جاوے۔

اس جماعت میں علوم نقلیہ وعقلیہ کے علاوہ علم ادب وتاریخ کے پورے ماہر موجود ہیں، جو علاوہ انشاء کے عربی تقریر میں بھی پورا ملکہ رکھتے ہیں، گو ان کو کبھی اپنے اس حال کے اظہار کی نوبت نہ آئی ہو۔

اس میں ہر گز مبالغہ نہیں کہ اس مقتدر جماعت کے بہت سے ممبر اپنے اپنے ممالک میں اتنے بڑے مقتدائے عام اور مرجع خلق بنے ہوئے ہیں کہ ان کے اثر سے سیکڑوں آدمی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے، ان کے فیض ہدایت نے ہزار ہا مسلمانوں کے ایمان کو خطرہ سے بچالیا، ان کی ذات سے صد ہا مدارس آباد اور مرجع طلبہ بن گئے۔

بے شک مدرسہ دیوبند اس پر فخر کر سکتا ہے کہ وہ آج جیسے علماء کے سر پر دستار فضیلت رکھتا ہے ان کی نظیر ملنی مشکل ہے، اور بے شک مدرسہ کے معاونوں اور ہمدردوں کو اس پر ناز کرنا چاہیے کہ ان کی اعانت سے کیسے کیسے نتائج ظاہر ہوئے ہیں، مگر ہاں ہم کو یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اس جماعت اہل دستار میں اکثر حضرات بتفاوت درجات اوصاف مذکورہ کے ساتھ متصف ہیں، ہمارا یہ دعویٰ ہر گز نہیں کہ ان میں سے سب ایسے ہی ہیں۔

اس جلسہ کے امتیازات میں سے یہ بھی ایک امتیاز ہے کہ جن علماء کو اس وقت دستار فضیلت دی جائے گی ان کے شاگردوں کو بھی دستار ملے گی، اس موقع پر بالخصوص "**مدرسہ امینیہ دھلی**" کا ہم ذکر کرنا چاہتے ہیں جس کے

بانی و مہتمم اور تمام مدرس مدرسہ ہذا کے فیض یافتہ اور آج زمرۂ اہل دستار کے ممتاز طبقہ میں شامل ہیں، مہتمم صاحب مدرسہ موصوف نے اس کی درخواست کی کہ بوجہ اس تعلق خاص کے جو اس مدرسہ سے حاصل ہے، وہاں کے فارغ التحصیل طلبہ کو بھی اسی جلسہ میں دستار فضیلت دی جائے، منتظمین مدرسہ دیوبند نے اس کو بخوشی منظور فرمالیا۔

الغرض بحیثیت مجموعی یہ جلسہ دستار بندی بحمداللہ تعالیٰ اپنی قسم کے تمام جلسوں میں بے مثل اور مسلمانوں کے لیے سرمایۂ ناز اور اسلامی تاریخ میں یادگار رہنے والا ہے، اللہ تعالیٰ شرکائے جلسہ کی ہمتوں اور اخلاص میں ترقی مدرسہ کے کارناموں میں مقبولیت اہل دستار کے علوم میں برکت عطا فرمائے۔ آمین

دارالافتاء

مدرسہ کے عام فیوض و برکات میں دارالافتاء بھی ہے، اگرچہ زمانہ میں اس کا التزام رہا ہے کہ مستفتیوں کے سوالات کا ہر وقت جواب دیا جاوے۔ لیکن کثرت مسائل نے اس پر مجبور کیا کہ اس محکمہ کو مستقل کر دیا جاوے۔ چنانچہ اس کام کے لیے ایک لائق مفتی صاحب مقرر کئے گئے جو باقاعدہ طور پر مستفتیوں کو جواب مسائل عطا فرماتے ہیں۔

درجۂ تجوید وقراءت

مسلمانوں کو جس قدر فن تجوید کے حاصل کرنے کی ضرورت ہے ظاہر ہے۔ مدرسہ میں حفظ کرانے کے لیے دو حافظ مقرر تھے، مگر اس فن کا خاص اہتمام نہ تھا، آٹھ سال ہوئے کہ یہ درجہ بھی کھول دیا گیا، اور ایک قاری صاحب مستقل اس غرض کے لیے رکھے گئے اور اب بحمداللہ درجۂ عربی کی طرح اس درجہ کا فیض بھی عام وشامل ہوتا جاتا ہے، چناں چہ اس درجہ کے کئی فارغ التحصیل دوسرے مدارس میں فن تجوید کے مدرس مقرر کئے گئے۔

اشاعت و تبلیغ اسلام

اشاعت و تبلیغ اسلام کا سلسلہ علماء مدرسہ کے ذریعہ سے ہر زمانہ میں جاری رہا اور ہے، اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں کہ مدرسہ کے تعلیم یافتہ اکثر ممالک میں اس خدمت کو بخوبی انجام دے رہے ہیں؛ لیکن خاص وقتی ضرورتیں اس کی مقتضی ہوئیں کہ اب طلبہ کو اس کی بھی تعلیم دی جائے، چند سال سے یہ سلسلہ جاری ہے ان کو مناظرہ و وعظ کا کام باقاعدہ سکھلایا جاتا ہے۔ اور مذہب غیر سے فی الجملہ واقف کرایا جاتا ہے۔ بحمد اللہ اس خاص تعلیم کا اثر ایک طرف تو طلبہ پر بہت اچھا ہوا کہ وہ اس کام کے لیے مستعد اور آمادہ ہو گئے، دوسری جانب مسلمانوں کو یہ فائدہ پہنچا کہ جس جگہ اور جس وقت ضرورت پڑی دیوبند سے مناظر اور واعظوں کو بلا لیا گیا۔ ان چند سالوں میں بہت سے مواقع میں اس صیغہ کے تعلیم یافتوں نے کامیابیاں حاصل کیں؛ الغرض مدرسہ نے مسلمانوں کی مذہبی ضروریات کے پورا کرنے میں حتی الامکان پوری کوشش کی ہے، اور جس قدر ممکن ہے اس کے لیے آمادہ ہے۔

مدرسہ دیوبند کی کامیابی اور ۴۵ رسال کی آمدنی وخرچ

سب سے بڑی بات جس پر مدرسہ اسلامیہ دیوبند فخر کرے تو بے جا نہیں یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کے روپیہ کو اچھی طرح ٹھکانے لگایا، تھوڑے خرچ میں وہ کام کر دکھایا جو دوسری جگہ دس گناہ خرچ کرنے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتا، خیال فرمایئے کہ اس ۴۵ رسال کے عرصہ میں مدرسہ کے جملہ قسم کے مصارف کی میزان جس میں تعمیرات مدرسہ و مسجد و کتب خانہ، خرید کتب، انعام طلبہ سب ہی کچھ شامل ہے مبلغ تین لاکھ تین سو ترپن روپیہ ہے، اس میں سے اگر اسّی ہزار روپیہ جو تعمیر مدرسہ میں صرف ہوا ہے علیحدہ کر دیا جائے اور دس ہزار جلد کتب کی قیمت جو تخمیناً بیس ہزار روپیہ

ہے نکال دی جاویں تو گویا تعلیم پر دو لاکھ روپیہ صرف ہوا، اب ہم اس دو لاکھ کو ایک ہزار فیض یاب طلبہ پر تقسیم کرتے ہیں تو فی طالب علم دوسو روپیہ آتے ہیں۔ اللہ اکبر کیسا حوصلہ افزا نتیجہ ہے۔ یہ ہے واقعی کامیابی؛ لیکن اگر اس کے ساتھ یہ بھی دیکھا جائے کہ اس مقدار سے صرف ایک ہزار عالم ہی تیار نہیں ہوئے؛ بلکہ کئی سو حافظ قرآن بھی اسی صرف میں تیار ہوئے ہیں۔ صدہا طلبہ نے فن تجوید وقرأت بھی حاصل کیا، ہزارہا مستفتیوں کو اسی صرف میں سے ہر وقت جواب بھی ملتے رہے۔ بہت سے طلبہ جو تھوڑا سا فائدہ حاصل کر کے قبل از تکمیل چلے گئے وہ بھی اسی میں ہیں۔ صدہا باشندگان دیوبند نے فارسی وریاضی کی تعلیم بھی پائی ہے تو خرچ کا اوسط اور بھی گھٹ جاتا ہے۔

مسلمان اب خود اندازہ کرلیں کہ ان کا روپیہ کس خوبی سے اور کیسے نیک کام اور مواقع پر صرف ہوتا ہے۔

مدرسہ دیوبند کی بنیاد جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، عام چندہ پر واقع ہوئی۔ ابتداء میں گو شرکاءِ چندہ کی تعداد محدود اور قرب ونواح پر محصور تھی، مگر جوں جوں مدرسہ ترقی کرتا اور شہرت پکڑتا اور اس کا فیض عام ہوتا گیا، معاون کی تعداد بڑھتی اور ملک کے گوشہ گوشہ تک پہنچتی گئی، اگرچہ جن حضرات نے ابتداء میں امداد فرما کر مدرسہ کی بنیاد کو مستحکم فرمایا وہ سابقین اولین میں داخل ہیں، مگر جن حضرات نے مدرسہ کی ترقیات اور اس کے استحکام میں ہر قسم کا حصہ لے کر اس کی مالی حالت کو قوی اور قابل اطمینان بنایا ہے وہ بھی وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ کے مصداق ہیں۔

اس وقت حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہ کی ریاست عالیہ سے مدرسہ کو ۲۵۰ر ماہوار علیا حضرت حضور نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ والی ریاست بھوپال کی سرکار سے ۲۵۰ر ماہوار، ریاست عالیہ بھاولپور سے ماہوار، ریاست عالیہ ڈھاکہ سے ۵۰ر ماہوار کی امداد پہنچتی ہے، اور جناب قاضی علیم الدین صاحب مرحوم رئیس شاملی تقریباً

۷۰/ ماہوار کی جائیداد مدرسہ کے لیے وقف فرما گئے ہیں۔

علی ہذا عالی جناب نواب یوسف علی خان صاحب مرحوم رئیس مینڈھو نے اپنی موقوفہ جائیداد سے ۳۰/ ماہوار مدرسہ کے لیے مقرر فرما دیئے۔ یہ بڑی بڑی مقررہ دوامی آمدنیاں ہیں اور علاوہ حضرات مذکورین جناب سیٹھ غلام محمد اعظم صاحب رئیس راندیر نے سولہ ہزار کی بیش قدر رقم عطا فرما کر مدرسہ کے لیے مسجد تعمیر کرادی ہے، نواب یوسف علی خاں صاحب مرحوم نے سات ہزار روپیہ کی رقم کتب خانہ جدید تعمیر کرنے کو واسطے عطا فرمائی۔ علی ہذا بعض اہل خیر نے پندرہ سو روپیہ فرش مسجد کے واسطے عطا فرمائے، علی ہذا دوسرے اہل خیر وقتاً فوقتاً عطایائے یک مشت سے مدرسہ کی امداد فرماتے ہیں۔ کارکنانِ مدرسہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ تمام قلیل و کثیر اعانت فرمانے والے حضرات کا دلی شکریہ اسی مجلس میں ادا کریں۔

بزرگانِ اسلام! یہ آپ کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ مدرسہ ابتدائی حالت سے ترقی کرتا ہوا اس درجہ تک پہنچا اور اس سے دو نتائج ظاہر ہوئے جو دل و دماغ کو تازہ کرنے والے ہمتوں کو بڑھانے والے ہیں ہم نے اپنے اس بیان میں مدرسہ کے حالات کا مختصر تذکرہ کر دیا ہے؛ لیکن ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس دارالعلوم کی تکمیل کے لیے جو کچھ خیالات اور اس کے متعلق جتنی ضروریات ہیں ان کو بھی ظاہر کر دیں۔

مدرسہ اسلامیہ دیوبند کو مکمل و مفید تر بنانے کی تجاویز

مدرسہ اسلامیہ دیوبند بحمد اللہ مسلمانوں کی واحد مذہبی درسگاہ ہے اور بحالت موجودہ بھی اس کو مکمل و مفید عام کہا جا سکتا ہے۔ اس کے نتائج جو ہم نے بیان کیے خود شاہد عدل ہیں؛ مگر اس کو بہمہ وجوہ مکمل اور مذہبی ضروریات کا باحسن وجوہ متکفل بنانے کے واسطے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

مسلمان اس کے وسیع انتظامات معمور کتب خانہ، اور عالیشان درسگاہوں،

مدرسین کی تعداد اور طلبہ کی کثرت کو دیکھ کر یہ خیال نہ فرمائیں کہ مدرسہ ان کی امداد سے مستغنی ہوگیا، یا اس کو ان اعانت کی ضرورت نہیں رہی، اس کے لیے اب بھی ہمدردوں کی بہت ہمت وتوجہ کی ضرورت ہے۔ ہم ان خیالی و مجوزہ تجاویز کا نقشہ آپ کے سامنے کھینچنا چاہتے ہیں، جن کے ظہور پذیر ہونے پر مدرسہ کے فیوض مفید سے مفید تر ہو جائیں۔ اور ان ضروریات کو بھی ظاہر کرنا چاہتے ہیں جن کی تکمیل کی طرف آپ کوتوجہ دلائی جاتی ہے۔

(۱) مدرسہ کی تعلیمی حالت گو بحمد اللہ بہت عمدہ اور نتیجہ خیز ہے مگر اس کو کافی طور پر مکمل کرنے طلبہ کی استعداد بڑھانے واسطے کے امور ذیل زیر تجویز ہیں:

مدرسین کی تعداد مدرسہ کی حیثیت وضرورت کے لحاظ سے اول تو فی نفسہ قلیل ہے اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اکثر جماعتوں میں طلبہ کی اس قدر کثرت ہوتی ہے کہ ایک مدرس ان کو سنبھال نہیں سکتا تو اب یہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ہر ایک مدرس کے لیے ایک مددگار دیا جائے جس کے وجود سے اسباق کے انتظام میں سہولت ہو، زمانۂ سلف میں ہر مدرس کے لیے معید یعنی درس کو دُہرانے والے ہوتے تھے۔ اس زمانہ میں گو بجنسہ یہ صورت نہیں ہوسکتی، مگر اس کی ضرورت ہے کہ مدرسین کے مددگار دیئے جائیں۔

عرصہ سے یہ امر زیر بحث ہے کہ اساتذہ کے لیے فن مخصوص کر دیئے جائیں، زمانۂ سلف میں ایسا ہی ہوتا تھا، اور اب بھی اس کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مدرسہ دیوبند میں کئی سال سے اس پر غور ہو رہا ہے اور کسی قدر عمل بھی شروع ہے، مگر اس کی پوری تکمیل کے لیے تعداد مدرسین میں اضافہ کی ضرورت ہے، طلبہ کی لیاقت واستعداد کو ترقی دینے کے لیے کوئی رغبت کا سامان نہیں ہے ضرورت ہے کہ ان کے واسطے لیاقت واستعداد کے وظائف مقرر کیے جائیں۔

(۲) دارالافتاء سے مسلمانوں کی عام ضرورتوں کا تعلق ہے مدرسہ دیو بند کافی حد تک اس خدمت کوانجام دے رہا ہے، مگر ضرورت ہے کہ اس کو بالکل باقاعدہ وسیع کر دیا جائے، مفتی صاحب کو نائب ومحرر دیئے جائیں، دارالافتاء کے رجسٹر باقاعدہ ہوں، ہر باب کے فتاویٰ کا انتخاب ہوتا جائے، اور ان کی باقاعدہ مستقل اشاعت کا بندوبست کیا جائے، اگر یہ سلسلہ استحکام کے ساتھ قائم ہو گیا تو عجیب وکارآمد مجموعہ فتاوے کا تیار ہو جائے گا۔

(۳) اس وقت مسلمانوں کو بہت بڑی اور اہم ضرورت اشاعت اسلام وتبلیغ احکام کی ہے جس کے لیے جا بجا تدبیریں ہو رہی ہیں؛ بلکہ جہاں تک خیال کیا گیا، اس کے واسطے سب سے بہتر جگہ مدرسہ دیو بند ہے، یہاں کے طلبہ جو علوم عقلیہ ونقلیہ میں ماہر اور عقائد واعمال پر پختہ ہوتے ہیں، ان کی تعلیم ونصیحت کا اثر مسلمانوں پر زیادہ ہوتا اور مناظرہ وگفتگو میں بھی ان کی بات باوقعت اور وزن دار ہوتی ہے، اس وقت بھی مدرسہ میں یہ سلسلہ قائم ہے مگر غیر مستقل اس کو باقاعدہ قائم کرنے اور اس کے عملہ کو علیٰحدہ کرنے کی ضرورت ہے، اگر مدرسہ دیو بند میں اس کا انتظام ہو گیا تو مسلمانوں کو لائق وقابل قدر واعظ ومناظر مل سکیں گے، اور مدرسہ کے فارغ التحصیل لوگوں کے لیے ایک قابل تحسین اور ضروری مشغلہ نکل آئے گا۔

(۴) کم سن بچوں کی نگرانی وتعلیم کا کوئی خاص بندوبست نہیں ہے، بسا اوقات مقتدر حضرات نے اپنے بچوں کو مدرسہ میں بھیجنا چاہا، مگر یہاں سے یہی عذر کر دیا گیا؛ لیکن یہ امر اکثر نیک خیال لوگوں کی دل شکنی کا باعث ہوتا ہے کچھ عرصہ سے ذمہ دار اصحاب کا خیال اس طرف رجوع ہے کہ کم سن بچوں کو خرابی اعتقادات سے بچانے اور درسی تعلیم کے لیے مستقل سلسلہ قائم کر دیا جائے، ان کے لیے علیٰحدہ مدرس، علیحدہ نگراں، علیٰحدہ مکان تعمیر کرایا

جائے، تاکہ ہر طبقہ کے مسلمان اپنے بچوں کو باطمینانِ قلب داخل مدرسہ کردیں بچوں کے والدین اس خرچ کے متکفل ہوں گے، عنقریب اس کے قواعد مرتب کر کے شائع کردیئے جائیں گے۔

(۵) مدرسہ دیوبند میں ایک عظیم الشان کتب خانہ موجود ہے جس میں تقریباً دس ہزار جلدیں ہر فن کی ہیں مدرسہ ہر سال اپنی وسعت کے موافق اس میں اضافہ کرتا رہتا ہے، بہت سی نادر اور قلمی کتابیں جمع بھی کرلی گئی ہیں ابھی چند ماہ ہوئے زر کثیر صرف کر کے کتاب الجوہر المضیئہ کا خوشخط اور صحیح نسخہ بہم پہنچایا ہے۔

روداد ہائے مدرسہ میں مسلمانوں کو ادھر توجہ دلائی گئی، اور اب پھر عرض کیا جاتا ہے کہ ان کی تھوڑی سی توجہ و ہمت سے یہ کتب خانہ بے مثل اور نادر کتابوں کا مجموعہ بن سکتا ہے، اکثر علمی خاندانوں اور رؤسا کے یہاں کتابوں کے ذخیرے موجود ہیں جو آہستہ آہستہ تلف ہوتے جاتے ہیں، اگر ایسے کتب خانہ مدرسہ میں بھیج دیئے جائیں، تو اُدھر وہ کتابیں محفوظ ہو جائیں، اِدھر مدرسہ میں بے بہا ذخیرۂ کتب جمع ہو جائے، جس سے ہر طبقہ کے مسلمان فائدہ اٹھا سکیں اکثر علماء و مصنفین کو اس قسم کی کتابوں کا میسر آنا دشوار ہوتا ہے مدرسہ کے کتب خانہ سے سب حضرات نفع اٹھا سکیں گے چند سال ہوئے سندھ کے مشہور و معروف درویش پیر صاحب مدظلہ نے یہ خیال ظاہر فرمایا تھا کہ دیوبند میں عام کتب خانہ قائم کیا جائے جس کے لیے مکان و عملہ سب علیحدہ ہوں، اور اس کے واسطے محرر و ناقل ملازم رکھے جائیں اس میں یہ بھی اہتمام ہو کہ جن صاحب کو کوئی کتاب نقل کرانا ہو نقل کرادی جائے، یہ رائے بھی مفید ہے اور اگر مسلمان اِدھر توجہ فرمائیں تو کچھ دشوار نہیں ہے، خان بہادر جناب مولوی نظام الدین احمد صاحب ڈپٹی

کلکٹر بلیا نے یہ مثال قائم کردی ہے آپ نے اس سال اپنے قدیم کتب خانہ کی بہت سی کتابیں مدرسہ میں ارسال فرمادیں۔

(۶) عرصہ آٹھ سال سے مدرسہ میں درجہ تجوید وقرآت بھی کھولا گیا ہے، مسلمانوں کو اس فن کی جس قدر ضرورت ہے ظاہر ہے، لیکن ابھی تک اس درجہ میں صرف ایک مدرس ہیں، خیال ہے کہ اس درجہ کو مکمل کردیا جائے، مدرس بھی بڑھائے جائیں اوراس درجہ کے طلبہ کے لیے وظائف کا انتظام بھی ہو۔

(۷) مدرسہ دیوبند میں غیر مستطیع طلبہ کو نقد وظائف ملتے ہیں، باورچی خانہ کا خاص اہتمام نہ تھا، بزمانہ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب اس کا انتظام شروع ہوا تھا مگر بوجوہ اس کو بند کردیا گیا، اب ادھر تو طلبہ کو تکلیف، دوسری جانب طلبہ مستطیع کی حالت دیکھ کر ضروری ہوگیا کہ باورچی خانہ کا اہتمام کیا جائے، چنانچہ ابھی چند ماہ ہوئے، مختصر طور پر باورچی خانہ قائم کردیا گیا، جس سے ہر درجے وطبقے کے طلبہ کو پختہ کھانا مل سکے گا، مگر ظاہر ہے کہ اس صورت میں مدرسہ پر بہت زیادہ خرچ پڑتا ہے، مسلمانوں کو طلبہ کی امداد میں خاص حصہ لینا چاہیے، اس کے متعلق ایک خاص صورت بھی تجویز کی گئی ہے کہ زراعت پیشہ حضرات فصل پر غلہ سے امداد فرمائیں، یہ سلسلہ کچھ کچھ شروع ہوا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ ترقی پذیر ہو۔ باورچی خانہ مستقل طور پر قائم ہو جانے کے بعد ان طلبہ کا انتظام بھی مدرسہ میں ہوگا جو اپنے مصارف کے خود متکفل ہوتے ہیں۔

(۸) ایک بڑی بات قابل خیال یہ ہے کہ مدرسین مدرسہ کی تنخواہیں بہت ہی قلیل ہیں، اگرچہ مدرسین کے اخلاص وللّٰہیت کی یہ کافی دلیل ہے کہ وہ قلیل تنخواہ پر مدرسہ میں کام کرتے ہیں مگر ضروریات زندگی ان کو مجبور کرتی ہیں، اس لیے بہت ضروری ہے کہ ان تنخواہوں میں معقول اضافہ کیا جائے۔

(۹) مدرسہ میں درسگاہوں کی بہت کمی ہے، اگر تعداد مدرسین میں اضافہ ہوا تو اور بھی ضرورت بڑھ جائے گی، علی ہذا طلبہ کے لیے جائے قیام کا کافی انتظام نہیں ہے، ایک دار الطلبہ ۱۳۱۵ھ میں تعمیر ہوا تھا، مگر وہ بالکل ناکافی ہے اب تعداد اس قدر بڑھ گئی ہے کہ کوئی صورت موجودہ مکان میں ان کے آرام کی نہیں ہے، مدرسہ نے ایک قطعۂ زمین خاص اسی ضرورت کے لیے جانب جنوب خریدا ہے، اور ایک قطعہ مسجد مدرسہ کے متصل جانب شمال اسی غرض کے لیے خریدا ہے، نو عمر بچوں کے قیام و انتظام کے لیے علیحدہ مکان کی ضرورت ہے، ہم تمام اہل اسلام کو بلا امتیاز اِدھر متوجہ کرتے ہیں کہ وہ مدرسہ کو کامل و مکمل بنانے میں پوری سعی فرمائیں۔

تکمیل ضروریات کی صورت یہ ہے کہ:

(۱) چندہ دوامی میں اس قدر امداد فرمائی جائے کہ تعداد مدرسین اور ان کی تنخواہوں میں متعد بہ اضافہ ہو سکے۔

(۲) چندہ صرف طلبہ میں اس قدر امداد ہونی چاہیے کہ موجودہ طلبہ درجہ عربی کے لیے جن کی تعداد اس وقت ۲۵۰ / ہے ہر قسم کا انتظام ہو سکے اور منتظمان مدرسہ کا یہ خیال کہ مدرسہ میں درجہ عربی کے اندر ایک ہزار طلبہ تک تعلیم پا سکیں پورا ہو سکے۔

(۳) تعمیر میں دار الطلبہ جانب جنوب کے لیے بیس ہزار روپیہ اور دار الطلبہ جانب مسجد کے لیے پانچ ہزار روپیہ، درسگاہوں کی تعمیر کے لیے پندرہ ہزار روپیہ مکانات سکونت برائے نو عمر اطفال دس ہزار روپیہ، مجموعی تعمیر میں پچاس ہزار روپیہ کی ضرورت ہے، اور ارباب ہمم اس طرح بھی اس ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں کہ ایک ایک کمرہ جس لاگت ۵۰۰/ روپیہ فی کمرہ اور ۳۰۰/ روپیہ فی کمرہ ہوگی اپنے ذمہ لے کر اپنی خاص امداد سے تعمیر کرا دیں۔

بزرگانِ اسلام! ہم نے مدرسہ کے متعلق انتظامی حالت کو مکمل و مفید بنانے کی صورتیں عرض کردی ہیں، لیکن اس کے فیوض اور ہر طبقہ کے لیے مفید بنانے کے متعلق اور بھی صورتیں زیر تجویز بلکہ زیر عمل ہیں، اہل علم کے طبقہ کے لیے اور ان کے ذریعہ سے عام مسلمانوں کے لیے مدرسہ دیوبند کا وجود رحمت الٰہی ہے، جس کا اعتراف بلا تامل کیا جاتا ہے؛ لیکن اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مدرسہ کی نگرانی میں ایسا انتظام ہونا چاہیے جس کے ذریعہ سے جدید تعلیم یافتہ اور عام مسلمان بلا واسطہ نفع اٹھا سکیں، اس لیے یہ تجویز کیا گیا ہے کہ سلسلۂ تصنیف و اشاعتِ علوم جو اس وقت تک شدید ضرورت ہے جس پر مسلمان بلا تامل اعتماد کرسکیں اور اس پر عمدہ اور صحیح فوائد ایسے چڑھائے جائیں کہ عوام اور متوسط درجہ کے مسلمانوں کو بے حد مفید اور موجب اطمینان ہوں، یہ ترجمہ شروع ہوگیا ہے اور انشاء اللہ عنقریب اس کی اشاعت کی صورت ہوجائے گی۔

مسلمانوں کو اس کی بھی ضرورت ہے کہ ان کو سیدھے اور صاف مسائل، سلف کے حالات بلا کم و کاست اور بلا تحریف و تبدیل معلوم ہوتے رہیں، اس لیے اس کا بھی انتظام کیا گیا ہے کہ ایک ماہوار رسالہ مقدس علماء کے زیر انتظام ان کے پاکیزہ مضامین کا مجموعہ شائع ہوتا رہے۔

جدید تعلیم یافتہ حضرات کو یہ شکایت نہ رہے کہ مدارس اسلامی کے وجود سے ہم کو کیا فائدہ، ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ قائم ہوکر مسلمانوں کے لیے سیدھا اور صاف راستہ کھل جائے گا، اس سلسلہ کے انتظام و مصارف کا تعلق مدرسہ سے ہوگا۔

آخر میں میرے ذمے ضروری ہے کہ آپ حضرات کے تکلیف گوارا کرنے اور اسلامی مجمع میں محض لوجہ اللہ تشریف لانے کا شکریہ ادا کروں۔

اور ہم پر اور نیز آپ سب حضرات پر نہایت ضروری ہے کہ گورنمنٹ کے بے حد احسانات کا (جن میں بہت بڑا احسان یہ ہے کہ ہم اس کے ظل عاطفت

میں نہایت آزادی کے ساتھ مذہبی فرائض ادا کرتے اور ترقی مذہب کے لیے ہر قسم کی کوشش کرتے ہیں) شکریہ ادا کریں۔

بے شک اگر ہم ایسی مہربانی اور عادل گورنمنٹ کا وفاداری کے ساتھ شکریہ ادا نہ کریں تو ناسپاسوں کی فہرست میں داخل ہو جائیں گے۔

اب میں اپنی اس تحریر کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ "اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو، اور سب اہل اسلام کو اس کی توفیق عطا فرمائے کہ باہم اتفاق واتحاد کے ساتھ اسلام کی خدمت میں مصروف ہو جائیں اور اپنی تمام ہمتوں کو سب اختلافات ومناقشات سے پاک کر کے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا میں صرف کریں، اور اپنی دینی ودنیوی ضروریات کو صحیح سمجھ کر اصول شریعت کے موافق اس کے لیے سعی اور فکر کریں۔ حق تعالیٰ مسلمانوں کی کوششوں میں برکت عطا فرمائے اور یہ علوم کا سلسلہ رونق وکامیابی کے ساتھ جاری رہی۔ آمین یارب العٰلمین، ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنة و فی الاٰخرة حسنة وقنا عذاب النار، و صلی اللّٰہ علی خیر خلقه سیدنا و مولانا محمد و اٰله و صحبه وسلم۔

الملتمس خادم الاسلام و المسلمین

محمد احمد ابن حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ العزیز

۶ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ مقام دیوبند

ضابطہ جامعہ نظامیہ عثمانیہ حیدرآباد

از قلم: فخرالاسلام حضرت مولانا محمد احمدؒ صاحب

تعلیم بطریق اہل سنت والجماعت

دفعہ۔ ۱: مدرسۂ نظامیہ میں اہل السنّت والجماعت کے طریقہ پر علوم عربیہ دینیہ کی اعلیٰ تعلیم دی جائے گی اور اس کے خلاف کسی دوسرے طریقہ پر دینا اصول مدرسہ اور ارادۂ بانی کے خلاف ہوگا لہذا کسی وقت اس میں تغیر وتبدل نہ ہوسکے گا۔ لیکن چونکہ ہندوستان کے باشندوں کا طریقہ بالعموم حنفی ہے اس لیے بانی مدرسہ نے اس طریقہ کی پابندی رکھنا لازمی قرار دیا ہے اس کے خلاف کبھی نہ ہوسکے گا لیکن اگر اس کے ساتھ مذہب اربعہ مجتہدین میں سے علاوہ مذہب حنفی کے دوسرے طریقہ کے مقلد تعلیم پانا چاہیں تو تعلیم پاسکیں گے اور اگر ان کے لیے اس مذہب کے درس کی ضرورت بھی پیش آئے گی تو ایسے مدرسوں کا تقرر خلاف اصول مدرسہ نہ ہوگا۔

دفعہ۔ ۲: اس مدرسہ کے ارکان انتظامی مدرسین اور جملہ کارپرداز وہی اشخاص ہوسکیں گے جو سنی حنفی طریقہ کے پابند ہوں لیکن جیسا کہ مقلدین مذاہب اربعہ کے متعلق دفعۂ (۱) میں استثناء کیا گیا ہے، اس دفعہ میں استثناء سمجھنا چاہیے، ارکان مجلس میں دوثلث علماء کا ہونا لازمی ہے۔

مقاصد جامعہ نظامیہ

دفعہ ۔۳: مدرسہ کا مقصد کلی وہی ہے جو دفعۂ اول میں مذکور ہوچکا ہے لیکن درجہ تفصیل میں مدرسہ کے مقاصد حسب ذیل صورتوں میں منقسم ہوں گے۔

الف: بہ تعمیل ارشاد خداوند عالم و لتکن منکم امة یدعون الی الخیر و یأمرون بالمعروف و ینھون عن المنکر علماء باعمل کی ایسی جماعت کا تیار کرنا جو علم دین کی اشاعت احکام اسلام کی تبلیغ اور علوم دینیہ کے قابل ہو اور عامۃ المسلمین کے لیے ان کی تمام مذہبی ضروریات کی سرانجامی و رہبری کر سکے۔

ب: عامہ مسلمین کے لیے بقدر ضرورت دینی تعلیم کا انتظام۔

ج: فرزندان اہل خدمات شرعیہ کی تعلیم کا خاص انتظام۔

د: تبلیغ و اشاعت اسلام تقریر اور تحریر تالیف و تصنیف، وصیانت اسلام۔

تشریح دفعہ سوم: مقاصد مدرسہ میں مقصد الف اصل و بالذات ہے اور دوسرے مقاصد درجۂ ثانویہ میں ہیں اور تعلیم قرآن مجید و قرأت و تجوید اور بعض تمہیدی تعلیمات مثل قدر ضرورت، فارسی، ریاضی سب مقصد اول میں داخل ہوں گے۔

مقصد الف: باعتبار نوعیت کے کبھی نہیں بدل سکتا، البتہ نصاب تعلیم میں بقدر ضرورت تغیر و تبدل ہو سکتا ہے لیکن اسی حد تک کہ اصل مقصد میں نقص نہ آئے۔

ضابطۂ انتظامی جامعہ نظامیہ

دفعہ-۴: مدرسہ نظامیہ کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس کی سرپرستی اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی مدظلہم العالی نے بہ نفس نفیس منظور فرمائی ہے۔

دفعہ- ۵: مدرسہ کے جملہ ضوابط و قواعد و دستور العمل اعلیٰ حضرت کی منظوری سے جاری ہوں گے اور اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل بلا منظوری نہ ہو سکے گا۔ ضابطۂ ہٰذا تاریخ منظوری اعلیٰ حضرت مدظلہم العالی سے اس وقت تک جاری رہے گا جب تک بمنظوری اعلی حضرت اس کی ترمیم یا تنسیخ نہ ہو۔

دفعہ- ۶: میر مجلس کا تقرر ہمیشہ اعلیٰ حضرت کے حکم سے ہوگا ارکان مجلس کی خالی

شدہ جگہ یا از سر نو انتخاب کی صورت میں میر مجلس ایسے اسماء کی فہرست حسب تجویز مجلس بغرض انتخاب اعلیٰ حضرت کی خدمت می پیش کرنے کا مجاز ہوگا۔

فرائض مجلس انتظامی

دفعہ -۷: مجلس منتظمہ کے فرائض حسب ذیل ہوں گے۔

الف: اعلیٰ حضرت سر پرست مدرسہ کے احکام کی وقتاً فوقتاً تعمیل کرنا۔

ب: مدرسہ کے لیے قواعد وضوابط کا مرتب کرنا، ترمیم وتوضیح کرنا ہر شعبہ کے لیے دستور العمل بنانا، نصاب تعلیم کا مرتب کرنا اس میں تغیر وتبدل کرنا۔

ج: نظام مدرسہ کو بہ پابندی ضوابط و دستور العمل بہ حسن اسلوب قائم رکھنا مدرسہ کے ہر شعبہ کی نگرانی کرنا۔

د: مدرسہ کی حالت درست رکھنا، اور اس کی کامل نگرانی رکھنا موازنہ سالانہ مرتب کرنا اور بروقت منظور کرنا، سرکاری امداد میں حسب ضرورت وقت اضافہ کی خواہش کرنا، اہل اسلام کو مالی امداد کی طرف متوجہ کرنا، اور فراہمی چندہ کی حتی الامکان کوشش کرنا۔

اندرون موازنہ رقومات کے صرف کرنے کا دستور العمل علیٰحدہ بنایا جائے گا۔

اختیارات مجلس انتظامی

دفعہ -۸: مجلس منتظمہ کے اختیارات حسب ذیل ہیں:

الف: تمام اہم معاملات مجلس منتظمہ میں طے ہوں گے اور مجلس منتظمہ کے فیصلے دو قسموں پر منقسم ہوں گے۔

(۱) کلی معاملات یا تغیر وتبدل قواعد یا دستور العمل یا نصاب یا اہم اختلافی معاملات مابین ملازمان مدرسہ وکار پردازان مدرسہ یا مابین ملازمین وطلبہ جن کا اثر نظام مدرسہ پر پڑتا ہے اس قسم کے جملہ معاملات کے تجاویز بغرض

منظوری اعلیٰ حضرت کے ملاحظہ میں گزارنے جائیں گے اور تا حصول منظوری ان تجاویز پر عمل درآمد نہ کیا جائے گا۔

تشریح: حسب قواعد فیصلہ کثرت رائے پر ہوگا اور درصورت اختلاف آرا کسی رکن کے اصرار پر ان کی رائے علیحدہ درج کی جائے گی۔

(۲) روزمرہ کے معاملات جزئیہ متعلق رخصت وادخال طلبہ وغیرہ یا وہ معاملات جن کی کلی منظوری حاصل ہو چکی ہے اس قسم کے تجاویز مختصر طور پر اطلاعاً ملاحظہ اقدس میں گزرائی جائیں گی۔

ب: تمام عہدہ داران و ملازمان مدرسہ کے تقرر عزل، معطلی، بحالی رخصت اور جملہ امور متعلقہ ملازمت کا کلی اختیار، طلبہ و مدرسین کی درخواستوں پر غور کرنا، اور مرافعوں کی سماعت کرنا مابین مدرسین و ملازمین پر اختلافی معاملہ پر غور کرنا اور تجویز کرنا۔

ج: ہر سالِ تعلیمی کی ابتداء حسب گنجائش موازنہ طلبہ قابل امداد کی تعداد کا معین کرنا، اور دارالاقامہ کے طلبہ کی تعداد کا معین کرنا، درمیان سال میں زائداز منظوری طلبہ کے ادخال کا اختیار بھی ہوگا، یا زائداز موازنہ کسی اور صرف کی منظوری دینا۔

د: اخراج طلبہ کا اختیار یا مستحق تنبیہ طلبہ کو حسب داعیہ ضرورت وقت معین تک مدرسہ کی امداد سے انتہاءً محروم کرنا۔

ہ: امتحانات سالانہ وشش ماہی کے لیے وقت کا اعلان ممتحنین کا انتخاب۔

و: علاوہ ان تعطیلات کے جو مدرسہ کے لیے حسب تجویز مجلس انتظامی منظور ہو چکے ہیں حسب ضرورت وقت خاص تعطیلات کا دینا۔

ز: ناظم و مہتمم کے فیصلوں کا تصفیہ کرنا۔

ح: مجلس کو اختیار ہوگا کہ کسی عہدہ دار کو خاص اختیارات عطا کرے یا کسی کے

اختیارات سلب کرے یا ارکان مجلس میں کسی ایک یا زائد رکن کو مجتمعاً و منفرداً خاص اختیارات کے ساتھ خاص کام پر مامور کرے۔

ط: ہر ایک رکن کو اختیار ہوگا کہ کوئی تجویز مجلس انتظامی میں پیش کرے، اور بعد اطلاع ناظم و مہتمم براہ راست مدرسہ کے کسی شعبہ کا معائنہ کرے اور کیفیت معائنہ لکھے یا مجلس میں اپنی کیفیت پیش کرے۔

اجلاس مجلس انتظامی کا انعقاد

دفعہ-۹: ہر ایک ماہ کے ہفتۂ دوم یوم جمعہ میں ایک مرتبہ مجلس منتظمہ کا اجلاس ہونا ضروری ہے جس میں تصفیہ طلب مسائل اور رپوٹ ناظم تعلیم یا مہتمم وغیرہ پیش ہوا کریں گے، میر مجلس تاریخ اجلاس کی اطلاع ارکان کو ایک ہفتہ قبل دیا کریں گے۔

دفعہ-۱۰: اندرون ماہ کسی خاص ضرورت سے حسب تجویز میر مجلس یا حسب خواہش ارکان انتظامیہ اجلاس مجلس منعقد ہوسکتا ہے اور اس کی اطلاع چار یوم قبل ہونا ضروری ہے۔

دفعہ-۱۱: میر مجلس کسی فوری ضرورت کے لیے فوراً جلسہ کو طلب کرسکتے ہیں یا بذریعہ گشتی آراء اراکین حاصل کرکے اجراء کرسکتے ہیں لیکن ایسے معاملات کا متعاقب جلسۂ انتظامیہ میں بغرض تنقیح پیش کرنا ضروری ہوگا۔

دفعہ-۱۲: منجملہ ارکان مجلس کے نصف ارکان کے اجتماع سے نصاب مجلس پورا ہوجائے گا اگر نصف ارکان جمع نہ ہوں گے تو جلسہ کو ملتوی کرکے دوسری تاریخ معین کی جائے گی، اگر اس ملتوی شدہ تاریخ میں بھی نصاب پورا نہ ہو تو بذریعہ گشتی کے رائے حاصل کرلی جائے اور متعاقب جلسہ انتظامیہ میں بغرض اطلاع پیش کردیا جائیگا۔

دفعہ-۱۳: معتمد یا اراکین میں سے ہر ایک کو اختیار ہوگا کہ عند الضرورت میر مجلس سے استدعاء جلسہ غیر معمولی کریں اور میر مجلس ضرورت سمجھیں گے تو جلسہ غیر

معمولی منعقد کریں گے۔

اختیارات مجلس انتظامی

دفعہ-۱۴: میر مجلس کے اختیارات حسب ذیل ہوں گے:

الف: کوئی جلسہ بغیر میر مجلس یا ان کے قائم مقام مجوزہ میر مجلس کے منعقد نہ ہو سکے گا۔

ب: اعلیٰ حضرت سرپرست مدرسہ کے ملاحظہ میں جملہ عرضداشت متعلق مدرسہ بدستخط میر مجلس پیش ہوں گے۔

ج: جن طلبہ کو خوراک یا وظیفہ دیا جائے گا یا دارالاقامہ میں جگہ دی جائے گی ان کا داخلہ بمنظوری میر مجلس ہوگا۔

د: ملازمان مدرسہ کی برطرفی، معطلی، وبحالی بغیر تجویز مجلس انتظامی نہ ہو سکے گا، لیکن میر مجلس کو اختیار ہوگا کہ کسی ضرورت کے وقت معطلی کا حکم دے کر فوراً ارکان مجلس انتظامیہ سے رائے حاصل کر کے فیصلہ مجلس پر عمل درآمد کریں۔

ہ: میر مجلس کو اختیار ہوگا کہ اراکین مجلس انتظامیہ سے کسی رکن کو کسی کار خاص کے لیے وقت معین تک مامور کریں لیکن دائمی طور پر یا طویل مدت کے لیے زائد از ایک ماہ بغیر فیصلہ مجلس انتظامیہ نہ کر سکیں گے۔

و: علاوہ ان رقوم کے لیے جو موازنہ میں منظور ہو چکی ہیں کسی خاص ضرورت کے وقت پچاس روپیہ تک میر مجلس اپنے اختیار سے صرف کر سکتے ہیں لیکن متعاقب اس کی اطلاع مجلس انتظامیہ کو دے کر رائے حاصل کر لی جائے۔

ز: میر مجلس کو اختیار ہوگا کہ بمنظوری مجلس اپنے متعلقہ کاموں میں سے کسی کام کو معتمد کو تفویض کر دیں اس حالت میں معتمد کا کام میر مجلس کا کام ہوگا۔

ح: میر مجلس کو اعلیٰ حضرت کی خدمت میں اپنی ذاتی رائے بمصالح مدرسہ پیش کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

معتمد مجلس انتظامی کے اختیارات

دفعہ - ۱۵: مجلس انتظامیہ کے لیے ایک معتمد بھی ہوگا جو اراکین مجلس میں سے ہوگا، اور اس کا انتخاب مجلس انتظامیہ کے اختیار میں ہوگا اور بداعیہ ضرورت غیر ارکان میں سے کسی کو معتمدی کے لیے تجویز کر کے اعلیٰ حضرت کی منظوری حاصل کی جا سکتی ہے بعد منظوری وہی ارکان مجلس میں داخل سمجھے جائیں گے۔

معتمد مجلس کے اختیارات و فرائض حسب تفصیل ذیل ہوں گے:

الف: معتمد مجلس کا فریضہ ہوگا کہ دفتر مجلس کو باقاعدہ مرتب رکھیں۔

ب: مجلس انتظامیہ یا میر مجلس کے احکام بذریعہ معتمد جاری ہوں گے۔

ج: معتمد مجلس کو اختیار ہوگا کہ مدرسہ کے ہر عہدہ دار سے ان کے صیغہ متعلقہ کے رجسٹر یا کاغذات طلب کریں۔

د: جملہ کاغذات مدرسہ خواہ کسی شعبہ کے ہوں اور جملہ درخواستیں مدرسین وطلبہ کی بذریعہ معتمد مجلس میر مجلس یا مجلس انتظامیہ میں پیش ہوں گے، اور ہر ایک کاغذ یا درخواست پر اگر ضرورت سمجھیں کیفیت لکھ کر پیش کریں گے۔

ہ: محکمہ جات سرکاری میں جس قدر مراسلت ہوگی معتمد کی دستخط سے ہوگی، خزانہ عامرہ سے روپیہ وصول کرنا یا کھاتۂ امانتی میں جمع کرنا یا واپس لینا معتمد کی دستخط سے ہوگا ان سب معاملات میں اول میر مجلس سے منظوری حاصل کرنا ضروری ہوگا۔

و: شعبہ ہائے تعلیمی وحسابی وانتظامی کی نگرانی اور وقتاً فوقتاً تنقیح و جانچ معتمد مجلس کے فرائض میں سے ہے۔

ز: ہر ایک قسم کے معاملہ میں معتمد کو بحیثیت معتمد اپنی رائے پیش کرنیکا حق ہوگا۔

ح: مجلس انتظامیہ علی العموم معاملات کی تنقیح یا خاص معاملات وحالات کی تحقیق

بذریعہ معتمد کرے گی اِلّا یہ کہ کسی خاص معاملہ کے لیے خاص ارکان کو یا علاوہ ارکان کے غیر ارکان کو مقرر کریں۔

ط: معاملات زیر بحث کی فہرست تیار کر کے مجلس میں پیش کرنا بھی معتمد سے متعلق ہوگا۔

ی: مدرسہ کی ماہانہ روداد مختصری بغرض پیشی اعلیٰ حضرت مرتب کرنا۔

ک: معتمد کوئی کام خلاف تجویز مجلس انتظامی اور بغیر اطلاع میر مجلس کے نہ کر سکیں گے۔

ل: زائد از اختیار ناظم و مہتمم مدرسین و ملازمین کی رخصت کا اختیار۔

شعبہ جات انتظامی

دفعہ-۱۶: مدرسہ کے تمام شعبوں کا انتظام دو حصوں پر منقسم کیا جائے گا ایک تعلیمی، دوسرا مالی و حسابی و انتظامی، شعبۂ تعلیمی ایک ناظم (پرنسپل) کے متعلق ہوگا، شعبۂ تعلیمی میں مدرسہ کے جملہ شاخیں متعلقہ تعلیم شاخ تعلیم عام و تعلیم فرزندان اہل خدمات شرعیہ شامل ہیں، اور دارالافتاء اور دارالاقامہ اور صیغہ طبابت اور پہرہ وغیرہ داخل ہوں گے اور یہ شعبہ ناظم تعلیم کے متعلق ہوگا، ناظم مدرسہ کے لیے لازم ہے کہ وہ عالم بااستعداد، ذی اثر، باوجاہت اور قوت انتظامی رکھنے والے ہوں۔

اور شعبۂ مالی و حسابی میں دفتر مدرسہ، کتب خانہ، مطبخ، تعمیرات، صفائی، روشنی وغیرہ صیغہ شامل ہوں گے اور یہ صیغہ مہتمم مدرسہ کے متعلق ہوگا اور ہر دو عہدہ دار اپنے اپنے مفوضہ فرائض کے مستقل ذمہ دار ہوں گے اور براہ راست مجلس انتظامی کے ماتحت ہوں گے عموماً یہی طریقہ تمام کالجوں میں رائج ہے۔

البتہ مہتمم معاملات تعلیمی میں ناظم کے مددگار رہوں گے، احکام ناظم متعلقہ تعلیم مثل طلبہ کی خوراک جاری کرنے یا بند کرنے وغیرہ امور کے جن کا تعلق مہتمم سے ہے ان کی تعمیل مہتمم پر لازم ہوگی اور سالانہ امتحانات اور نقشہ جات تعلیم کی ترتیب میں مہتمم صاحب معہ اپنے عملہ کے ناظم صاحب کے کام میں امداد دیں گے۔

فرائض ناظم تعلیمات (شیخ الجامعہ)

دفعہ-۱۷: ناظم تعلیم کے فرائض واختیارات حسب تفصیل ذیل ہوں گے:

الف: ناظم تعلیم کا قیام شب وروز احاطۂ مدرسہ میں لازم ہوگا اوران کو بغرض قیام مدرسہ کے مکانات میں سے کوئی مکان دیا جائے گا۔

ب: نصاب تعلیم ودستورالعمل متعلقہ تعلیم کی پابندی سے نظام تعلیم کو قائم وجاری رکھنا اوقات درس میں مدرسین وطلبہ کی حاضری اور مشغولی درس کی نگرانی، وقتاً فوقتاً اوقات درس میں جاکر دیکھنا یا امتحان لینا۔

ج: طلبہ کی محنت وشوق مطالعہ وکتب بینی کی نگرانی طلبہ کی شرعی ہیئت ووضع کا پابند رکھنا ان کی اخلاقی ومعاشرتی اصلاح ان کی حفظ صحت کا انتظام دارالاقامہ میں ان کے طرز وبودوباش کی نگرانی۔

د: ابتداء سال میں نقشہ تعلیم حسب ترتیب جماعت وتقسیم مدرسین مرتب کرنا وپابندی دستورالعمل۔

ہ: امتحانات سالانہ وسہ ماہی کے نقشہ جات کا مرتب کرنا اوران کے نتائج کا انتخاب کرنا اور مجلس انتظامی میں بغرض منظوری پیش کرنا۔

و: قابل عطائے اسناد یا عطائے صداقت نام جات طلبہ کی فہرست منتخب کرکے مجلس سے منظوری حاصل کرنا۔

ز: امتحان داخلہ طلباء اوراس کی جانچ کہ طالب علم میں قابلیت تحصیل علم ہے یا نہیں اور اقرار نامہ لکھوا کر قابل ادخال طلبہ کی فہرست بنا کر میر مجلس کے پاس پیش کرنا، لیکن جن طلبہ کا وظیفہ مقرر نہیں کیا جائے گا یا ان کو دارالاقامہ میں جگہ نہ دی جائے گی ان کا داخلہ بہ اختیار ناظم ہے، ایسے طلبہ کی فہرست پیش کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

ح: تعلیم کے متعلق سالانہ رپورٹ مرتب کرکے مجلس میں پیش کرنا۔

ط: ابتدائے سال تعلیمی میں یہ پابندی دستور العمل تعلیم اور تقسیم جماعت وتعین اوقات کا ایک مکمل نقشہ مرتب کر کے مجلس میں بغرض اطلاع بھیجنا۔

ی: مدرسین مدرسہ کو درصورت کسی قسم کی کوتاہی دربارۂ حاضری یا تعلیم کے ان کے احترام کا لحاظ رکھتے ہوئے فہمائش کرنا یا تحریری جواب لینا، تین مرتبہ کی تفہیم سے اصلاح نہ ہو ان کے متعلق پوری کیفیت مع رائے کے مجلس انتظامی میں پیش کریں گے، مدرسین کی معطلی یا برطرفی یا بحالی کی تجویز مجلس انتظامیہ میں پیش کرنا بھی بہ اختیار ناظم ہے۔

ک: طلبہ کی غیر حاضری خلاف ورزی دستور العمل یا ان کی اخلاقی وشرعی و معاشرتی معاملہ کے متعلق طلبہ کو تنبیہ کرنا یا ایک ہفتہ تک کھانا بند کر دینا ناظم کے اختیارات میں ہے اگر طالب علم قابل اخراج ہے تو اس کو خارج کر کے میر مجلس کو اطلاع دینا لازمی ہوگا۔

ل: حسب قواعد رخصت مدرسین کو تین روز تک رخصت دینا یا طلبہ کی ایک ماہ تک رخصت دینا بہ اختیار ناظم ہوگا؛ لیکن اس کی اطلاع میر مجلس کو دینا لازمی ہوگا۔

م: ملازمان شعبۂ تعلیمی کی حاضری وغیر حاضری ورخصت کا نقشہ ہر ماہ پر بنا کر مہتمم کے پاس بھیجنا جس سے برآورد بنائے جائے گی۔

مہتمم جامعہ کے فرائض

دفعہ-۱۸: مہتمم مدرسہ کے فرائض واختیارات حسب ذیل ہوں گے۔

الف: مدرسہ کی مالی وحسابی شعبہ کا انتظام حسب تصریح دفعہ (۱٦) مہتمم مدرسہ کے متعلق ہوگا، اور ان کی درستی ترتیب نظام اور نگرانی مہتمم مدرسہ کے ذمہ رہے گی۔

دفتر مدرسہ کا مرتب کرنا، حسابات ہر شعبہ کو مکمل ومرتب رکھنا مہتمم مدرسہ کے فرائض میں ہوگا۔

ب: دفتر، کتب خانہ، مطبخ، صفائی کے ملازم زیر اقتدار مہتمم مدرسہ ہوں گے، عملۂ ماتحت مہتمم کی حاضری کا رجسٹر مہتمم کے پاس رہے گا۔

ج: ہر شعبہ کے تمام ملازمین مدرسہ کی برآورد تنخواہ کا تیار کرنا اور معتمد مجلس سے منظوری حاصل کرنا مہتمم مدرسہ کے ذمہ ہوگی، اور ماہوار کی تقسیم سب مہتمم کے اختیار اور ان کے ذریعہ سے ہوگی۔

د: ملازمان زیر اقتدار مہتمم سے تحریری جواب لینا ان کو تنبیہ وفہمائش کرنا، ان کی معطّلی، موقوفی، بحالی کی تجویز پیش کرنا یا ان کو بہ پابندی قواعد رخصت تین روز کی رخصت دے کر معتمد مجلس کو اطلاع دینا۔

ہ: چندہ مدرسہ کی رسید اپنی دستخط سے معطی کو دینا۔

و: کسی واقعہ یا حادثہ اتفاقی کی فی الفور میر مجلس یا معتمد مجلس کو اطلاع دینا، یا طلبہ کی بے عنوانیوں کی اطلاع دینا مہتمم مدرسہ کے اختیار میں ہوگا، اور جب اس قسم کی کوئی اطلاع پہونچے گی تو مجلس اس کی کارروائی بہ توسط ناظم کرے گی۔

ز: مدرسہ کے مکانات اور ان کی صفائی مرمت یا کوئی جدید تعمیر سب اقتدار مہتمم ہوگی، مہتمم مدرسہ مکانات مدرسہ کی صفائی اور درستی کا ذمہ دار ہوگا۔

ح: روائداد سالانہ مرتب کرنا بھی مہتمم مدرسہ کے متعلق ہوگا۔

ط: سالانہ امتحانات اور نقشہ جات تعلیم کی ترتیب میں مہتمم صاحب معہ اپنے عملہ کے ناظم صاحب کے کام میں مدد دیں گے اور کام کرسکیں گے۔

دارالافتاء جامعہ نظامیہ

مدرسہ میں ایک دارالافتاء رہے گا، اسکی نگرانی بھی ناظم سے متعلق ہوگی، دارالافتاء کا دستور العمل علیحدہ مرتب کیا جائے گا، جس کی پابندی سے فتاوی لکھے جائیں گے۔

اہلِ خدمات شرعیہ

مدرسہ کے شعبہ ہائے تعلیم میں فرزندان اہل خدمات شرعیہ کی تعلیم بھی بہت زیادہ مہتمم بالشان ہے اور ایک اعتبار سے مقصد (الف) سے بھی زیادہ قابل اہتمام ہے کیوں کہ ان کی تعلیم پانے اور اصلاح کا اثر ملک کی تعلیمی و دینی حالت پر زیادہ ہوگا، فرزندان اہل خدمات شرعیہ کو مکمل نظام کے ساتھ تعلیم دی جائے گی، ان کی تعلیم کا انتظام مستقل ہوگا، نصاب جداگانہ ہوگا، مدرس جدا ہوں گے، مکان بھی علیٰحدہ ہوگا، ان کے مصارف صدارت عالیہ کے واسطے سے لیے جائیں گے اور حسب دستور العمل ان کے داخلہ و عطائے سند اور عطائے وظائف کے معاملہ میں عمل کیا جائے گا۔

داخلۂ طلباء

طلباء کا داخلہ ان کا اخراج ان قواعد کے رو سے ہوگا جو علیٰحدہ دستور العمل میں لکھے جائیں گے۔

وظائف تعلیمی

طلبہ کو ترغیبی وظائف بھی دیئے جائیں گے ان کی تعداد اور مقدار و ظائف کا تقرر و تعلق مجلس انتظامی کے اختیار میں ہوگا اور ان قواعد کی رو سے دیئے جائیں گے جو دستور العمل میں لکھے جائیں گے، غیر ملکی طلباء کو ایک ثلث اور ملکی طلباء کو دو ثلث و ظائف دیئے جائیں گے۔

علماء اسناد و دستار بندی

حسب قواعد و دستور العمل طلبہ مستحقین اسناد یا صداقت نام جات کو اسناد یا صداقت نام جات بھی بعد منظوری مجلس منتظمہ و دستخط میر مجلس دیئے جائیں گے،

عطائے اسناد کے لیے ہر سال ایک جلسہ منعقد کیا جائے گا، اور صدر جلسہ کے ہاتھ سے تقسیم کئے جائیں گے جو طلبہ بلا عذر معقول جلسہ عطائے اسناد میں حاضر نہ ہوں گے ان کو ان کی درخواست پر بعد مکرر منظوری میر مجلس اسناد و صداقت نام جات دیئے جاسکیں گے اور مستحقین دستار فضیلت کو دستار عطا کی جائے گی۔

انعامات طلبہ

امتحان سالانہ میں کامیاب طلبہ کو انعام دیا جائے گا، فہرست کامیاب طلبہ مع مقدار انعام ناظم تعلیم مرتب کریں گے اور بعد منظوری مجلس انعام دیا جائے گا، تقسیم انعام کے لیے جداگانہ جلسہ کی ضرورت نہ ہوگی وہی جلسہ تقسیم اسناد کافی ہوگا الا یہ کہ اگر جلسہ تقسیم اسناد کسی وجہ سے نہ ہو تو انعام کے لیے جلسہ منعقد کیا جائے گا۔

وظیفہ ملازمین جامعہ

اعلیٰ حضرت مدظلہم العالی نے ازراہ الطاف خسروانہ مدرسۂ نظامیہ کے مدرسوں اور ملازموں کے لیے وظیفہ ملازمت یعنی پنشن کا حق بھی منظور فرمایا ہے جو ان قواعد کے موافق دیئے جائیں گے جو اس کے لیے دستور العمل میں لکھے جائیں گے۔

خدمات و عہدہ ہائے ممالک محروسۂ سرکار عالی

سند یافتہ مدرسۂ نظامیہ کے لیے فرا خور لیاقت سرکاری خدمات دیئے جانے کا فرمان مبارک اس سے قلیل صادر ہو چکا تھا لیکن اب فرمان مبارک مزینہ ان طلبہ کو نظام کالج، جامعۂ عثمانیہ، دار العلوم کے برابر استحقاق عطا فرمایا گیا ہے اس حکم کی تشریح و تفصیل کے متعلق علیحدہ منظوری حاصل کی جائے گی۔ فقط

شرح دستخط

مولوی محمد احمد صاحب میر مجلس مدرسۂ نظامیہ عثمانیہ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضداشت

ازخادم المسلمین فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند بخدمت کافۂ اہل اسلام

پاک، مقدس، عدیم المثال عمارت (**دارالحدیث دیوبند**) جس کی تکمیل کے لیے ہندوستان کا مذہبی طبقہ بے چینی سے منتظر تھا، جس کی تحریک آج سے چھ سال قبل ہند کے اسلامی و مذہبی مرکز (**دارالعلوم دیوبند**) میں شروع ہوئی تھی، اور جس کی مقبولیت عامہ مسلمانوں کی فوق العادت رغبت توقع دلاتی تھی کہ خیال سے زیادہ جلد تیار ہو جائے گی مگر ایک گندہ نالہ سرکاری کے وسط عمارت میں واقع ہو جانے سے اس میں رکاوٹ پیدا ہوگئی تھی، اور مسلمانوں کے عام ہیجان اشتیاق میں حسرت و یاس کے ساتھ سکون پیدا ہو گیا تھا۔

خدا کا شکر ہے کہ مانع مذکور کے مرتفع ہو جانے سے اس کی تعمیر جاری ہوگئی، بنیادیں تیار ہوگئیں، نقشہ عمارت کاغذ سے منتقل ہو کر سطح زمین پر نمودار ہو گیا اور وہ وقت آ گیا کہ اقوال واحوال سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے والہ و شیدا اس تعویق کا تدارک فرما کر دکھلا دیں کہ ابھی ان میں جذبۂ محبت و عشق کی وہ حیرت انگیز طاقت موجود ہے جو مشکل سے مشکل کام کو آسان کر دکھاتی ہے اور ابھی ان میں ایسے افراد کا قحط نہیں ہے جو آثار و روایات مذہب کو جان و مال سے زیادہ عزیز اور واجب الحفظ

سمجھتے ہیں مضمون حدیث ''لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من ولدہ و والدہ و الناس اجمعین''

تم مومن نہیں ہوسکتے جب تک کہ میں تمہارے نزدیک بیٹے باپ اور تمام دنیا سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں، پر ان کا ایمان ہے ''بلغوا عنی و لو آیۃ'' کو دین کا راس المال جانتے ہیں۔

علم حدیث کی پر از عظمت وشان داستان لکھنے کی حاجت نہیں، ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ حدیث پر مذہب کا مدار ہے، بالاجمال اس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ کلام الٰہی جس کی شان ''تبیان لکل شیٔ'' ہے حدیث اس کی تفسیر ہے، ارشادات خداوندی کا صحیح مفہوم حدیث سے معلوم ہوتا ہے، جزئیات احکام، کلیات اصول و فروع اس سے ثابت ہوتے ہیں، اقوال وافعال، حالات ومعاملات اخلاق وعادات رسول کریم علیہ افضل الصلوات والتسلیم کے علم کا ذریعہ صرف علم حدیث ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین سے ہر مابعد طبقہ میں محدثینؒ کے ایک ایک لفظ کو اس طرح محفوظ رکھا اور ہم تک پہونچایا کہ حرکت واعراب یا الفاظ کے ردوبدل کو گوارا نہ کیا، اور اس طرح چھان بین کی کہ کسی محرف ووضاع کے لیے گنجائش نہ چھوڑی، ان کے ضعف کا حال یہ تھا کہ عزیز واقارب، ملک ووطن، اہل وعیال، دولت ومال سب پر لات مار کر ایک ایک حرف کو جہاں سے ملا چن کر لائے ایک ایک لفظ کی تصحیح، یا کسی عالی الاسناد شیخ سے بلا واسطہ تلمذ کے لیے سینکڑوں میل راستہ طے کر کے جاتے تھے، ان کی فریفتگی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ فتنہ خلق قرآن کے مرتفع ہو جانے پر خلیفہ متوکل سے علماء اہل سنت کو (جو معتزلہ کے جابرانہ تشدد سے ممنوع التحدیث کر دے گئے تھے) روایت حدیث کی عام پروانگی ملی تو ایک محدث ابن ابی شیبۃ کے گرد اول ہی مجلس میں تیس ہزار طالبان حدیث پروانہ وار جمع ہو گئے، زمانہ وہ تھا کہ ان کے اقران اوران سے فائق ائمہ محدثین سے ملک معمور تھا، پھر جب ایک محدث کی پہلی مجلس میں اتنے

طلبہ تھے تو دوسروں کے یہاں کس قدر ہوں گے۔

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

وسعت علوم حدیث کو معلوم کرنا ہے تو ان علوم کی فہرست کو اٹھا کر دیکھ لیجئے جو روایت و درایت حدیث سے تعلق رکھتے ہیں، گنجائش ہوتی تو ہم آپ کو دکھلاتے کہ کتنے علوم ہیں اور کس طرح کی عرقریزی سے ہر ایک شعبہ کو مستقل اور جداگانہ علم بنادیا گیا ہے۔

ہر ایک مذہبی درسگاہ دارالحدیث اور دارالتفسیر کہلائے جانے کے مستحق ہے، بغداد میں مدرسہ نظامیہ اس شان و شوکت سے قائم ہوا تو منتخب ائمہ حدیث اس کی درسگاہ حدیث میں جلوہ افروز نظر آتے تھے، مگر کوئی تو خصوصیت وفضیلت تھی کہ ملک عادل سلطان نورالدین مرحوم نے دمشق میں دارالحدیث قائم کیا جس پر آج ایک طرف مسلمانوں کا فخر ہے تو دوسری جانب ملک عادل کا نام دفتر ابرار اور تاریخ زمانہ میں روشن ہورہا ہے۔ اور پھر کوئی امتیاز تو تھا کہ اس کے اقتداء میں مملوکہ ہابعد نے مصر وقاہرہ میں دارالحدیث الاشرفیہ والکامل قائم کئے بے شک علم حدیث کی وسعت اس کا علوشان اسی اہتمام کا مستحق تھا اور ہے۔

ہندوستان جیسا وسیع ملک مسلمانوں کی باسطوت و جبروت اور علوم وفنون کی اس عام قدر و منزلت کے باوصف جس پر اس کے آثار شاہد ہیں، باقاعدہ ترویج و اشاعت علم حدیث میں سب ممالک سے پیچھے تھا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ سرچشمہ علم حدیث، ملک حجاز سے ایک نہر کاٹ کر لائے اور اس تشنہ ملک کو سیراب کیا، اب جس قدر بھی چرچہ علم حدیث کا ہے، اسی طوبیٰ مثال خاندان کا طفیل ہے۔

اس مبارک ومقدس خاندان کے اخلاف صدق علماء دیوبند نے حق خلافت کو اس حد تک ادا کیا جس سے زیادہ ناممکن تھا، انہوں نے روایت کے ساتھ درایت کو جمع کر کے دکھلا دیا کہ یہ دونوں علم کیوں کر متعانق ہیں اور یہ کہ ائمہ مجتہدین کا پایہ کتنا بلند

ہے، انہوں نے ایک جانب روایات احادیث سے ملحدین زمانہ کے بے جا اعتراضات کا قلع قمع کر دیا تو دوسری جانب ظاہر پرستوں اور الفاظ حدیث سے ناجائز استدلالوں کی ناکہ بندی فرمائی اور دکھلا دیا کہ حدیث و فقہ کو یوں جمع کرتے ہیں، اور یہ فریضہ مجتہدین امت کا ہے، شکر اللہ سعیھم۔

ہندوستان کا اسلامی مرکز فیوض قاسمی و رشیدی کا مستقر و منبع دارالعلوم دیوبند ابتداہی سے تعلیم علوم حدیث و جمع بین الفقہ والحدیث میں ممتاز رہا ہے، مگر اس کی روز افزائی مقبولیت طلبہ علم حدیث کا ہجوم مکانات درس کی قلت و تنگی، دارالعلوم کی عظمت و شان بناء دارالحدیث کے محرک ہوئے، ہندوستان اس وسعت پر دارالحدیث سے خالی تھا، شام کے بعد ہندوستان میں اس نام کی یہ پہلی عمارت ہے جس کی طرف آپ کو توجہ دلائی جا رہی ہے عمارت مذکور کا تخمینہ تقریباً سوا لاکھ روپیہ ہوا ہے جس میں سے قریب ایک ربع اس جوش خروش اور عام رغبت و ہیجان میں وصول ہو گیا تھا، ایسی مقبول عمارت جس کے لیے بلا کسی زبردستی تحریک کے اس طرح چندہ آیا ہو، اور اس طرح ہزاروں چندے حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم خلفاء راشدین صحابہ کرام، ائمہ اہل بیت، ائمہ مجتہدین، مشائخ طریقت و اکابر امت کے نام سے آئے ہوں۔ اور جس کے لیے ایسی مبشرات (مبارک خوابیں) دیکھی گئی ہوں (القاسم کی گذشتہ جلدیں دیکھنے سے یہ سب حالات منکشف ہو سکتے ہیں) آج تک دیکھی اور سنی نہیں گئی۔

ہمیں امید ہے کہ اب بھی اسی جوش و رغبت سے مسلمان متوجہ ہوں گے، بار بار عرضداشتیں پیش کرنے اور توجہ دلانے کی ضرورت نہ پڑے گی، جس قدر تعویق اس میں ہو چکی ہے، اس کی تلافی اس طرح کر دی جائے گی کہ مسلمانوں کا ہر ایک طبقہ یک لخت اس کی طرف متوجہ ہو جائے اور دکھلا دے کہ ابھی ان میں اسلامی روح

موجود ہے، وہ علم حدیث کی قدر دانی اور اُس المال ایمانی کی حفاظت میں اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کو ذریعہ فوز وفلاح سمجھتے ہیں۔

دارالحدیث کے ۱۳ رکمرے چھوٹے بڑے ہیں سب سے بڑا کمرہ ۶۸ رفٹ طول ۳۵ رفٹ عرض کا ہے، ہر ایک کمرہ کا تخمینہ جدا کر دیا گیا ہے، مسلمانوں میں والیان ملک سے عام درجہ تک مختلف طبقات ہیں، امداد کی صورتیں بھی مختلف ہیں کوئی صاحب ایک دو کمرہ کے مستقل متکفل ہو جائیں کسی ضلع، شہر، قصبہ کے باشندے مل کر کوئی کمرہ بنائیں، عام مسلمان قلیل وکثیر رقم سے امداد فرمائیں، خدام دارالعلوم منشا اہل خیر کا اتباع کریں گے۔

یہ مقبول وبرگزیدہ عدیم المثال باوقعت وشان عمارت انشاء اللہ تعالیٰ جلد تیار ہوکر رہے گی ہمارا فریضہ ہے کہ اس ثواب دائمی میں آپ کو حصہ دار بنانے کی سعی لوجہ اللہ کریں۔ والتوفیق بید اللہ الکریم

دارالعلوم کا ان مشکلات حائلہ پر غالب آنا، گورنمنٹ عالیہ کی خاص عنایات، ہزآنر نواب لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ سر جیمس میسٹن بہادر کی فوق الفوق توجہات حکام ضلع کی بیش بہا امداد کا نتیجہ ہے جس کا ادنی کرشمہ گندہ نالہ کا سرزمین دارالعلوم سے بالکل جدا کر دیتا ہے، ناسپاسی ہوگی اگر ہم دل وجان سے منت پذیری اور شکر گذاری نہ کریں۔ و اخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

آخر میں یہ بھی عرض ہے، کہ طلبہ کے ہجوم وکثرت سے جس قدر مکانات رہائش وقیام کے لیے موجود تھے وہ سب ناکافی وتنگ ہو گئے ہیں، عمارت دارالحدیث کے گرد وسیع احاطہ میں دوسری ضروری عمارات بھی اس کے ساتھ ہی تیار ہوں گی جن کے نقشے جلد شائع کیے جائیں گے کیا اچھا ہو کہ جب اہل خیر دارالحدیث میں امداد فرمائیں تو ان ضروری عمارات کو بھی یاد رکھیں۔ واللہ الموفق

تخمینہ تعمیر دار الحدیث متعلقہ دار العلوم دیو بند ضلع سہارن پور

نمبر شمار	نام کمرہ پتہ	طول و عرض	صرفہ	کیفیت
۱	کمرہ صدر دار الحدیث معہ برآمدہ جات گلری وغیرہ	۳۵/۶۸		
۲	کمرہ برج والہ منزل اول معہ برآمدہ جات وغیرہ	۳۰/۳۰		
۳	کمرہ صدر دوم برنودرہ	۳۵/۶۸		
۴	کمرہ جنوبی متصل کمرہ صدر دار الحدیث معہ ہر سہ برآمدہ جات	۲۳/۳۳		
۵	کمرہ شمالی متصل کمرہ صدر دار الحدیث معہ سہ برآمدہ جات	۲۳/۳۳		
۶	کمرہ برج والہ منزل دوئیم معہ برآمدہ	۳۰/۳۰		
۷	کمرہ برج والہ منزل سوئیم معہ برج ومعہ برآمدہ جات	۳۰/۳۰		
۸	کمرہ شمالی متصل کمرہ برج والہ معہ کمانچہ	۱۵/۱۸		
۹	کمرہ جنوبی متصل کمرہ برج والہ معہ کمانچہ	۱۵/۱۸		
۱۰	بالائی حصہ کمرہ شمالی متصل برج والہ	۱۵/۱۸		
۱۱	بالائی حصہ کمرہ جنوبی	۱۵/۱۸		
۱۲	کمرہ برجی والہ برآمدہ کمرہ جنوبی بالائی حصہ معہ برجی	۱۰/۱۰		
۱۳	کمرہ شمالی برجی والہ برآمدہ کمرہ شمالی معہ برجی	۱۰/۱۰		

کمرہ (۱ و ۳) کا طول و عرض مساوی ہونے کی وجہ سے اس کے مصارف میں بھی مساوات کا خیال ہوتا ہے حالاں کہ کمرہ (۱) کا صرف بہت زیادہ دکھلایا گیا ہے، وجہ یہ ہے کہ کمرہ (۱) نیچے کا کمرہ ہے اور (۳) اوپر کا، کمرہ (۱) میں اخراجات بنیاد، بھرائی، کرسی وغیرہ کے زائد ہیں، نیز کمرہ (۳) سے (۱) کی بلندی بھی دو چند ہے اور (۱) کے آثار (۳) سے خصوصاً بنیادوں میں بہت زائد ہیں، اور (۱) میں گلری بھی ہے جس کا معتد بہ صرف ہے[۱]۔

---

[۱] بحوالہ ماہنامہ القاسم ماہ شعبان المعظم ۱۳۳۴ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۱۶ء۔

تیرہواں باب

دکن کی صدارت عالیہ میں آپ کے فتاویٰ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ الذی تتم بنعمتہ الصالحات، و الصلاۃ و السلام علی رسولہ سیدنا محمد سید الکائنات و علی آلہ و اصحابہ اولی الفضل و الکرامات وعلیٰ تابعیھم باحسان من جمیع الجھات، الیٰ اقصی الغایات، حمدا یقربنا الی مرضاۃ اللہ تعالیٰ و کرامتہ و صلاۃ تبلغنا الی محجۃ الرسول و شفاعتہ و سلاما یرشدنا الی القیام بأد بہ و ھدایتہ و الفوز بنعمہ و جناتہ.

کتاب الصلاۃ

بے وضو اذان دینے کا مسئلہ

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ "بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ اذان بے وضو جائز ہے اور اقامت جائز نہیں" اس بناء پر اگر کوئی مؤذن ہمیشہ بلا وضو اذان کہنے کی عادت بنالے، خصوصاً صبح کی اذان، سوتے سوتے بچھونے سے اٹھ کے سیدھا اذان کے منبر پر چلا جائے اور آنکھیں مل کر اذان دے دیا کرے

اور یہ کہہ دے کہ اذان بے وضو بھی جائز ہے، اگر وضو کی تکلیف گوارا نہ کریں تو کیا مضائقہ؟ آیا اس فعل پر مداومت کرنا مؤذن کو بلا کسی عذر کے صحیح ہے، یا یہ فعل قابل اصلاح ہے؟ مفصل جواب بحوالہ کتب مطلوب ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً: اذان کی دو حیثیتیں ہیں، ایک یہ کہ اذان ذکر ہے، دوسری یہ کہ اذان دعوت نماز ہے، لہٰذا مؤذن کی بھی دو حیثیتیں ہوں گی، ایک یہ کہ وہ ذکر کررہا ہے دوسری یہ کہ وہ نماز کی دعوت دیتا اور لوگوں کو نماز کے لیے بلاتا ہے۔

اس اعتبار سے کہ مؤذن ذکر کررہا ہے کلمات اذان بے وضو بھی اپنی زبان سے ادا کرسکتا ہے؛ کیوں کہ ذکر، تسبیح، تہلیل اور تلاوت شرعاً بے وضو جائز ہے؛ لیکن اس اعتبار سے کہ وہ لوگوں کو نماز کی دعوت دے رہا ہے اس کا بے وضو ہونا مکروہ ہوگا؛ کیوں کہ وہ اب تک شرکت (ادائے نماز) کے قابل نہیں ہے۔

کتب فقہ میں جہاں یہ لکھا ہے کہ ''اذان بے وضو جائز ہے'' اذان کے صرف ذکر ہونے کا لحاظ فرمایا گیا ہے، لیکن ساتھ ہی اس کے دعوت نماز ہونے کے اعتبار سے یہ صراحت بھی فرمائی گئی ہے کہ مؤذن کو باوضو ہوکر ہی اذان کہنی چاہیے، اس لیے کہ مؤذن کا باوضو رہنا مستحب ہے۔

بنا براں اگر کسی مؤذن نے بے وضو اذان کہنے کی عادت بنالی ہے تو اس کی عادت قابل اصلاح ہے، اگرچہ اس کی اذان کا شرعاً اعادہ واجب نہیں، مراقی الفلاح میں ہے:

> ویستحب ان یکون علی وضوء لقوله صلی الله علیه وسلم: لایؤذن الا متوضئ. اور ہدایہ میں ہے: و ینبغی ان یؤذن و یقیم علی طهر، فان اذن علی غیر وضوء جاز لانه ذکر و لیس بصلاة، فکان الوضوء فیه استحبابا کما فی القراء ة، و یکره ان یقیم علی غیر وضوء. نیز

ہدایہ میں ہے: ویردی أن یکرہ الأذان أیضاً، لأنه یصیر داعیاً الی ما لا یجیب بنفسه. اورعنایہ میں ہے: لانه یدعو الناس الی التأهب للصلاة فاذا لم یتأهب لها یکون داعیا الی ما لا یجیب بنفسه. واللہ اعلم بالصواب.

مسجد میں قرآن خوانی کا مسئلہ

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسجد میں ختم قرآن شریف بزرگان دین، رحمۃ اللہ علیہم اجمعین، اور قصائد نعتیہ وغیرہ پڑھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً ومصلیاً: قرآن مجید کی تلاوت، یا ختم خوانی، یا قصائد نعتیہ پڑھنے کی وجہ سے مسجد میں نماز پڑھنے والوں کے لیے اگر کافی جگہ باقی رہے اور ان کی نماز میں خلل واقع نہ ہو تو یہ امور مسجد میں جائز ہیں:

و الا فلا. ردالمحتار کی جلد اول میں مطلب فی انشاد الشعر کے تحت لکھا ہے: اخرج الامام الطحاوی فی شرح مجمع الآثار انه صلی الله علیه وسلم نهی ان تنشد الاشعار فی المسجد و ان تباع فیه السلع و ان یتحلق فیه قبل الصلاة، ثم وفق بینه و بین ما ورد انه صلی الله علیه وسلم وضع لحسانؓ منبراً ینشد علیه الشعر بحمل الاول علی ما کانت قریش تهجوه به و نحوه مما فیه ضرر او علی ما یغلب علی المسجد حتی یکون اکثر من فیه متشاغلا به قال و کذلک النهی عن البیع فیه هو الذی یغلب علیه حتی یکون کالسوق؛ لانه صلی الله علیه وسلم لم ینه علیاؓ عن

خصف النعل فیه مع انه لو اجتمع الناس لخصف النعال فیه کره فکذلک البیع و انشاد الشعر و التحلق قبل الصلاۃ فما غلب علیه کره و ما لا فلا اھ۔ اور فتاوی خیریہ میں ہے: فاما حلق الذکر و الجهر به فقد جاء فی الحدیث ما اقتضی طلب الجهر نحو و ان ذکر فی ملأ ذکرته فی ملأ خیر منه رواه البخاری و مسلم و الترمذی و النسائی و ابن ماجة و رواه احمد نحوه باسناد صحیح و زاد فی آخره قال قتادة والله اسرع. والذکر فی الملأ لا یکون الا عن جهر و کذا حلق الذکر و طواف الملائکة بها و ما ورد فیها من الاحادیث فان ذلک انما یکون فی الجهر بالذکر و هناک احادیث اقتضت طلب الاسرار، و الجمع بینهما بان ذلک یختلف باختلاف الاشخاص و الاحوال کما بین الاحادیث الطالبة للجهر بالقراء ة و الطالبة للاسرار بها، و لا یعارض ذلک "خیر الذکر الخفی" لانه حیث خیف الریاء او تأذی المصلین او النیام و الجهر ذکر بعض اهل العلم انه افضل حیث خلا مما ذکر لانه اکثر عملا و لتعدی فائدته للسامعین و یوقظ قلب الذاکر فیجمع همه الی الفکر ویصرف سمعه الیه و یطرد النوم ویزید النشاط۔ اور علامہ حموی الاشباہ والنظائر کے حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں: عن الامام الشعرانیؒ اجمع العلماء سلفا و خلفا علی استحباب ذکر الجماعة فی المساجد و غیرها الا ان یشوش الجهر علی نائم أو مصل أو قارئ۔ اور بزازیہ

میں ہے: ان الذکر بالجھر فی المسجد لا یمنع احترازاً عن الدخول تحت قوله تعالیٰ و من اظلم ممن منع مساجد الله ان یذکر فیها اسمه. والله اعلم باالصواب.

نماز کے لئے کوڑھ کے مریض کا مسجد آنا

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص جذامی ہے جس کے ہاتھ پاؤں کی انگلیوں سے ریزش جاری ہے یہ شخص نماز ادا کرنے کے لیے مسجد میں آتا ہے تو مصلیان مسجد اس سے کراہت کرتے ہیں، کیا اس کو مسجد میں آنے سے روکا جاسکتا ہے؟

نیز یہ شخص مسجد میں جو گھڑے پانی کے رکھے جاتے ہیں ان سے پانی پیتا ہے اس سے بھی عام مصلیوں کو کراہت ہوتی ہے، کیا اس کو اس طرح پانی پینے سے روکا جا سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب: حامداً و مصلیاً: نمازیوں کو مسجد میں آنے سے روکنا جائز نہیں ہے، باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

و من اظلم ممن منع مساجدا لله ان یذکر فیها اسمه. البتہ ایسے شخص کو تلویث مسجد کے اندیشہ سے خود ہی مسجد میں نہ آنا چاہیے۔ عالمگیریہ کی کتاب الطہارۃ باب سابع فصل ثانی صفحہ (۴۷) میں ہے: کل ما یخرج من بدن الانسان مما یوجب خروجه الوضوء و الغسل فهو مغلظ کالغائط و البول و المنی و المذی و الودی و القیح و الصدید والقیٔ اذا ملأ الفم کذا فی البحر الرائق. اور رد المحتار میں ہے: لا یدخل المسجد من علی بدنه نجاسة. نیز ایسے شخص کے جسم یا کپڑوں

سے بدبو ظاہر ہونا بھی مستبعد نہیں، اس وجہ سے بھی اس کو چاہیے کہ وہ مسجد میں نہ آئے تاکہ مسلمانوں اور ملائکۃ الرحمٰن کو اس کی وجہ سے اذیت نہ ہو، درمختار میں ہے: ویکرہ اکل نحو ثوم و یمنع منہ. اور رد المحتار کے جلد اول صفحہ (۴۴۴) مطلب احکام المسجد میں ھے: (قوله و اکل نحو ثوم) ای کبصل و نحوه مما له رائحة کریهة للحدیث الصحیح فی النهی عن قربان آکل الثوم و البصل المسجد، قال الامام العینی فی شرحه علی صحیح البخاری! قلت علة النهی اذی الملائکة و اذی المسلمین، ولا یختص بمسجده علیه الصلاة و السلام؛ بل الکل سواء لروایة مساجدنا بالجمع خلافا لمن شذ ویلحق بما نص علیه فی الحدیث ما له رائحة کریهة مأکولا او غیره، و انما خص الثوم هنا بالذکر و فی غیره ایضاً بالبصل و الکراث لکثرة اکلهم لها و کذلک الحق بعضهم من بفیه یخراو به جرح له رائحة و کذلک القصاب السما و المجذوم و الابرص اولی بالالحاق. اگر وہ اس پر بھی مسجد کو آئے تو اس کو مسئلہ سمجھا دینا چاہیے کہ عذر کی وجہ سے حضورئ مسجد (مسجد میں آنا) وشرکت جماعت شرعاً ساقط ہو جاتی ہے، اگر معذور کی نیت حضورئ مسجد اور جماعت کی ہو اور وہ عذر کی وجہ سے نہ آئے تو اس کو اس حسن نیت کی بدولت اس کا اجر مل جائے گا، مراقی الفلاح کے صفحہ (۱۷۴) میں ہے: و اذا انقطع عن الجماعة لعذر من اعذارها المبیحة للتخلف و کانت نیته، حضورها لو لا العذر الحاصل حصل له ثوابها لقوله

صلی اللہ علیہ وسلم انما الاعمال بالنیات و انما لکل امرئ ما نوی. واللہ اعلم بالصواب.

مقطوع الید کی امامت کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید مسائل دینیہ اور احکام نماز سے بقدر ضرورت واقف ہے، وہ ایک ایسے مقام میں رہتا ہے جہاں کے باشندے ضروریات دین سے واقف نہیں ہیں، مگر زید کا ایک ہاتھ کسی صدمہ کے باعث کلائی کے پاس سے ضائع ہوگیا ہے، ایسی حالت میں زید کو اس مقام پر نماز پڑھانے کے لیے امام مقرر کرنا شرعاً بہتر ہے یا اس قوم میں سے کسی کو؟ بینو توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: مقطوع الید کی امامت مکروہ تنزیہی ہے جس کی علت مقتدیوں کا تنفر اور عدم تکمیل طہارت کا اشتباہ ہے، لیکن صورت مسئولہ عنہا میں جب زید مسائل دینیہ اور احکام نماز سے بقدر ضرورت واقف ہے، اور دوسرے نماز پڑھنے والے ناواقف ہیں، تو ناواقف لوگوں سے ایسے امور کا ترک بہت ممکن ہے جو نماز کے لیے ضروری ہیں لہٰذا ان لوگوں کے مقابلہ میں امامت نماز کے لیے شرعاً زید ہی کو اولویت حاصل ہے، درمختار میں ہے:

(ویکرہ) تنزیہا (امامة عبد و اعرابی و فاسق و اعمی الا ان یکون) غیر الفاسق (اعلم القوم) فھو اولی. و کذا تکرہ خلف امرد و سفیہ و مفلوج و ابرص شاع برصہ.

اور ردالمحتار میں ہے: (قولہ: و مفلوج و ابرص شاع برصہ) و کذا من لہ ید واحدة فتاوی الصوفیة عن التحفة و الظاہر ان العلة النفرة ولذا قید الابرص بالشیوع لیکون

ظاهراً و لعدم امکان کمال الطهارة ایضاً فی المفلوج و الا قطع و المجبوب اھـ. واللہ اعلم بالصواب.

اعلانیہ فاسق کی اطاعت کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جو شخص تمامی اہلیان بستی بلکہ قرب وجوار میں اعمال حرام بازی، نشہ بازی، بددیانتی، سودخواری، اور بدزبانی وغیرہ میں مشہور ومعروف اور عدالتی سزایاب ہوکیا ایسا شخص ادائی خدمات شرعیہ کے لائق ہے اور جو لوگ جان بوجھ کر اس کی اقتداء کرتے ہیں کیا ان کے فرائض ادا ہوئے؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: افعال مذکورہ موجب فسق ہیں، جو شخص افعال مذکورہ کا مرتکب ہو وہ شرعاً فاسق ہے اور فاسق کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے، اگر ایسا شخص امامت نماز پر مسلط ہو جائے تو بہتر یہ ہے کہ کسی دوسری مسجد میں جہاں کا امام پرہیزگار شخص ہو نماز پڑھ لیا کریں، اگر دوسری مسجد نہ ہو یا پرہیزگار امام نہ ملے تو اسی کی اقتداء کرلیں فریضہ ادا ہو جائے گا، جماعت اور مسجد کو ترک نہ کریں۔ کیوں کہ اس کی اقتداء سے بھی مسجد اور نماز یا جماعت کا ثواب مل جائے گا؛ لیکن اتنا ثواب نہیں جو کسی متقی پرہیزگار کی اقتداء میں مل سکتا ہے درمختار میں ہے:

(ویکرہ) تنزیها (امامة عبد و اعرابی و فاسق و اعمی الا ان یکون) ای غیر الفاسق (اعلم القوم) فهو اولیٰ. اور ردالمحتار میں ہے: (قوله فاسق) من الفسق و هو الخروج عن الاستقامة و لعل المراد به من یرتکب الکبائر کشارب الخمر و الزانی و آکل الربا و نحو ذلک کذا فی البرجندی اسماعیل و فی المعراج قال اصحابنا: لا ینبغی ان یقتدی الفاسق الا فی

الجمعة لانه فی غیرها یجد اماماً غیره اھ قال فی الفتح و علیه فیکره فی الجمعة اذا تعددت اقامتها فی المصر علی قول محمدؒ المفتی به لانه بسبیل الی التحول. اور ردالمحتار میں: (قوله غیر الفاسق) کے تحت لکھا ہے: و اما الفاسق فقد عللوا کراهة تقدیمه بانه لا یهتم بامر دینه و بان فی تقدیمه للامامة تعظیمه و قد وجب علیهم اهانته شرعاً و لا یخفی انه اذا کان اعلم من غیره لا تزول العلة فانه لا یؤمن ان یصلی بهم بغیر طهارة فهو کالمبتدع تکره امامته بکل حال بل مشی فی شرح المنیة علی ان کراهة تقدیمه کراهة تحریم لما ذکرنا قال: و لذا لم تجز الصلاة خلفه اصلا عند مالکؒ و روایة من احمدؒ فلذا حاول الشارح فی عبارة المصنف حمل الاستثناء علی غیر الفاسق. والله اعلم. نیز درمختار میں ہے: و فی النهر عن المحیط صلی خلف فاسق او مبتدع نال فضل الجماعة. اور ردالمحتار میں ہے: (قوله نال فضل الجماعة) افاد ان الصلاة خلفهما اولی من الانفراد لکن لا ینال کما ینال خلف تقی ورع لحدیث "من صلی خلف ما لم تقی فکانما صلی خلف نبی" قال فی الحلیة و لم یجده المخرجون. نعم اخرج الحاکم فی مستدرکه مرفوعا ان سرکم ان یقبل الله صلاتکم فلیؤمکم خیارکم فانهم وفد فیما بینکم و بین ربکم اھ۔

لیکن محض شہرت کی بناء پر کسی شخص کو ایسے افعال کا مرتکب اور اس کو فاسق نہیں ٹھہرانا چاہیے۔ تاوقتیکہ بینۂ شرعیہ سے اس کا ارتکاب ثابت نہ ہو، نیز عدالت سے

سزایاب ہونا بھی موجب فسق کے ارتکاب کی بناء پر سزایاب ہوا تھا، اگر چہ ایسے معروف شخص کی اقتداء بھی کراہت سے خالی نہیں۔ قاضی خاں میں ہے:

اما من سواهم يجوز الاقتداء بهم و يكره و كذا الاقيتداء بمن كان معروفا بالكل الربا و الفسق مروى ذلك عن ابى حنيفة، و ابى يوسف رحمهما الله تعالىٰ.

والله اعلم بالصواب.

نشہ کرنے والے کی امامت کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید خدمت امامت پر منجانب سرکار مامور ہے اور تنخواہ پاتا ہے اور نشہ مثل سیندھی، تاڑی وغیرہ کا بہت عادی ہے اور آزاد منش ہے ایسا شخص خدمت امامت پر برقرار رہ سکتا اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہوسکتا ہے یا کیا؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: نشہ باز شرعاً فاسق اور اس کی امامت مکروہ تحریمی ہے، لہٰذا وہ لائق امامت نہیں، بصورت واقعیت حکام مقامی کو اطلاع دے کر اس کو امامت سے علیٰحدہ کرادیا جاسکتا ہے۔ تاعلیٰحدگی مصلیوں کو چاہیے کہ کسی دوسری مسجد میں جہاں امام پرہیز گار ہو اس کی اقتداء کیا کریں ورنہ اسی کے پیچھے نماز پڑھا کریں مسجد اور جماعت کو ترک نہ کریں فریضہ ادا ہو جائے گا اور جماعت اور مسجد کا ثواب بھی ملے گا، اگر چہ اتنا نہیں جتنا کہ کسی پرہیز گار امام کی اقتداء کرنے میں ملتا ہے۔ کما مر آنفا. والله اعلم بالصواب.

تارک الصلاۃ کی امامت

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک صاحب صرف جمعہ کے روز آکر نماز جمعہ و خطبہ پڑھاتے ہیں باقی دنوں میں نماز نہیں

پڑھتے۔ کیا ایسے صاحب کا پیش امامی کرنا جائز ہے اور ان کی اقتداء درست ہے؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: تارک الصلاۃ، فاسق ہے؛ اگر وہ امام جمعہ ہو تو ایسے شخص کے پیچھے نماز جمعہ ادا کرلینا چاہیے اس کی اقتداء جائز ہے اور اگر اس مقام پر کسی دوسری مسجد میں بھی نماز جمعہ ادا کی جاتی ہو اور وہاں کا امام نمازوں کا پابند ہو تو وہیں جا کر نماز جمعہ ادا کرنا بہتر ہے خصوصاً ان اصحاب کے لیے جو پنجگانہ نمازوں کے پابند ہوں۔ ردالمحتار میں ہے:

و فی المعراج قال اصحابنا: لا ینبغی ان یقتدی بالفاسق الا فی الجمعة لانه فی غیرها یجد اماما غیره اهـ. قال فی الفتح: و علیه فیکره فی الجمعة اذا تعددت اقامتها فی المصر علی قول محمد المفتی به لانه بسبیل الی التحول. والله اعلم بالصواب.

عامل کی امامت کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید امراض بھانامتی، جادو، جن، آسیب وغیرہ کا علاج ذریعہ آیات کریمہ کرتا ہے، کیا اس کے پیچھے اقتداء درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً:

درست ہے باری تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

و ننزل من القرآن ما هو شفآء و رحمة للمؤمنین. اور ردالمحتار کی جلد پنجم کتاب الاجارہ صفحہ ۳۶ میں ہے: ان المتقدمین المانعین الاستیجار مطلقا جوزوا الرقیة بالاجرة و لو بالقرآن کما

ذكره الطحاوی لانها ليست عبادة محضة بل من التداوی.

امام طحاویؒ شرح معانی الآثار کی جلد دوم کتاب الاجارات صفحہ ۲۶۹ر میں روایت فرماتے ہیں: عن خارجة بن الصلت عن عمه انه قال اقبلنا من عند رسول الله صلى الله عليه وسلم فاتينا على حی من احياء العرب فقالوا لنا انكم قد جئتم من عند هذا الحبر بخير فهل عندكم دواء او رقية او شيئ فان عندنا معتوها فی القيود قال فقلنا نعم فجاء وا به فجعلت اقرأ عليه بفاتحة الكتاب ثلاثة ايام غدوة وعشية،أجمع بزاقي ثم أنفل فكأنما نشط من عقال فاعطونی جعلا فقلت لا حتى اسال النبی صلى الله عليه وسلم فسألته فقال: كل فلعمری لمن اكل برقية باطل لقد اكلت برقية حق.

"یعنی خارجہ ابن الصلت اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں، انھوں نے فرمایا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے آرہے تھے۔قبائل عرب میں سے ایک قبیلہ پر ہمارا گزر ہوا ان لوگوں نے کہا کہ تم ایک بڑے عالم ربانی کے پاس سے آرہے ہو کیا تمہارے ہاں کوئی دوا یا عمل، یا کوئی اور چیز ہے، کیوں کہ ہمارے پاس ایک مجنون ہے زنجیروں میں جکڑا ہوا۔خارجہ کے چچا فرماتے ہیں کہ ہم نے جواب دیا کہ ہاں (موجود ہے) اس پر وہ لوگ اس کو لائے اور میں اس پر تین دن تک صبح وشام سورۂ فاتحہ دم کرنے اور (منھ میں) تری جمع کر کے اس پر تھوکنے لگا تو وہ (ایسا بھلا چنگا ہو گیا) جیسا کہ کسی قید سے رہا ہو گیا ہے، پھر ان لوگوں نے مجھے معاوضہ دیا۔ میں نے کہا کہ جب تک

حضرت نبی اکرم ﷺ سے دریافت نہ کرلوں نہیں لوں گا، پھر میں نے آ کر آپ سے دریافت کیا تو ارشاد ہوا کہ کھالو، میری بقا کی قسم! کھانے والے تو باطل منتر پڑھ کر کھاتے ہیں تم تو سچے عمل پر کھا رہے ہو"۔

اس کے علاوہ ایک اور روایت جو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں عرب کے ایک سردار کو بچھو کاٹنے یا کوئی اور عارضہ لاحق ہونے کا بیان ہے جس میں سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کرنے اور سردار کے اچھا ہو جانے پر بکریوں کا ایک گلہ پیش کرنے کا ذکر ہے، اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا: خذوها واضربوا لی معکم فیها بهم. یعنی اس کو لے لو اور اس میں اپنے ساتھ میرا بھی ایک حصہ لگا دو"۔

ان روایات کے نقل کرنے کے بعد امام طحاویؒ فرماتے ہیں: لا بأس بالاستیجار علی الرقی و العلاجات کلها و ان کنا نعلم ان المستاجر علی ذلک قد یدخل فیما یرقی به بعض القرآن لانه لیس علی الناس ان یرقی بعضهم بعضا فاذا استوجروا فیه علی ان یعملوا ما لیس علیهم ان یعملوه جاز.

جب ایسے عملیات پر جو بطور دوا و علاج کئے جائیں معاوضہ لینا جائز ہے تو صرف ایسا عمل کرنا بدرجۂ اولیٰ جائز ہوگا، پس صورت مسئولہ عنہا میں آیات کریمہ کے ذریعہ بھانامتی، سحر وغیرہ کا علاج کرنے والے کی امامت بلا کراہت جائز ہے۔ و الله اعلم بالصواب.

رکعاتِ تراویح کا مسئلہ

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ قیام رمضان

یعنی نماز تراویح کی رکعتیں از روئے حدیث وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین بلا لحاظ مذہب اہل تقلید بیس رکعات باجماعت ادا کرنا اقویٰ ہے یا آٹھ رکعت؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً ومصلیاً: تراویح سنت مؤکدہ ہے اس کی بیس رکعات (دس دوگانہ) ہیں جس پر خلفائے راشدین (سیدنا عمرو عثمان وعلی) رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاہم عنا نے مواظبۃ فرمائی اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس سے اتفاق فرمایا اور عہد خلافت راشدہ سے اب تک امت مرحومہ کا اس پر بلا خلاف عمل درآمد ہے۔ درمختار میں ہے:

التراویح سنة مؤكدة لمواظبة الخلفاء الراشدين رضى الله عنهم اجمعين و هى عشرون ركعة بعشر تسليمات.

اور ردالمحتار میں ہے: (قوله سنة مؤكدة) صححه فى الهداية وغيرها و هو المروى عن ابى حنيفة رضى الله عنه و ذكر فى الاختيار ان ابايوسف سأل ابا حنيفة رضى الله عنه و ما فعله عمر رضى الله تعالىٰ عنه فقال: التراويح سنة مؤكدة و لم يتخرجه عمر مت تلقاء نفسه و لم يكن فيه مبتدعا و لم يأمر به الا عن اصل لديه و عهد من رسول الله صلى الله عليه وسلم و فى شرح منية المصلى و حكى غير واحد الاجماع على سنيتها. (قوله لمواظبة الخلفاء الراشدين) اى اكثرهم لان المواظبة عليها وقعت فى اثناء خلافة عمر رضى الله عنه و وافقه على ذلک عامة الصحابة و من بعدهم الىٰ يومنا هذا بلا نكرير و كيف لا وقد ثبت عنه صلى الله عليه وسلم عليكم بسنتى سنة الخلفاء

الراشدين المهديين عضوا عليها بالنواجذ. رواه ابو داؤد.
حدیث شریف میں وارد ہے کہ تم میری سنت اور خلفائے راشدین مہدیین کی سنت کے پابند رہو اور اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑو"۔

(قوله و هی عشرون رکعة) هو قول الجمهور و علیه عمل الناس شرقاً و غرباً. اور بحر الرائق کی جلد دوم صفحہ ۷۱؍ میں ہے: و قوله عشرون رکعة بیان لکمیتها او هو قول الجمهور لما فی الموطا عن یزید بن رومان قال: کان الناس یقومون زمن عمر بن الخطاب رضی الله تعالیٰ عنه بثلاث و عشرین رکعة و علیه عمل الناس شرقاً و غرباً لکن ذکر المحقق فی فتح القدیر ما حاصله ان الدلیل یقتضی ان تکون السنة من العشرین ما فعله صلی الله علیه وسلم منها ثم ترکه خشیة ان تکتب علینا و الباقی مستحب و قد ثبت ان ذلک کان احدی عشرة رکعة بالوتر ثبت فی الصحیحین من حدیث عائشة رضی الله عنها و اذن یکون المسنون علی اصول مشائخنا ثمانیة منها و المستحب اثنا عشر انتهیٰ. اور منحۃ الخالق میں ہے:
(قوله کما ثبت فی الصحیحین الخ) ای الحدیث السابق عند قول المتن و الافضل فیهما الرباع و فیه ما کان یزید فی رمضان و لا غیره علیٰ احدی عشرة رکعة قال فی الفتح و اما ما روی ابن ابی شیبة فی مصنفه و الطبرانی و عند البیهقی من حدیث ابن عباس عنه صلی الله علیه وسلم کان یصلی فی رمضان عشرین رکعة سوی الوتر

فضعيف بابى شيبة ابراهيم بن عثمان جد الامام ابى بكر بن ابى شيبة متفق على ضعفه مع مخالفته للصحيح اھ.
قلت: فقد يجاب عنها بان ما فى الصحيح مبنى على ما هو الغالب من احواله صلى الله تعالى عليه وسلم و هذا كان ليلتين فقط ثم تركه عليه الصلوة و السلام فلذا لم تذكره عائشة رضى الله عنها و اما تضعيف الحديث بمن ذكر فقد يقال انه اعتضد بما مر من نقل الاجماع على سنيتها من غير تفصيل مع قول الامام رحمه الله ان ما فعله عمر رضى الله عنه لم يتخرجه من تلقاء نفسه و لم يكن فيه مبتدعا و لم يأمر به الا عن اصل لديه و عهد من رسول الله صلى الله عليه وسلم فتأمل منصفاً.

علامہ محقق ابن ہمامؒ نے ام المومنین سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے جو صحیحین میں مروی ہے یہ استدلال جو فرمایا ہے کہ تراویح کی بیس رکعتوں کے منجملہ آٹھ سنت اور باقی مستحب ہونا پایا جاتا ہے اور اس کے مقابل حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث جس کی ابن ابی شیبہ اور طبرانی اور بیہقی نے روایت کی ہے جس میں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیس رکعات ادا فرمانے کی تصریح ہے اس کو ایک راوی کے ضعف کی بنا پر جو ضعیف بتلایا ہے اس کا جواب علامہؒ ابن عابدینؒ نے یہ دیاہیکہ ان دونوں احادیث شریفہ میں تعارض نہیں ہے ام المومنینؓ کی حدیث میں ان آٹھ رکعات (تہجد) کا بیان ہے جو رمضان اور غیر رمضان تمام مہینوں میں ادا فرمائی جاتی تھیں، نیز یہ کہ تراویح کی دو دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں، اور ام المومنین کی حدیث میں

چار چار رکعتیں بیک سلام ادا فرمانے کی تصریح ہے، اس سے بھی یہی پایا جاتا ہے کہ ام المومنین کی حدیث نماز تہجد سے متعلق ہے، اس کے علاوہ ام المومنین جو اس حدیث شریف کی روایت فرماتی ہیں ان کا اقامت تراویح کے عہد سے خلافت راشدہ کا عہد ختم ہونے تک موجود رہنا اور اس پر انکار نہ فرمانا بھی اس امر کی دلیل ہے کہ روایت مذکورہ کا تعلق تراویح سے نہیں ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث میں تراویح کی بیس رکعتوں کا بیان ہے جس کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دو رات ادا فرمایا، پھر اس کے فرض ہو جانے کے اندیشہ سے ترک فرما دیا جو اثبات سنیت کے لیے کافی ہے، رہا راوی کا ضعف وہ بیس رکعات پر خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مواظبت اور حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ کی اس تصریح کے بعد باقی نہیں رہتا کہ ایسا عمل کرنا اور دوسروں کو حکم دینا بطور خود نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ کسی اصل پر مبنی نہ ہو اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایماء نہ پایا ہو، عمل مذکور کسی اصل پر مبنی ہونا امام بیہقی اور اصبہانی کی روایت سے بھی پایا جاتا ہے جو ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے آپ فرماتی ہیں:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا دخل شهر رمضان تغير لونه و كثرت صلاته و ابتهل فى الدعاء و اشفق منه. اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایماء اس حدیث شریف میں موجود ہے جس کو ابن ابی شیبہ، نسائی، ابن ماجہ، اور بیہقی نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، آپ فرماتے ہیں:

ذكر رسول الله صلى الله عليه وسلم رمضان فقال شهر

فرض الله علیکم صیامه و سننت انا قیامه فمن صامه و قامه ایمانا و احتسابا خرج من ذنوبه کیوم و لدته امه.
بہر حال رکعات تراویح کی تعداد بیس ہونا ہی قوی تر اور سنت مؤکدہ ہے اور یہی قول جمہور کا ہے اور یہی اہل تقلید کا مذہب ہے، البتہ تراویح کو مسجد میں باجماعت ادا کرنا سنت کفایہ اور اہل السنّت والجماعت کا شعار ہے اس کو ترک نہ کرنا چاہیے، اگر محلّہ کی مسجد میں چند اشخاص بھی اس کو باجماعت ادا کرلیں تو بقیہ اہل محلّہ کے لیے جماعت کی پابندی باقی نہیں رہتی، لیکن تراویح کی بیش رکعتیں ان کو بھی ادا کرنی چاہیں اور اگر اہل محلّہ سے مسجد میں کوئی بھی تراویح باجماعت ادا نہ کرے تو تمام اہل محلّہ گنہگار ہوں گے۔ ہدایہ میں ہے: (و السنة فیها الجماعة) لکن علی وجه الکفایه. اور مبسوط کی جلد دوم صفحہ ۱۴۵/ میں شمس الائمہ سرخسیؒ فرماتے ہیں: و ذکر الطحاوی رحمه الله تعالی فی اختلاف العلماء و قال لا ینبغی ان یختار الانفراد علی وجه یقطع القیام فی المسجد فالجماعة من سنن الصالحین و الخلفاء الراشدین رضوان الله علیهم اجمعین حتی قالوا رضی الله تعالیٰ عنهم نور الله قبر عمر رضی الله تعالیٰ عنه کما نور مساجدنا، و المبتدعة انکروا ادائها بالجماعة فی المسجدنا فأدائها بالجماعة فأدائها جعل شعاراللسنة کاداء الفرائض بالجماعة شرع شعار الاسلام. والله اعلم بالصواب.

نماز میں قرآن دیکھ کر لقمہ دینے کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید تراویح میں

نماز کی نیت باندھ کر قرآن شریف سامنے رکھ لیتا ہے اور جس وقت امام حافظ قرآن قراءت میں رُکتا ہے تو زید قرآن دیکھ کر امام کو لقمہ لینے والے امام اور دیگر مصلیوں کی نماز درست ہوتی ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: نماز کی حالت میں قرآن شریف کو دیکھ کر پڑھنا یا اس میں دیکھ کر بتانا عند الاحناف مفسد نماز ہے، اس لیے کہ نماز میں قرآن شریف کو اٹھائے ہوئے رہنا اور اس کو دیکھتے رہنا، اور ورق گردانی کرنا، عمل کثیر ہے جس کے بے سبب کرنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ نیز نماز کی حالت میں قرآن شریف کو دیکھ دیکھ کر بتانا، غیر نمازی سے علم حاصل کرنے کے حکم میں ہے اور یہ بھی باتفاق ائمہ مفسد نماز ہے، ایسے عمل سے بتلانے والے کی نماز فاسد ہو جاتی ہے اور اگر اما اس کا لقمہ لے لے تو امام کی نماز اور اس کے جملہ مقتدیوں کی نمازیں بھی فاسد ہو جائیں گی۔ عالمگیریہ کی جلد اول صفحہ (۸۰) میں ہے:

و بفسدهاقراء ته من مصحف عند ابی حنیفةؒ و قالا لا یفسد له ان حمل المصحف و تقلیب الاوراق و النظر فیه عمل کثیر و للصلاة عنه بدّ وعلی هذا لو کان موضوعاً بین یدیه علی رحل و هو لا یحمل و لا یقلب او قرأ المکتوب فی المحراب لا تفسد و لان التلقن من المصحف تعلم لیس من اعمال الصلوة و هذا یوجب التسویة بین المحمول و غیره فتفسد بکل حال و هو الصحیح کذا فی الکافی. اور رد المحتار میں ھے: (قوله لانه تعلم) ذکروا لابی حنیفةؒ فی علة الفساد وجهین احدهما ان حمل المصحف والنظر فیه وتقلیب الأوراق عمل کثیر، والثانی انه تلقن عن المصحف فصار کما اذا

تلقن من غيره.على الثاني لا فرق بين الموضوع و المحمول عنده و على الاول يفترقان و صحح الثاني في الكافي تبعا تصحيح السرخسي.

لہٰذا اگر کوئی مقتدی بحالت نماز قرآن شریف کو اٹھایا ہوا نہ ہو بلکہ اس کو رحل پر رکھ دیا ہو اور ورق گردانی بھی نہ کرے صرف اس کو دور سے دیکھتا جائے اور دیکھ دیکھ کر بتاتا جائے تو ایسی حالت میں بھی نماز فاسد ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب.

ایک امام کا دو مسجدوں میں تراویح پڑھانا

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک حافظ صاحب نماز تراویح کی کامل بیس رکعات ایک مسجد میں پڑھانے کے بعد دوسری مسجد میں جا کر دوبارہ نماز تراویح پڑھاتے ہیں۔ کیا یہ تراویح جس کو وہی حافظ صاحب دوبارہ پڑھاتے ہیں شرعاً جائز ہے اور مقتدیوں کی تراویح ادا ہوتی ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً ومصلیاً: تراویح کی صرف بیس رکعتیں ہیں جو سنت مؤکدہ ہیں امام نے ایک دفعہ پڑھا دیں تو تراویح ادا ہوگئی اس کے بعد وہی امام دوبارہ بیس رکعات ادا کرے تو یہ نماز اس کے حق میں تراویح نہ ہوگی بل کہ نفل ہوگی اور جو لوگ دوسری مسجد میں تراویح ادا کر رہے ہیں وہ ان کے حق میں سنت ہے۔ لہٰذا نفل پڑھنے والے امام کی اقتداء سنت پڑھنے والے مقتدیوں کے لیے جائز نہیں ہے، اگر پڑھ لیں تو ان کو اعادہ کر لینا چاہیے، بحر الرائق کی جلد دوم باب الوتر و النوافل صفحہ ۷۴/ میں ہے:

امام يصلي التراويح في مسجدين كل مسجد على وجه الكمال لا يجوز لانه لايتكرر. اور بدائع صنائع کی جلد اول صفحہ ۲۸۹/ میں ہے: و لا يصلي امام

واحد التراويح و على القوم ان يعيدوا لان صلاة امامهم نافلة و صلاتهم سنة و السنة اقوى فلم يصح الاقتداء لان السنة لا تتكرر فى وقت واحد و ما صلى فى المسجد الاول محسوب و ليس على القوم ان يعيدوا. والله اعلم بالصواب.

قضائے عمری کی نماز کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ گاؤں کے باشندے جن کے ذمہ نمازیں قضا رہتی ہیں وہ قضا نمازوں کے طریقۂ ادا سے واقف نہیں ہوتے، اس لیے شب قدر میں قضائے عمری کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتے ہیں آیا اس طرح نماز ادا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اور اس طریقہ سے قضا نمازیں ذمہ سے ساقط ہو جائیں گی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً: صورت مسئول عنہا میں اگر عمر بھر کی ہر ہر نماز قضا کی جاتی ہے اور امام جس دن اور جس وقت کی قضاء پڑھ رہا ہے مقتدیان بھی اسی دن اور اسی وقت کی قضا اس امام کی اقتداء سے ادا کر رہے ہیں تو امام اور مقتدیوں کی نماز ادا ہو جائے گی، اور وہ فریضہ بھی ان سب کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا۔ اور اگر امام ایک دن یا ایک وقت کی نماز کی قضاء کر رہا ہے اور مقتدی دوسرے دن یا دوسرے وقت کی نماز قضا کر رہے ہوں تو صرف امام کی قضا نماز صحیح ہو جائے گی اور وہ فریضہ بھی اس کے ذمہ سے ساقط ہوگا، لیکن مقتدیوں کی نماز نفل ہو جائے گی، اور قضا ان کے ذمہ بدستور باقی رہے گی۔ تبیین الحقایق کی جلد اول باب الامامۃ صفحہ:۱۴۲ر میں ہے:

لا يجوز اقتداء مفترض بمفترض فرضاً آخر. نیز اسی

صفحہ میں ہے: و حاصله ان اتحاد الصلاتين شرط لصحة الاقتداء لان الاقتداء شركة و موافقة فلا يكون ذلك الا بالاتحاد و ذلك بان يمكنه الدخول فى صلاته بنية صلاة الامام فتكون صلاة الامام متضمنة لصلاة المقتدى و هو المراد بقوله عليه الصلاة و السلام الامام ضامن اى تتضمن صلاته صلاة المقتدى. پھر علامہ زیلعیؒ یہ سوال قائم فرماتے: ثم فى كل موضع لم يصح الاقتداء من هذه المسائل هل يصير شارعا فى التطوع ام لا. اورفقہاء کرام کے اقوال نقل فرما کر خود ہی اس کا جواب اس طرح تحریر فرماتے ہیں: قال الراجى عفو ربة الاشبه ان يقال: ان فسدت لفقد شرط الصلاة كالطاهر خلف المعذور لا يكون شارعا و ان كان للاختلاف بين الصلاتين ينبغى ان يكون شارعا فيه غير مضمون بالقضاء لاجتماع شرائطه فصار كالظان و ثمرة الخلاف تظهر فى حق بطلان الوضوء بالقهقهة.

اور قضائے عمری سے یہ مراد ہے کہ دو چار رکعت نماز نفل ادا کر کے یہ تصور کر لیا جائے کہ ہمارے ذمہ جس قدر قضا نمازیں واجب ہیں اس سے ان سب نفل نمازوں کا کفارہ ہو جائے گا اور کوئی قضاء نماز اپنے ذمہ باقی نہیں رہے گی۔ جیسا کہ فی زمانناعوام میں مشہور ہے یہ بے اصل ہے، نیز کسی نفل نماز کو (جس میں جماعت مشروع نہیں ہے) جماعت کے ساتھ ادا کرنا مکروہ ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

نماز جمعہ کی فرضیت کا مسئلہ

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک صاحب

یہ اعلان کررہے ہیں کہ نماز جمعہ واجب ہے، حالاں کہ عام مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ نماز جمعہ فرض عین ہے دراصل مسئلہ شرعی کیا ہے؟ بینوا تو جروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: نماز جمعہ فرض عین ہے اور اس کی فرضیت کتاب اللہ، احادیثِ شریفہ اور اجماع امت مرحومہ اور قیاس سے ثابت ہے، باری تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ. اس آیۂ کریمہ میں ذکر اللہ کے لیے تیزی سے آنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ذکر اللہ سے اگر نماز مراد ہو تو فرضیت ظاہر ہے۔ اور اگر خطبہ مراد لیا جائے تو چوں کہ خطبہ شرط نماز ہے، جب شرط کے لیے آنا فرض ہے تو مشروط کے لیے بدرجۂ اولیٰ فرض ہوگا، اور اگر نماز اور خطبہ دونوں مراد ہوں تو بھی فرضیت جمعہ ثابت ہے۔

نیز حدیث شریف میں وارد ہے: اعلموا ان اللہ کتب علیکم الجمعة فی یومی هذا فی شهری هذا فی مقامی هذا فمن ترکها تهاونًا بها و استخفافا بحقها و له امام جابرا و عادل الا فلا جمع اللہ شمله الا فلا صلاة له الا فلا زکاة له الا فلا صوم له الا ان یتوب فمن تاب تاب اللہ علیه. یہاں کتب سے فرضیت ہی مراد ہو سکتی ہے، اور اس کے تارک کے حق میں سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں اس سے بھی فرضیت ثابت ہے۔

نیز اجماع سے بھی اس کی فرضیت ثابت ہے۔ چنانچہ تمام صحابۂ کرام اور ائمۂ مجتہدین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس کی فرضیت پر اتفاق فرمایا ہے۔ جمعہ کے فرض ہونے میں کسی کا کوئی خلاف نہیں ہے۔

نیز قیاس بھی اس کی فرضیت کا مقتضی ہے، کیوں کہ جمعہ قائم کرنے کی غرض سے ظہر کو اس دن ترک کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ظہر فرض ہے، اور کسی فرض کے ترک کرنے کا حکم ایسے ہی موقع پر دیا جا سکتا ہے جب کہ کوئی فرض اس سے زیادہ مہتم

بالشان ہو؛ بہر حال جمعہ فرض عین، اور بہت تاکیدی فرض ہے، اس کا منکر کافر اور بے عذر ترک کرنے والا سخت گنہگار ہے۔ عنایہ مطبوع بر حاشیہ فتح القدیر ج ۲/ باب الجمعہ صفحہ ۲۳/ میں ہے:

وهی فريضة بالكتاب و السنة و اجماع الامة و المعقول اما الكتاب فقوله تعالىٰ يآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَيْعِ. امر بالسعی الی ذکر الله و هی الخطبة التی هی شرط جواز الجمعة و الامر للوجوب و اذا كان السعی واجبا اليها فالی ما هو المقصود و هو الجمعة اولی و اكد ذلك بتحريم المباح و لا يكون الا لامر واجب مقتضی الحكمة و اما السنة فقوله صلى الله عليه وسلم اعلموا ان الله تعالىٰ كتب عليكم الجمعة الخ. و اما الاجماع فلان الامة قد اجتمعت على فرضيتها و انما اختلفوا فی اصل الفرض فی هذا الوقت على ما يجیئ. و اما المعقول فلانا امرنا ان نترک الظهر لاقامة الجمعة و الظهر فريضة لا محالة و لا يجوز ترک الفريضة الا لفرض هو آكد منه. اور کفایہ کے صفحہ ۲۳/ میں بھی اسی طرح مذکور ہے، فتح القدیر کی جلد ۲/ صفحہ ۲۳/ میں ہے: فالظاهر ان المراد بالذكر الصلاة و يجوز كون المراد به الخطبة و على كل تقدير يفيد افتراض الجمعة فالاول ظاهر و الثانی كذلک لان افتراض السعی الی الشرط و هو المقصود لغيره فرع افتراض ذلک الغير او لا ترى ان من لم يجب عليه

الصلاۃ لا یجب علیہ السعی الی الخطبۃ بالاجماع. و المذکور فی التفسیر ان المراد الخطبۃ و الصلاۃ و ھو الاحق لصدقہ علیھما معا. نیز فتح القدیر کے صفحہ مذکور میں یہ بھی ہے: الجمعۃ فریضۃ محکمۃ بالکتاب و السنۃ و الاجماع یکفر جاحدھا. اور عالمگیریہ کی جلد اول باب الجمعہ صفحہ ۵۳ر میں ہے: وھی فرض عین کذا فی التھذیب.

بعض کتابوں میں جمعہ کو واجب جو لکھا ہے اس سے بھی فرض ہی مراد ہے جو دلیل قطعی سے ثابت ہو اس سے وہ واجب مراد نہیں جو دلیل ظنی سے ثابت ہو اور جن صاحب نے اس کے واجب ہونے کا اعلان کیا ہے اس سے بھی ان کی مراد ہی واجب ہوگی جو دلیل قطعی سے ثابت ہو لیکن ایسا اعلان نہ کرنا چاہیے جس سے اس قسم کا فتنہ پیدا ہو۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

قبر کی لمبائی، چوڑائی اور گہرائی کی مقدار

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ سر رشتۂ صفائی بلدہ سے قبرستان کے قواعد مرتب ہو رہے ہیں، اس میں یہ امر دریافت طلب ہے کہ قبر کا طول اور عرض اور عمق کس قدر ہونا چاہئے۔ نیز یہ کہ بچوں اور بڑوں، عورتوں اور مردوں کی قبروں میں طول وعرض وعمق کے لحاظ سے شرعا کوئی فرق ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: قبر کا طول، میت کے طول کے موافق ہونا چاہیے اس طرح کہ میت اس میں سیدھی بے تکلف لٹائی جاسکے، اور عرض اس کے طول کا نصف ہو، اور عمق (گہرائی) ایک متوسط القامۃ انسان کے کم از کم ناف تک ہونا چاہئے، اگر عمق سینہ تک یا پورا قد آدم ہو تو زیادہ مناسب ہے تاکہ میت جانوروں کے

کھودنے سے محفوظ رہے، نیز اس کی بو سے عامۃ الناس محفوظ رہ سکیں، بچوں اور بزرگوں عورتوں اور مردوں سب کے لیے بس یہ ایک ہی معیار ہے، درمختار مطبوع بر حاشیہ ردالمحتار کی جلد اول باب الجنائز صفحہ ۵۹۸ رمیں ہے:

(و حفر قبره) فی غیر دار مقدار نصف قامة فان زاد فحسن.

اور ردالمحتار میں ہے: (مقدار نصف قامة الخ) او الی حد الصدر ان زادا لی مقدار قامة فهو احسن کما فی الذخیرة فعلم ان الادنی نصف القامة و الا علی القامة و ما بینهما شرح المنیة و هذا حد العمق و المقصود منه المبالغة فی منع الرائحة و نبش السباع و فی القهستانی و طوله علی قدر طول المیت و عرضه علی قدر نصف طوله. اور جوہرہ نیرہ کی جلد اول صفحہ ۱۱۰ رمیں ہے: و ینبغی ان یکون مقدار عمقه الی صدر رجل وسط القامة و کل مازاد فهو افضل لان ما فیه صیانة المیت من الضیاع. اور طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح کے صفحہ ۳۵۴ رمیں ہے: قوله یحفر القبر نصف قامة فی الحجة روی الحسن بن زیاد عن ابی حنیفة انه قال طول القبر علی قدر طول الانسان و عرضه قدر نصف قامته کذا فی الشرح عن التتارخانیة. اور مضمرات، زیلعی، بحرالرائق اور عالمگیریہ وغیرہ میں بھی یہی احکام درج ہیں۔

نیز سنت یہ ہے کہ قبر بطور لحد (بغلی) تیار کی جائے یعنی اول قبر کھودی جائے اور اس کے اندر قبلہ کی سمت میں ایک گڈھا کھود لیا جائے جو مسقف مکان کی طرح ہو اس میں میت کو لٹایا جائے، اور کچی اینٹوں سے اس کا منھ بند کر دیا جائے اس کے بعد قبر کی تمام مٹی ڈال دی جائے، اگر زمین نرم ہو اور لحد بنانے کے قابل نہ ہو تو لحد بنانے

کا خیال ترک کر دیا جائے، درمختار میں ہے:

(و یلحد و لا یشق) الا فی ارض رخوة. اور ردالمحتار میں ہے:

(قوله و یلحد) لانه السنة و صفته ان یحفر القبر ثم یحفر فی جانب القبلة منه حفرة فیوضع فیها المیت و یجعل ذلک کالبیت المسقف. حلیة. وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوابِ.

کتاب الزکاۃ

صدقۃ الفطر کی مقدار اور اس کی تقسیم کا مسئلہ

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ صدقۂ فطر کی مقدار کیا ہے؟ اور پورا فطرہ ایک ہی مسکین کو دینا چاہیے یا چار پانچ مساکین میں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے؟ کیوں کہ فی زمانا مساکین زیادہ ہیں، اگر پورا فطرہ ایک ہی مسکین کو دے دیا جائے تو دوسرے مساکین محروم ہو جاتے ہیں۔ لہذا تفصیل مطلوب ہے؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: صدقۂ فطر میں گیہوں (یا اس کا آٹا یا اس کا ستو) یا منقہ دیا جائے تو نصف صاع اور اگر جو (یا اس کا آٹا یا اس کا ستو) یا کھجوریں دی جائیں تو ایک صاع دینا چاہیے، ہدایہ کے باب صدقۃ الفطر میں ہے:

الفطرة نصف صاع من برأو دقیق أو سویق أو ذبیب أو صاع من تمر أو شعیر. آٹھ رطل عراقی کا ایک صاع ہوتا ہے، ہدایہ میں ہے: و الصاع عند ابی حنیفة و محمد رحمهما الله ثمانیة ارطال بالعراقی. اور رطل نصف من کا اور من چالیس استار کا اور استار ساڑھے چار مثقال کا ہوتا ہے۔ ردالمحتار کی جلد دوم

باب صدقۃ الفطر صفحہ ۷۶ر میں ہے: و الرطل نصف من و المن بالدراهم مائتان و ستون درهما و بالاستار ابعون و الاستار بكسر الهمزة بالدراهم ستة و نصف و بالمثاقيل اربعة و نصف كذا فى شرح درر البحار. اورمثقال، بیس قیراط کا اور قیراط پانچ جو کا ہوتا ہے، درمختار کے باب زکوۃ الاموال: صفحہ ۱۳۹ر میں ہے: و الدينار عشرون قيراطا و الدرهم اربعة عشر قيراطا و القيراط خمس شعيرات. اور رد المختار میں ہے: (قوله والدينار) اى الذى هو المثقال كما فى الزيلعى وغيره.

اس اعتبار سے ایک صاع بہتر ہزار آٹھ سو جو کا ہوتا ہے۔ اور نصف صاع چھتیس ہزار چار سو جو کا ہوگا، ممالک محروسہ کار عالی بلکہ تمام ہندوستان میں جو اوزان و پیمانے رائج ہیں ان کا حساب اس طرح ہے کہ چار جو کی ایک رتی اور آٹھ رتی کا ایک ماشہ اور بارہ ماشہ کا ایک تولہ اس حساب سے چورانوے تولے نو ماشے چار رتی کا نصف صاع اور (۱۸۹) تولے سات ماشے کا ایک صاع ہوتا ہے۔

اس وزن کے مطابق اجناس مذکورہ تول کر دیدیے جائیں تو حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ کے نزدیک صدقہ فطر ادا ہو جائے گا؛ لیکن امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق اس کے ہم وزن جو کا ایک پیمانہ بنالینا چاہیے اور اس سے گیہوں، منقہ، جو اور کھجوریں ناپ کر دی جانی چاہیے اور اسی میں احتیاط ہے۔ ہدایہ میں ہے:

ثم يعتبر نصف صاع من بر وزنا فيما يروى عن ابى حنيفة رحمه الله و عن محمد رحمه الله انه يعتبر كيلا. اور رد المختار کی جلد دوم صفحہ ۷۷ر میں ہے: الاحوط تقديره بالشعير و لهذا نقل بعض المحشين عن حاشية الزيلعى سيد محمد

امین میر غنی ان الذی علیه مشائخنا بالحرم الشریف المکی و من قبلهم من مشائخهم و به کانوا یفتون تقدیره بثمانیة ارطال من الشعیر و لعل ذلک لیحتاطوا فی الخروج عن الواجب بیقین لما فی مبسوط السرخسی من ان الاخذ بالاحتیاط فی باب العبادات واجب اھ.

۲- اولیٰ یہ ہے کہ کسی مسکین کو ایک فطرہ سے کم نہ دیا جائے تا کہ عید کے دن اس کو مانگتے پھرنے کی نوبت نہ آئے، لیکن اگر ایک فطرہ چند مساکین میں تقسیم کر دیا جائے تو یہ بھی جائز ہے، بحرالرائق کی جلد دوم باب صدقۃ الفطرۃ صفحہ: ۲۷۵/میں ہے:

و لم یتعرض فی الکتاب لجواز تفریق صدقة شخص علی مساکین و ظاهر ما فی التبیین و فتح القدیر ان المذهب المنع و ان القائل بالجواز انما هو الکرخی و صرح الولوالجی و قاضی خان و صاحب المحیط و البدائع بالجواز من غیر ذکر خلاف فکان هو المذهب کجواز تفریق الزکاة و اما الحدیث المأمور فیه بالاغناء فیفید الاولویة وقد نقل فی التبیین الجواز من غیر ذکر خلاف فی باب الظهار.

اسی طرح چند اشخاص کے فطرے بھی ایک ہی مسکین کو دے جا سکتے ہیں بحرالرائق میں ہے:

و اما دفع صدقة جماعة الی مسکین واحد فلا خلاف فی جوازه. وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

کتابُ النکاح

پھوپھی زاد بہن کی نواسی اور پھوپھی زاد بھائی کی پوتی سے نکاح کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید اپنی پھوپھی زاد بہن کی نواسی فاطمہ، یا پھوپھی زاد بھائی کی پوتی حمیدہ کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: پھوپھی فرع جد ہے اور شرعاً فروع جد کا صرف ایک ہی بطن حرام ہے یعنی خاص پھوپھی کی اولاد خواہ وہ کتنے ہی نیچے کے درجہ کی ہو وہ سب حلال ہے؛ لہٰذا پھوپھی کی بیٹی اور اس کی نواسی نیز پھوپھی کے بیٹے کی پوتی کے ساتھ نکاح کرنا شرعاً جائز ہے، تبیین الحقائق کی جلد دوم فصل محرمات صفحہ ۱۰۱ میں ہے:

المحرمات بالنسب و هن انواع فروعه و اصوله و فروع ابويه وان نزلوا و فروع اجداده وحياته اذا انفصلوا ببطن واحد. اور اس کے حاشیہ پر علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: (قوله اذا انفصلوا ببطن واحد) فلهذا تحرم العمات و الخالات و تحل بنات الاعمام و الاخوال و الخالات اھ اور بدائع صنائع کی جلد دوم صفحہ ۲۵۷ میں ہے: و تحل له بنت العمة و الخالة و بنت العمّ و الخال لان الله تعالىٰ ذكر المحرمات فى آية التحريم ثم اخبر سبحانه و تعالىٰ انه احل ما وراء ذلك بقوله: وَ أُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذَٰلِكُمْ و

بنات الاعمام و العمات و الاخوال و الخالات لم یذکرن فی المحرمات فکن مما وراء ذلک لکن محللات و کذا عمومات النکاح لا توجب الفصل ثم خص عنها المحرمات المذکورات فی آیة التحریم فبقی غیرهن تحت العموم وقد ورد نص خاص فی الباب و هو قوله تعالیٰ: یآ أَیُّهَا النَّبِیُّ إِنَّآ أَحْلَلْنَا لَکَ أَزْوَاجَکَ الیٰ قوله عزو جل وَ بَنَاتِ عَمِّکَ وَ بَنَاتِ عَمَّاتِکَ وَ بَنَاتِ خَالِکَ وَ بَنَاتِ خَالَاتِکَ اللّٰاتِی هَاجَرْنَ مَعَکَ الآیة. و الاصل فیما یثبت للنبی صلی الله علیه وسلم ان یثبت لامته و الخصوص بدلیل و الله الموفق.

لہٰذا صورتِ مسئول عنہا میں زید کا نکاح فاطمہ اور حمیدہ کے ساتھ شرعاً حلال ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

سالی کے ساتھ ناجائز تعلقات کا نکاح پر اثر

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ اور خالدہ دونوں حقیقی بہنیں ہیں، ان میں سے ہندہ کے ساتھ زید نے نکاح کر لیا ہے اور خالدہ کے ساتھ اس کے ناجائز تعلقات ہیں، ایسی حالت میں ہندہ کا نکاح برقرار رہے گا یا نہیں؟ نیز ہندہ کے ساتھ اس کے تعلقات شرعاً درست ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: زنا شرعاً حرام اور گناہ کبیرہ ہے جس کی سزا دنیا میں تازیانہ، رجم اور آخرت میں عذاب شدید ہے، اس سے فوراً توبہ کرنی چاہیے، اگرچہ خالدہ کے ساتھ زید کے ناجائز تعلقات کا اثر ہندہ کے نکاح پر نہیں پڑتا اور ہندہ بدستور اس کے نکاح میں باقی رہتی ہے؛ لیکن مستحب یہ ہے کہ خالدہ

کیا یک حیض ختم کرنے تک زید ہندہ سے مقاربت نہ کرے، درمختار کے باب المحرمات صفحہ ۲۸۱/میں ہے:

و فی الخلاصة وطی اخت امرأته لا تحرم علیه امرأته. اوررد المحتار میں ہے: و فی الدرایة عن الکامل لو زنی باحدی الاختین لا یقرب الاخریٰ حتی تحیض الاخریٰ حیضة و استشکله فی الفتح و وجهه انه لا اعتبار لماء الزانی و لذا لو زنت امرأت رجل لم تحرم علیه و جاز له وطؤها عقب الزنا اھ. وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

سالے سے بیٹی کے نکاح کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ فقیر محمد کا نکاح ہندہ کے ساتھ ہوا، اور اس سے ایک لڑکی (خالدہ) پیدا ہوئی، اس کے بعد ہندہ کا انتقال ہوگیا تو دوسرے خاندان میں جمیلہ کے ساتھ نکاح کیا ایسی حالت میں خالدہ کا نکاح جمیلہ کے بڑے بھائی کے ساتھ شرعاً درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: صورت مسئول عنہا میں فقیر محمد کی دختر کا جمیلہ کے بھائی کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے لہٰذا خالدہ کا نکاح جمیلہ کے بھائی کے ساتھ شرعاً درست ہے۔ کما قال تعالیٰ:

وَ اُحِلَّ لَکُمْ مَا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ. وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

غیر کفو میں نکاح کا مسئلہ

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ نابالغہ کا نکاح اس کے دادا کے حقیقی بھائی نے خالد کے ساتھ کر دیا، خالد مذکور ہندہ کا کفو نہیں

ہے، ہندہ نے بفور بلوغ اس نکاح کو فسخ کر دیا، ایسی حالت میں خالدہ کا بطور خود اس نکاح کو فسخ کر دینا کافی ہے یا عدالت کی ضرورت ہے؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: صورت مسئول عنہا میں نابالغہ کا نکاح اس کے دادا کے بھائی نے غیر کفو میں کر دیا تھا تو شرعاً نکاح مذکور منعقد ہی نہیں ہوا، لہٰذا نابالغہ مذکورہ اب بالغہ ہو چکی ہے تو وہ اپنی مرضی سے نکاح کر سکتی ہے۔ بدائع صنائع کی جلد دوم صفحہ ۲۴۵ر میں ہے:

و لو زوج ابنته الصغيرة بمهر مثلها من غير كفؤ فهو علىٰ هذا الخلاف و لو فعل غير الاب و الجد شيئاً مما ذكرنا لا يجوز فی قولهم جميعاً. اور درمختار میں ہے:(و ان كان المزوج غيرهما) ای غير الاب و ابيه (لا يصح من غير كفؤ اور بغبن فاحش اصلا. و ما فی صدر الشريعة صح و لهما فسخه وهم. اور ردالمختار کی جلد دوم صفحہ ۳۰۵/ میں ہے: (قوله اصلا) ای لا لازما و لا موقوفا على الرضى بعد البلوغ قال فی فتح القدير و على هذا ابتنى الفرع المعروف لو زوج العم الصغيرة حرة الجد من معتق الجد فكبرت و اجازت يصح لانه لم يكن عقدا موقوفا اذ لا مجيز له فان العم و نحوه لم يصح منهم التزويج بغير الكفؤ. اهـ. وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

بیوی کا دودھ پینے کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید بیمار ہے؛ لیکن چل پھر سکتا ہے مرض خطرناک نہیں ہے اور علاج کے لیے دوسری جگہ سے دودھ

مل سکتا ہے باوجود اس کے زید تین چار روز تک اپنی زوجہ کا دودھ کٹوری میں ڈال کر پیتا رہا اور اب یہ چاہتا ہے کہ منھ لگا کر پیئے کیا اس طرح زوجہ کا دودھ پینا شرعاً جائز ہے؟ نیز یہ کہ دودھ پینے کے بعد عورت مرد کے لیے جائز رہ سکتی ہے یا نہیں؟ بینوا تو جروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: رضاعت کی عمر ختم ہو جانے کے بعد عورت کا دودھ استعمال کرنا خواہ کسی عورت کا ہو اور خواہ کسی طریقہ سے ہو شرعاً ناجائز ہے اور علالت کے زمانہ میں بھی جب کہ علالت کا دفعیہ اس پر منحصر نہ ہو بطور علاج استعمال کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ صورت مسئول عنہا میں اگر زید نے اپنی زوجہ کا دودھ پیا ہے تو اس کا یہ فعل ناجائز تھا، اس کو توبہ کرنی چاہیے؛ لیکن اس کی وجہ سے زوجہ کے ساتھ شرعاً حرمت رضاعت قائم نہیں ہوتی، کیوں کہ مدت رضاعت ختم ہو جانے کے بعد اس نے دودھ پیا ہے تبیین الحقائق کی جلد دوم باب الرضاع صفحہ ۱۸۳ میں ہے:

ثم قيل لا يباح الارضاع بعد مدة الرضاع لان اباحته للضرورة لكونه جزء الآدمية و لا حاجة بعد مدة. اور حاشیہ پر ہے: (قوله لكونه جزء الآدمية) اى و لا يجوز ان يكون الآدمي او جزؤه مبتذلا مهانا اهـ. اتقانی و کتب ما نصه: و الانتفاع به حرام و اختلف المشائخ فى الانتفاع به للدواء قيل لم يجز و قيل يجوز اذ اعلم انه يزول به الرمد اهـ كاكى. اور رد المحتار کی باب الرضاع صفحہ ۴۰۴ میں ہے: اختلف فى التداوى بالمحرم و ظاهر المذهب المنع كما فى ارضاع البحر؛ لكن نقل المصنف ثمة و هنا عن الحاوى و قيل يرخص اذ اعلم فيه الشفاء و لم يعلم دواء آخر كما رخص الخمر للعطشان و عليه الفتوى اهـ ح. اور بدائع صنائع کی جلد چہارم کتاب الرضاع صفحہ ۵ میں ہے: فالرضاع المحرم ما يكون فى

حال الصغر فاما ما یکون فی حال الکبر فلا یحرم عند عامة العلماء و عامة الصحابة رضی الله عنهم. اوراسی صفحہ میں ہے:و روی ان رجلا من اهل البادیة و لدت امرأته ولدا فمات ولدها فور مرثدی المرأة فجعل الرجل یمصه و یمجه فدخلت جرعة منه حلقه فسأل عنه ابا موسی الاشعری رضی الله عنه قال قد حرمت علیک ثم جاء الی عبد اله بن مسعود رضی الله عنه فسأله فقال هل سألت احدا فقال نعم سألت ابا موسی الاشعری فقال حرمت علیک فجاء ابن مسعود ابا موسی الاشعری رضی الله عنهما فقال له: اما علمت انه انما یحرم من الرضاع ما انبت اللحم؛ فقال ابوموسیؓ لا تسألونی عن شیئ مادام هذا الحبر بین اظهرکم و عن عبدالله بن عمرؓ ان رجلا جاء الی عمر رضی الله عنه فقال: کانت لی ولیدة اطؤها فعمدت امرأتی الیها فارضعتها فدخلت علیها فقالت: دونک فقد والله ارضعتها فقال عمر رضی الله عنه واقعها فهی جاریتک فانما ارضاعة عند الصغر و بهذا تبین ان لیس المراد من الآیة الکریمة رضاع الکبیر لان النبی صلی الله علیه وسلم فسر الرضاع المحرم بکونه دافعا للجوع منبتا للحم منشراً للعظم فاتقا للامعاء و هذا وصف رضاع الصغیر لا الکبیر فصارت السنة مبنیة لما فی الکتاب اصله. وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

رضاعی بھائی بہن کا نکاح

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حواء کے دو

لڑکے ہیں اور ہندہ کی ایک لڑکی حواء نے چھوٹے لڑکے کی پیدائش کے وقت اپنا دودھ ہندہ کی لڑکی کو بھی پلایا تو کیا ہندہ کی لڑکی کا نکاح حواء کے بڑے لڑکے کے ساتھ ہو سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً ومصلیاً: صورت مسئول عنہا میں ہندہ کی لڑکی کا عقد حواء کے کسی لڑکے کے ساتھ جائز نہیں ہے، خواہ وہ ہندہ کی لڑکی کے ساتھ کا ہو یا اس سے پیشتر کا یا بعد کا، حواء کے تمام لڑکے ہندہ کی لڑکی کے رضاعی بھائی ہیں۔ درمختار کے باب الرضاع میں ہے:

ولاحل بین رضیعي امرأة لکونهما أخوین وان اختلف الزمن ولأب اور ردالمحتار میں ہے:

(قوله و ان اختلف الزمن) کأن ارضعت الولد الثانی بعد الاول بعشرین سنة مثلا و کان کل منهما فی مدة الرضاع. اور بدائع صنائع کی جلد چہارم کتاب الرضاع صفحہ ۲ میں ہے: و کذا بناتها یحرمن علیه سواء کن من صاحب اللبن او من غیر صاحب اللبن من تقدم منهن و من تاخر لانهن اخواته من الرضاعة و قد قال الله عز وجل و أخواتکم من الرضاعة اثبت تعالی الاخوة بین بنات المرضعة و بین المرضع و الحرمة بینهما مطلقا من غیر فصل بین اخت و اخت. وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

کتاب الطلاق

بیوی کی طرف نسبت کئے بغیر طلاق کہنے کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے

تین دفعہ طلاق، طلاق، طلاق، کہا اور طلاق کا کسی کو مخاطب نہیں کیا، ایسی حالت میں شرعاً طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ اگر طلاق واقع ہوئی تو کونسی طلاق واقع ہوئی؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: صحت طلاق کے لیے، طلاق کی اضافت زوجہ کی طرف یا اس سے مخاطب ہونا بھی شرط ہے، اگر بغیر اضافت یا خطاب کے طلاق کہی جائے تو شرعاً واقع نہ ہوگی۔ درمختار کی کتاب الطلاق باب الصریح میں ہے:

(صریحه ما لم یستعمل الا فیه) و لو بالفارسیة (کطلقتک و انت طالق و مطلقة) بالتشدید قید بخطابها لانه لو قال ان خرجت وقع الطلاق او لا تخرجی الا باذنی فانی حلفت بالطلاق فخرجت لم یقع لترکه الاضافة الیها. اور ردالمحتار میں ہے: (قوله لترکه الاضافة) ای المعنویة فانها الشرط و الخطاب من الاضافة المعنویة و کذا الاشارة نحو هذه طالق و کذا نحو امرأتی طالق و زینب طالق اهـ ح. اور بہجۃ المشتاق فی احکام الطلاق میں ہے: ولا بد فی الطلاق من الخطاب او الاضافة الیها.

صورتِ مسئول عنہا میں اگر زید نے اپنی زوجہ کی طرف طلاق کی اضافت یا مخاطب نہیں کی تو شرعاً طلاق واقع نہ ہوگی۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

دعویٰ طلاق سے طلاق کے وقوع کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ نے بربنائے زوجیت عدالت فوجداری میں زید پر نفقہ کا دعویٰ دائر کیا، تو مدعی علیہ (زید) نے جواب دہی کی کہ مدعیہ (ہندہ) اس کی زوجہ نہیں ہے، مگر شہادت سے ثابت ہوا کہ

مدعیہ اس کی زوجہ ہے، اس لیے نفقہ دلایا گیا، بعد ازاں زید نے عدالت دیوانی (دارالقضاء) میں بطلان نکاح کا دعویٰ کیا جس کا ہنوز تصفیہ نہیں ہوا تھا کہ زید نے عدالت فوجداری مذکورہ میں درخواست پیش کی کہ اس نے ہندہ کو طلاق دے دی ہے، ایسی حالت میں درخواست ہذا کی بنا پر مدعی علیہ کی جواب دہی کے لحاظ سے حسب احکام شرع شریف طلاق تسلیم کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: شوہر کو شرعاً اختیار ہے کہ وہ اپنی زوجہ کو طلاق دے، اور جب شوہر نے طلاق دے دی تو اس کو عدالت کے تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ طلاق واقع ہوگی، البتہ تاریخ طلاق سے عدت کا شمار ہوگا اور تا اختتام عدت اس کی مطلقہ کو طلاق دہندہ سے نفقہ دلایا جائے گا۔ درمختار کی کتاب الطلاق میں ہے:

و اهله زوج عاقل بالغ مستيقظ. اور ردالمحتار کی جلد دوم کتاب الطلاق صفحہ ۴۱۶ر میں ہے: قوله و من محاسنه التخلص کے تحت ہے: قال فی فتح القدیر و منها ای من محاسنة جعله بيد الرجال دون النساء لاختصاصهن بنقصان العقل و غلبة الهوى و نقصان الدين. اور مبسوط کی جلد پنجم صفحہ ۲۰۱ر میں ہے: قال و لكل مطلقة بثلاث او واحدة السكنى و النفقة مادامت فى العدة اما المطلقة الرجعية فلانها فى بيته منكوحة له كما كانت من قبل و اذا اشرف النكاح على الزوال عند انقضاء العدة و ذلك غير مسقط للنفقة كما لو الى منها او علق طلاقها بمضى شهر فاما المبتوتة فلها النفقة و السكنى مادامت فى العدة عندنا قال عمر

بن الخطاب رضی الله عنه: لا ندع كتاب ربنا و لا سنة نبينا صلى الله عليه وسلم بقول امرأة لا ندری اصدقت ام كذبت حفظت ام نسيت، سمعت رسول الله صلى الله عيله وسلم يقول: للمطلقة الثلاث النفقة و السكنى مادامت فی العدة ثم لا خلاف في استحقاقها السكنى فانه منصوص عليه بقوله تعالىٰ: وَ لاَ تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ الآية. و قال تعالىٰ: اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ فعلماؤنا قالوا: النفقة و السكنى كل واحد منهما حق مالى مستحق لها بالنكاح و هذه العدة حق من حقوق النكاح فكما يبقى باعتبار هذا الحق ما كان لها من استحقاق فكذلك النفقة و فی قراء ة ابن مسعود رضی الله تعالىٰ عنه اسكنوهن من حيث سكنتم و انفقوا عليهم من وجدكم و قرأته لابد ان تكون مسموعة من رسول الله صلى الله عليه وسلم فذلك دليل على ان النفقة مستحقة لها سبب العدة. وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

بیوی کی غیر موجودگی میں طلاق کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنے اقارب سے دو مرد اور ایک عورت کو گواہ رکھ کر بحالت ہوش وحواس وعدم سکر اپنی زوجۂ غائبہ کا اصلی نام لے کر کہا کہ تم لوگ گواہ رہو میں نے اپنی زوجہ مسماۃ فلانہ کو طلاق دی ہے اور انہی الفاظ کی تین مرتبہ تکرار کی۔

ہندہ نے زید کے الفاظ کو اپنے کانوں سے نہیں سنا اور گواہوں نے کسی وجہ

سے اس کی اطلاع ہندہ کو نہیں پہنچائی، اس واقعہ کو ہو کر تقریباً چھ ماہ گزر چکے ہیں، پس کیا حالت غیاب میں طلاق واقع ہو گی یا نہیں؟ نیز کیا بحالت موجودہ ہندہ کو زید رجوع کرسکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً ومصلیاً: اگر زوجہ اس چھ مہینے کے عرصہ تک غائب تھی یعنی شوہر کے ساتھ نہ تھی تو شوہر کا بیان معتبر ہو سکے گا اور تاریخ طلاق سے طلاق ثلاثہ واقع ہو گی اور عدت کا آغاز بھی اسی تاریخ سے ہوگا اور اگر اس عرصہ میں کبھی زوجین ایک ساتھ رہے ہوں تو شوہر کا بیان اور گواہوں کی شہادت ناقابل التفات ہو گی، یعنی تاریخ طلاق سے طلاق تسلیم نہیں کی جائے گی؛ بل کہ تاریخ اقرار سے طلاق ثلاثہ واقع ہو گی اور اقرار کی تاریخ سے ہی عدت کا بھی شمار ہوگا، بہر صورت طلاق واقع ہو چکی۔ بحر الرائق کی جلد چہارم باب العدۃ صفحہ ۱۵۷ ر میں ہے:

و ظاهر كلام محمد فى المبسوط كا لمختصر ان العدة تعتبر من وقت الطلاق فى اقراره بالطلاق من زمان مضى الا ان المتأخرين اختاروا وجوب العدة من وقت الاقرار حتى لا يحل له التزوج باختها و اربع سواها زجراً له حيث كتم طلاقها و لكن لا نفقة لها و لا كسوة ان صدقته فى الاسناد لان قوله مقبول على نفسها و فى الهداية و مشائخنا يفتون فى الطلاق ان اعتدائها من وقت الاقرار نفيا لتهمة المواضعة اهـ. و هو المختار كما فى الفتاوى الصغرى، و فى غاية البيان الراد بالمشائخ علماء بخارى و سمرقند لا جماعة التصوف الذين هم اهل البدعة اهـ و هو عجيب منه و الحاصل انها ان كذبته فى الاسناد او قالت: لا ادرى فمن و قت الاقرار و ان صدقته ففى حقها

من وقت الطلاق و فی حق الله من وقت الاقرار. اور صفحہ ۱۵۸/ میں ہے: و فی الخانیة الفتوی علی ان العدة من وقت الأقرار صدقته او کذبته و لا یظهر اثر تصدیقها الا في اسقاط النفقة و وفق السغدی فحمل کلام محمد علی ما اذا کانا متفرقین و کلام المشائخ علی ما اذا کانا مجتمعین لان الکذب فی کلامهما ظاهر و هذا هو التوفیق ان شاء الله تعالیٰ و فی فتح القدیر ان فتوی المتأخرین مخالفة للائمة الاربعة و جمهور الصحابة و التابعین رضی الله عنهم فینبغی ان یقید بمحل التهمة و لذا قیده السغدی بان یکونا مجتمعین. وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

نشہ کی حالت میں طلاق کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے نشہ کی حالت میں جس کو عالمِ مدہوشی کہہ سکتے ہیں اپنی زوجہ کو تین طلاق دے دیا، صبح کو لوگوں کے کہنے سے اس کو معلوم ہوا کہ اس نے عالم مدہوشی میں طلاق دے دی ہے اس پر وہ بے حد متاسف اور نادم ہے ایسی حالت میں طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً ومصلیاً: حالت نشہ میں اگر کوئی شخص طلاق دے دے تو اس کی طلاق بھی واقع ہو جائے گی بدائع صنائع کی جلد سوم کتاب الطلاق صفحہ ۹۹/ میں ہے:

و اما السکران اذا طلق امرأته فان کان سکره بسبب محظور بان شرب الخمر او النبیذ طوعاً حتی سکر و زال عقله فطلاقه واقع عند عامة العلماء و عامة الصحابة رضی

الله عنهم .... و لنا عموم قوله عز و جل: الطلاق مرتان إلى قوله سبحانه و تعالى فان طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره. من غير فصل بين السكران و غيره الا من خص بدليل ..... و لان عقله زال بسبب هو معصية فينزل قائماً عقوبة عليه و زجراً له عن ارتكاب المعصية و لهذا لو قذف انساناً او قتل يجب عليه الحد و القصاص و انهما لا يجبان على غير العاقل دل ان عقله جعل قائما و قد يعطى للزائل حقيقة حكم القائم تقديرا اذ ازال بسبب هو معصية للزجر و الردع كمن قتل مور ثم انه يحرم الميراث و يجعل المورث حيًا زجرا للقائل و عقوبة عليه.

پس صورت مسئول عنہا میں جب کہ زید نے اپنی زوجہ کو نہایت نشہ کی حالت میں بھی تین بار طلاق دی ہے تو طلاق ثلاثہ واقع ہوگی۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

الفاظِ کنائی سے طلاق کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عزیز النسا بیگم کا نکاح بحالت نابالغی ہوا، اس کے والد کی مرضی کے خلاف اس کے نانا نے محمد یوسف کے ساتھ کر دیا نکاح کے بعد یہ معلوم ہونے پر کہ شخص مذکور صحیح النسب نہیں ہے عزیز النسا بیگم اپنے نانا کے گھر آ گئی اور دس سال سے یہیں پر ہے اس عرصہ میں اس نے نفقہ نہیں دیا، اور نہ کسی قسم کی خبر گیری کی ادھر والد اور نانا کا انتقال ہو گیا۔ اور محمد یوسف نے دوسرا عقد کر لیا جس سے اس کو اولاد بھی ہے، ان حالات کی بنا پر عزیز النسا بیگم نے اپنے بھائی اور ماموں کو تصفیہ کے لیے محمد یوسف کے پاس بھیجا، تو اس نے نفقہ دینے

اور پاس بلانے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ: میری بیوی اگر میرے کہے میں ہوتی تو میرے گھر سے نہیں جاتی، وہ میرے کہے میں نہیں ہے وہ میرے کام کی نہیں ہے، میں نان ونفقہ کس لیے دوں اس کا اختیار ہے جو چاہے کرے آپ لوگ اسے جس کو دل چاہے حوالہ کر دیجئے کیوں کہ وہ میرے کام کی نہیں، لہٰذا اب یہ امر دریافت طلب ہے کہ عزیز النساء بیگم محمد یوسف کے نکاح سے خارج ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً: صورت مسئول عنہا میں محمد یوسف کا یہ قول کہ ''آپ لوگ اسے جس کو دل چاہے حوالہ کر دیجئے''، حالت مذاکرۂ طلاق میں صادر ہوا ہے جس سے قائل کی نیت طلاق دینے کی ہونا ظاہر ہے، لہٰذا شرعاً ایک طلاق بائن واقع ہوگی، اور اگر قائل کی نیت دو یا تین طلاق کی ہو تو اس کی نیت کے مطابق طلاق ہو جائے گی، عالمگیریہ کی جلد دوم باب الکنایات صفحہ ۸۵ر میں ہے:

و باتبغی الازواج یقع واحدة بائنة ان نولها و ثنتان و ثلاث ان نولها. وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوابِ.

طلاق معلق کا مسئلہ

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید اپنی بیوی ہندہ کو تکلیف دیا کرتا تھا یعنی کھانے پینے کی تکلیف اس کے علاوہ زدوکوب بھی کرتا تھا۔ جب ہندہ اس کی ان تکالیف کو برداشت نہ کر کے اپنے والدین کے پاس چلی آئی تو زید نے ایک اقرارنامہ بدیں مضمون تحریر کر دیا کہ:

''اقرار کرتا ہوں کہ میرے والد کفیل ہونے کی وجہ سے اب تک میں اپنی زوجہ کے خورد نوش کا انتظام کرنے میں دلچسپی نہیں لیا کرتا تھا، آئندہ سے جو کچھ تنخواہ ماہانہ مجھے ملے گی بلا کسی عذر کے والدہ صاحبہ کی خدمت میں اور اپنی زوجہ کو دیا کروں گا وہ اپنے او میرے خورد نوش کا انتظام کریں گی،

اور کبھی زود کوب نہیں کروں گا مہر ۳۵ف لغایۃ تیر ۳۶ف تک میرے ذمہ مبلغ اکہتر روپیہ سکہ عثمانیہ بیوی اور بچے کے نفقہ کی بابت حضرت خسر صاحب کے باقی ہیں جس کی ادائگی میں بذریعۂ منی آرڈر دو دو، تین تین روپیہ ادا کیا کروں گا، اگر اس کے خلاف کوئی بات میں کروں تو بیوی کو اختیار حاصل ہے کہ وہ مجھ سے تعلقات باقی رکھیں یا نہ رکھیں"۔

اس کے بعد پھر زید نے حسب سابق تکلیف دی اور اقرار نامہ کی خلاف ورزی کی ہے یعنی زود کوب کیا اور نفقہ ادا نہیں کیا اور نہ خسر صاحب کی رقم کی ادائیگی میں کچھ دیا، لہٰذا ہندہ اس اقرار نامہ کے تحت طلاق کی مالک ہو سکتی ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: صورت مسئول عنہا زید کی نیت تعلقات منقطع کرنے سے طلاق کی ہو اور زید نے جس وقت اپنے اقرار نامہ کی خلاف ورزی کی اسی مجلس میں اگر ہندہ نے تعلقات منقطع کر دیئے یعنی اپنی نفس کو طلاق دی تو ایک طلاق بائن واقع ہوگی ورنہ نہیں، عالمگیریہ کی جلد اول باب الطلاق بالشرط صفحہ: ۴۴۵ ر میں ہے:

الفاظ الشرط إن إذ و إذا ما و كل و كلما و متى ما ففى هذه الالفاظ اذا وجد الشرط انحلت اليمين فلا يتحقق الحنث بعده الا فى كلما لانها توجب عموم الافعال. اور ردالمختار میں ہے: (قال لها اختارى اور امرک بيط ينوى) تفويض (الطلاق او طلقى نفسک فلها ان تطلق فى مجلس علمها به) مشافهة او اخبارا (و ان طال ما لم تقم او تعمل ما يقطعه لا بعده) وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

نفقہ ادا کرنے کی شرط کی خلاف ورزی سے طلاق کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ ہندہ کے حق میں ایک اقرار نامہ بتاریخ ۲۸ بہمن ۱۳۳۶ف بایں مضمون لکھ دیا کہ:

"مبلغ بارہ روپیہ ماہانہ نفقہ زوجہ کو ادا کرتا رہوں گا نفقہ کی ادائی ہر ماہ فصلی کی دس تاریخ تک ہوگی، اگر کسی مہینہ کی تاریخ مقررہ بلا ادائی منقضی ہوجائے تو اسی تاریخ ہندہ مطلقہ بائنہ ہوجائے گی"۔

لیکن بموجب اقرار نامہ ۱۰ فروری ۱۳۳۶ف تک بھی نفقہ ادا نہیں ہوا، بربنائے اقرار نامہ مذکور ۷ خورداد ۱۳۳۶ف کو ہندہ نے زید کے مقابلہ میں دعویٰ نفاذ طلاق، وادائے زر مہر ونفقہ عدت، عدالت میں پیش کردیا۔

زید نے بتاریخ ۸ مہر ۱۳۳۶ف عدالت میں یہ درخواست پیش کی کہ:

"مابین زن وشو صلح ہوگئی ہے، زید بارہ روپیہ ماہانہ کے حساب سے ہندہ کو نفقہ دیا کرتا ہے وہ عدالت میں داخل ہو، ہندہ عدالت سے لے لی گئی، ہندہ زید کے مکان میں رہے گی، ہندہ سے اس کی تصدیق کرلی جائے"۔

عدالت سے بتاریخ مذکور یہ تجویز ہوئی کہ خالد کمشنر ہندہ کا بیان صراحت سے لے کر پیش کرے کہ نفقہ کب سے پہنچا؟ عدالت میں دعویٰ پیش کرنے سے پہلے پہنچا یا بعد؟ اور کاغذ لکھ دینے کے کتنے عرصہ کے بعد پہنچا؟ اسی تاریخ کو ہندہ نے کمشنر اور شناخت کنندگاں کے روبرو یہ بیان دیا کہ:

"نفقہ دعویٰ پیش کرنے سے پہلے پہنچا، زید نے کاغذ لکھ دیا تھا اس کے ایک مہینے کے بعد پہنچا میں صلح پر اس وقت رضامند ہوں کہ عدالت سے نفقہ کا انتظام ہو، زید تعمیل نہ کرے تو پھر دعویٰ پیش کروں

گی، زید داشتہ کو رکھتے ہیں تو صلح پر راضی نہیں ہوں"۔

بر بنائے بیان ہندہ ۹رمہر ۱۳۳۶ف کو بوجہ عدم حضوری ہندہ و زید دعویٰ خارج ہوگیا، اس کے بعد ہندہ نے بتاریخ ۲۸رمہر ۱۳۳۶ف ایک درخواست عدالت میں بایں مضمون پیش کی کہ بیان غلط باور کرا کر لیا گیا ہے۔

اب ہندہ نے بتاریخ ۷رمہر ۱۳۳۷ف بمقابلۂ زید جدید طور پر عدالت میں یہ دعویٰ پیش کیا ہے کہ دستاویز مورخہ ۱۰رفروری ۱۳۳۶ف کے لحاظ سے زید نے ہندہ کو نفقہ ادا نہیں کیا، سابقہ دعویٰ میں بدورانِ مقدمہ زید نے ہندہ سے بجبر صلح نامہ کی تصدیق کرالی جس کی بنا پر مقدمہ ختم ہوا تھا۔ صلح کے بعد سے اس وقت تک عدالت سے ہندہ کو نفقہ نہیں پہنچایا، اس لیے ہندہ بتاریخ ۱۰/آبان ۱۳۳۷ف بلحاظ دستاویز مورخہ ۱۰/ فروری ۱۳۳۶ف مطلقہ بائنہ ہو چکی ہے، ایسی حالت میں ہندہ بتاریخ ۱۱/فروری ۱۳۳۶ف مطلقہ بائنہ متصور ہوگی یا نہیں، اگر ہوئی تو ۸رمہر ۱۳۳۶ف کو ہندہ نے جو رضامندی پانچ ماہ ستائیس یوم کے بعد عدالت میں ظاہر کی تھی اس کا اس طلاق پر شرعاً کیا اثر ہے؟ اگر بتاریخ ۸رمہر ۱۳۳۶ف بر بنائے بیان ہندہ، طلاق کا اثر زائل ہوگیا تو بتاریخ ۱۰/آبان ۱۳۳۷ف ہندہ پر دوبارہ طلاق بائن واقع ہوئی یا کیا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً: صورت مسئول عنہا میں اقرار نامۂ ۲۸/بہمن ۱۳۳۶ف کے لحاظ سے تاریخ ۱۰: اسفندار ۱۳۳۶ف تک زید کے پاس سے ہندہ کو نفقہ پہنچ جانا لازم تھا جب نہیں پہنچایا گیا تو ہندہ پر اقرار نامۂ مذکورہ کی رو سے ایک طلاق بائن واقع ہوگئی۔ عالمگیریہ کی جلد اول باب الطلاق بالشرط فصل ثالث صفحہ ۴۵۰: میں ہے:

و اذا اضافه الی الشرط وقع عقیب الشرط اتفاقا. اور جب ایک دفعہ شرط وجود میں آگئی تو اس کے بعد اقرار نامہ کا اثر زائل ہوگیا، عالگیریہ کی جلد اول باب الطلاق بالشرط فصل اول صفحہ ۴۴۵ر میں ہے:

الفاظ الشرط ان و اذا و اذا ما و کل و کلما و متی و متی ما ففی ھذہ الا الفاظ اذا وجد الشرط ان انحلت الیمین و انتھمت لانھا لا تقضی العموم و التکرار فبوجود الفعل مرۃ تم الشرط و انحلت الیمین فلا یتحقق الحنث بعدہ الا فی کلما لانھا توجب عموم الافعال.

اس کے بعد ۸ / مہر ۱۳۳۶ف کو زید اور ہندہ کے مابین کمشنر عدالت اور شناخت کنندگاں کے روبرو صلح ہوئی (اگر چہ ہندہ کے بیان کے بموجب صلح نامہ کی تصدیق بجبر کرالی گئی ہو) وہ شرعاً نکاح جدید ہے، کیوں کہ لفظ ''صلح'' سے جب متعاقدین کی نیت حسب سابق نکاح میں رہنے کی ہو نیز اس کا قرینہ بھی موجود ہو اور یہ صلح گواہوں کی موجودگی میں ہو اور گواہان بھی اس کا مفہوم یہی سمجھتے ہوں تو شرعاً نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔ چناں چہ صورتِ مسئول عنہا میں بھی یہی ہوا کہ زید اور ہندہ کے ما بین کمشنر عدالت اور شناخت کنندگاں کی موجودگی میں صلح ہوئی عدالت میں اس کی تکمیل ہوئی صلح کرنے والوں کی نیت بھی یہی تھی، اور کمشنر عدالت اور شناخت کنندگاں نے بھی اس کا مفہوم یہی سمجھا کہ صلح کنندگاں میں آیندہ سے حسب سابق رشتہ زوجیت رہے گا، اور وہ زوجین کی طرح زندگی بسر کریں گے۔ عدالت نے اس کو تسلیم کر لیا، لہٰذا زید اور ہندہ کے مابین جدید طور پر نکاح ہو گیا، درمختار مطبوع بر حاشیہ ردالمحتار جلد دوم کتاب النکاح صفحہ ۲۶۹ / میں ہے:

و انما یصح بلفظ تزویج و نکاح و ما وضع لتملیک عین فی الحال کھبۃ و تملیک و صدقۃ وصلح بشرط نیۃ او قرینۃ و فھم الشھود المقصود.

زید اور ہندہ میں جب دوبارہ نکاح جدید ہو گیا تو دوبارہ مہر بھی جدید طور پر واجب ہو گا، اس نکاح جدید کے بعد اگر زید ہندہ کو نفقہ نہ دے تو ہندہ قاضی کے پاس

عدالت میں رجوع ہوسکتی ہے؛ مگر اقرار نامۂ مذکورہ کی رو سے دوبارہ طلاق واقع نہ ہوگی کیوں کہ اب اس کا اثر شرعاً زائل ہو چکا ہے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

ہمبستری کے ذریعہ رجعت کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عبدالکریم سے اس کے والد نے اصرار کیا کہ عبدالکریم اپنی زوجہ کو طلاق دیدے، اگرچہ عبدالکریم انکار کرتا رہا؛ لیکن بہت مجبور کرنے پر راضی ہوگیا اس پر اس کے والد نے کہا کہ لکھ دو مگر عبدالکریم نے نہیں لکھا، اس پر اس کے والد نے اپنے بھتیجے کے ہاتھ سے طلاق نامہ لکھوا کر وہاں کے تحصیل دار کے پاس پیش کیا، اس وقت عبدالکریم نے ''ہاں طلاق دیا'' کہہ کر طلاق نامہ پر دستخط کردیئے، مگر ایک طلاق یا دو طلاق یا تین طلاق کا کچھ ذکر نہیں کیا، اور نہ طلاق نامہ میں ایسی کوئی صراحت ہے، تصدیق کے بعد اس طلاق نامہ کو اس کے والد نے اپنے پاس رکھ لیا، اس کی عورت کو نہیں دیا، اس کے بعد عبدالکریم نے اپنی زوجہ سے کہا کہ میں تجھ کو طلاق نہیں دیتا، عورت مرد میں نہایت اتحاد ہے اور زوجیت کا تعلق قائم ہے، ایسی حالت میں یہ امر دریافت طلب ہے کہ آیا رجوع صحیح ہوا یا تجدید نکاح کی جائے یا حلالہ کی ضرورت ہے؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً ومصلیاً: صورت مسئول عنہا میں ''طلاق دیا'' کہہ کر مذکورہ طلاق نامہ پر دستخط کرنے سے ایک طلاق رجعی واقع ہوئی، اگرچہ عبدالکریم کی تحریر اس کی زوجہ کے پاس نہ پہنچی ہو، پھر تعلقات زوجیت (مقاربت یا اس کے لوازم) اندرون عدت قائم کرنے سے رجعت بھی ہوگئی، اب عبدالکریم کو اس کی عورت کے ساتھ شرعاً جدید نکاح کرنے یا حلالہ کی ضرورت نہیں ہے، زوجہ مذکورہ عبدالکریم پر حلال ہے، ہدایہ کی جلد دوم کتاب الطلاق صفحہ ۳۳۹ رمیں ہے:

فالصریح قوله: انت طالق وطلقت فهذا يقع به الطلاق

الرجعی و لا یقع الا واحدة و ان نوی اکثر من ذلک اور ہدایہ کے باب الرجعۃ صفحہ ۳۷۴ر میں ہے: اذا طلق الرجل امرأته تطليقة رجعية او تطليقتين فله ان يراجعها فی عدتها رضيت بذلک او لم ترض. اور صفحہ ۳۷۵ر میں ہے: والرجعة ان يقول: راجعتک او راجعت امرأتي او يطأها اويقبلها او يلمسها بشهرة او ينظر الی فرجها بشهوة. وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

قسم کھا کر تین مہینے بیوی سے نہ ملنے کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ ہندہ سے بتکرار لفظی قسم کھائی ہے کہ میں تجھ سے بات چیت نہیں کروں گا اور تیرے نام کو نہ آؤں گا۔ اور زوجیت کی راہ ورسم نہیں رکھوں گا۔ جس کو تین مہینے کا عرصہ ہوتا ہے، اس عرصہ میں کوئی تعلق نہیں رکھا، اب عزیزوں اور قرابت داروں کے سمجھانے سے زید اپنی زوجہ کے ساتھ تعلقات زوجیت رکھنا چاہتا ہے ایسی صورت میں الفاظ بالا کی ادائیگی سے آیا از روئے احکام شرع شریف طلاق واقع ہوگئی یا تعلقات زوجیت بدستور باقی رکھ سکتا ہے۔ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: صورت مسئول عنہا میں چوں کہ واقعہ قسم کو گزر کر صرف تین مہینے ہوئے ہیں، ابھی چار مہینے نہیں گزرے، لہٰذا زید اپنی زوجہ کے ساتھ تعلقات زوجیت قائم رکھ سکتا ہے، البتہ اس صورت میں اس کو قسم توڑنے کا کفارہ دینا ہوگا، کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کرے، یہ نہ ہوسکے تو دس مساکین کو کھانا کھلائے، یا ان کو کپڑے بنادے اور اگر یہ بھی نہ ہوسکے تو تین دن تک متواتر روزہ رکھے۔ درمختار باب الایلاء میں ہے:

(هو الحلف علی ترک قربانها) مدته (و حکمه وقوع طلقة

بائنة ان برّ) و لم یطأ (و) لزوم (الکفارة او الجزاء ان حنث) بالقربان (و) المدة (اقلها للحرة اربعة اشهر) اور عالمگیریہ کی جلد دوم کتاب الایمان صفحہ ۲۶۸ / میں ہے: وھی احد ثلاثة اشیاء ان قدر عتق رقبة یجزی فیها ما یجزی فی الظهار او کسوة عشرة مساکین او اطعامهم فان لم یقدر علی احد هذه الاشیاء الثلاثة صام ثلاثة ایام متتابعات و هذه کفارة المعسر و الاولیٰ کفارة الموسر.

اگر چار مہینے گزر جائیں اور زید اپنی قسم پر قائم رہے تو ایک طلاق بائن واقع ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب.

خلع کے عوض میں اختلاف زوجین کا مسئلہ

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زوجہ نے دس مہینے پیشتر زوج کو تحریراً مہر معاف کر دیا تھا جس میں اس کے دستخط اور بہ ثبات ہوش و حواس اور بلا جبر و اکراہ کے الفاظ بھی درج ہیں، تین ماہ سے زوجین میں تعلقات ناخوشگوار اور منقطع ہیں اور زوج نے نفقہ بھی نہیں دیا، اب زوجہ نے خلع کی درخواست کی ہے اور زوج بھی منظور کرنے کے لیے آمادہ ہے، مگر زوجہ نے تحریر خلع میں لکھا ہے کہ زوج کے تعلقات سے مجبور اور تنگ ہو کر مہر معاف کیا تھا اس مہر کے معاوضہ میں خلع منظور کیا جائے یا اس نفقہ کے معاوضہ میں جو تین ماہ سے نہیں دیا گیا ہے خلع منظور ہو"۔

شوہر کا بیان ہے کہ معافی مہر بلا اس کی تحریک یا کسی بدسلوکی کے ہوئی تھی نفقہ اس پر واجب نہیں تین ماہ قبل تک بھی جو رقم مختلف حیثیتوں سے ماہانہ اور یکمشت زوجہ کو اداء کی گئی تھی وہ بھی استحقاقاً نہیں؛ بل کہ استحساناً تھی اس لیے کہ زوجہ نے احکام زوج کی تعمیل نہیں کی، زوج کے بتلائے ہوئے مکان میں قیام نہیں کیا اور اس کی

بلا اجازت روزانہ ملازمت کے لیے جایا کرتی تھی وغیرہ وغیرہ۔

لہٰذا زوج بلا کسی معاوضہ کی شرط کے خلع منظور کرنا چاہتا ہے اور اس لیے اپنے دیئے ہوئے زیورات اور رقم وغیرہ کا بھی نہ کوئی مطالبہ کیا اور نہ کرنا چاہتا ہے پس دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا شرعی طور پر بلا کسی معاوضہ لینے کے اگر شوہر خلع کی درخواست منظور کرے تو یہ خلع جائز ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر زوجہ اس کو نہ مانے تو طلاق کی صورت میں زوج پر مہر یا نفقہ اس مدت کا دینا ہوگا جس میں اس نے کچھ رقم ادا نہیں کی ہے یا کیا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: حامداً ومصلیاً: زوجہ سے خلع کا معاوضہ لینا شرعاً صحت خلع کی شرط نہیں ہے، بغیر کسی قسم کا معاوضہ لینے کے بھی خلع جائز ہے، اس بارے میں اصل شرعی یہ ہے کہ ملکیت نکاح کے اثبات کے لیے معاوضہ ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ نکاح کے وقت اگر مہر کا ذکر متروک ہو یا مہر کی نفی کردی جائے تب بھی مہر واجب ہوتا ہے اور ملکیت نکاح کے ازالہ کے لیے معاوضہ ضروری نہیں ہے، چوں کہ خلع بھی ملکیت نکاح کے ازالہ کا سبب ہے، اس لیے شرعاً معاوضہ لازم نہیں ہے، چنانچہ صور تہائے مندرجہ ذیل سے اس کی مزید وضاحت ہوسکتی ہے:

(۱) شوہر نے ایسی چیز کے عوض خلع منظور کیا جس کی شرعاً کوئی قیمت نہیں مثلاً شراب وغیرہ تو بغیر کسی معاوضہ کے خلع ہوجائے گا؟

(۲) زوجہ نے بند مٹھی بتلا کر کہا کہ اس میں جو کچھ ہے اس کے معاوضہ میں خلع دیدو، اور شوہر نے اس کو منظور کرلیا اور فی الحقیقت اس کی مٹھی خالی تھی اس صورت میں بھی خلع کا کوئی معاوضہ ادا کرنا زوجہ پر واجب نہ ہوگا۔

(۳) نابالغہ سے خلع کیا گیا تو اس حالت میں بھی کوئی معاوضہ نہیں دلایا جائے گا۔

(۴) شوہر کی زیادتی کی وجہ سے زوجہ خلع کی خواست گار ہو تو شوہر کے لیے معاوضہ لینا جائز نہیں ہے؛ بل کہ مکروہ ہے۔

بخلاف اس کے اگر حالات مندرجہ کی موجودگی میں نکاح کیا جائے تو مہر مثل لازم آئے گا، درمختار کے باب الخلع میں ہے:

خلعها او طلقها بخمر او خنزير او ميتة او نحوها مما ليس بمال (وقع) طلاق (بائن فی الخلع، رجعی فی غیره) وقوعا (مجانا كخالعنی علی ما فی يدی و لا شیئ فی يدها) اور رد المحتار کی جلد دوم باب الخلع صفحہ ۵۶۱ میں ہے: و المجان كشداد عطية الشيئ بلا بدل قال فی الفتح ای بلا شیئ يجب للزوج لان ملك النكاح فی الخروج غير متقوم ولذا لا يلزم شيئ فی الطلاق اهـ. نیز تنقیح حامدیہ میں جامع الفقہ سے منقول ہے: طلقها بمهرها و هی صغيرة عاقلة فقبلت وقعت تطليقة و لا يبرأ. اس کے بعد علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: حاصله انه لا يلزمها المال فی كل من الخلع و الطلاق علی مال. اور ہدایہ میں ہے: و ان كان النشوز من قبله يكره له ان يأخذ عنها عوضا لقوله تعالیٰ و ان اردتم استبداله زوج مكان زوج الی ان قال فلا تأخذ و امنه شيئا. و لانه او حشها بالاستبدال فلا يزيد فی وحشتها باخذ المال.

۲۔ لفظ "خالعتک" کے ذریعہ زوجہ کی درخواست خلع منظور کر لینے سے زوجہ کے جو حقوق زوج کے ذمہ نکاح کی وجہ سے عائد ہوئے تھے وہ شرعاً ساقط ہو جاتے ہیں؛ مگر زمانہ عدت کا نفقہ و سکنی تصریح کے بغیر ساقط نہ ہوگا۔ رد المحتار میں ہے:

اما لو كان امهر فی ذمته فانه يسقط لما مر من ان خالعتك

مسقط للحقوق و ان لم يكن بعوض تأمل. اور در مختار میں ہے: و يسقط الخلع و المباراة كل حق لكل منهما على الآخر مما يتعلق بذلك النكاح الا نفقة العدة و سكناها فلا يسقطان الا اذا نص عليها فتسقط.

۳- پھر یہ حکم اس وقت ہے جب کہ بدل خلع کی نفی نہ کی جائے، اگر یہ صراحت کی گئی کہ بدل خلع کچھ نہ ہوگا؛ بل کہ بغیر کسی معاوضہ کے خلع منظور کیا گیا ہو تو ہر فریق کے حقوق دوسرے کے ذمہ واجب الاداء رہیں گے، اور خلع کی وجہ سے طلاق بائن واقع ہو جائے گی۔ ردالمحتار میں ہے:

و اما اذا كان منفيا كقوله: اخلعي نفسك مني بغير شيئ ففعلت و قبل الزوج صح بغير شيئ ؛لانه صريح في عدم المال و وقوع البائن فلا يبرأ كل منهما عن حق صاحبه.

۴- اگر شوہر اپنی زوجہ کو طلاق دیدے تو صورت مسئول عنہا میں چونکہ زر مہر پیشتر ہی معاف ہو چکا ہے اس لیے اس طلاق کی وجہ سے سابقہ معافی مہر پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، معاف شدہ مہر کی ادائی شوہر کے ذمہ نہ رہے گی۔

۵- رہا نفقہ، صورت مسئول عنہا میں اگر زوجین کے مابین کسی مقدار نفقہ پر باہم کوئی قرارداد نہیں ہوئی اور نہ قاضی نے نفقہ مقرر کیا؛ بل کہ زوجہ کا نشوز ثابت ہے تو ایسی حالت میں زوج پر زمانۂ ماسبق کا نفقہ واجب نہ ہوگا۔ در مختار میں ہے:

لا تصير النفقة دينا الا بالقضاء او الرضا. وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

معاوضہ خلع کا حکم

الاستفتاء: الى حضرة صاحب الفضيلة الاستاذ الجليل

مفتی الديار النظاميه بالصدارة العالية تحية و اجلالا، و بعد الشرف برفع الاستفتاء الآتی اليكم راجيا منكم أن تتكرموا بجواب شافٍ:

هل يجوز الخلع بلا معاوضة و اذا جاز فماذا يكون حكمه؟ جزاكم الله خيرا واثابكم احسن مثوبة.

الجواب: حامداً ومصلياً: نعم يجوز الخلع بمعاوضة و بدونها و لا تشترط المعاوضة فيه كما فی الدر المختار:

(خلعها او طلقها بخمر او خنزير اور ميتة او نحوها) مما ليس بمال (وقع) طلاق (بائن فی الخلع، رجعی فی غيره) وقوعا (مجانا كخالعنی علی ما فی يدی و لا شيئ فی يدها) و فی حاشية المسماة. برد المحتار للعلامة الشامی رحمه الله حيث قال: و المجان كشداد عطية الشيئ بلا بدل قال فی الفتح ای بلا شيئ يجب للزوج لان ملک النكاح فی الخروج غير متقوم و لذا لا يلزم شيئ فی الطلاق اهـ. و فی تنقيح الحامدية نقلا عن جوامع الفقه ما نصه: طلقها بمهرها و هی صغيرة عاقلة فقبلت وقعت تطليقة و لا يبرأ. قال العلامه الشامیؒ: حاصله انه لا يلزمها المال فی كل من الخلع و الطلاق علی مالٍ. و فی الهداية: و ان كان النشور من قبله يكره له أن يأخذ منها عوضاً لقوله تعالی: و ان اردتم استبدال زوج الی ان قال فلا تأخذوه منه شيئا، و لانه أوحشها بالاستبدال فلا يزيد فی وحشتها باخذ المال.

فعلم مما ذكرنا ان المعاوضة فی الخلع غير لازم، و

حکمه وقوع الطلاق البائن بقوله: خالعتک و سقوط الحقوق الثابتة من قبل لکل واحد منهما علی الآخر مما یتعلق بذلک النکاح الا نفقة العدة و سکناها فلا تسقطان الا اذا نصّ علیها فتسقط کذا فی الدر المختار.

وهذا اذا لم یکن البدل منفیا اما إذا کان منفیا کقوله: اخلعی نفسک منی بغیر شیئ ففعلت و قبل الزوج صح بغیر شیئ لانه صریح فی عدم وقوع البائن فلا یبرأ کل منها عن حق صاحبه وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

ایک غیر معروف بچے کیلئے ثبوت نسب اور استحقاق میراث کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اسماعیل صاحب کا انتقال ہوا اور ورثاء میں دو پوتیاں، ایک کتخدا اور ایک نا کتخدا، اور ایک نواسہ، اور تین نواسیاں، ایک نا کتخدا اور دو کتخدا موجود ہیں۔

ان کے علاوہ ایک شخص ثالث ایک ڈیڑھ سال کے بچے کو لا کر یہ بیان کرتا ہے کہ اس بچے کی ماں سے اسماعیل صاحب مرحوم نے بدون قاضی سرکاری اور بغیر ترتیب سیاہہ، خانگی طور پر دو اشخاص کے روبرو نکاح کیا تھا، یہ عورت اسماعیل صاحب کے مکان میں رہتی تھی اور اسی میں اس کا انتقال ہوا، یہ بچہ اسماعیل صاحب کا ہے۔

اسماعیل صاحب کا نواسہ اور دیگر اشخاص یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ عورت اسماعیل صاحب کے مکان میں کرایہ سے رہتی تھی، جب اس کا انتقال اسماعیل صاحب کی زندگی میں ہوا تو اس کی تجہیز و تکفین بصیغہ لاوارثی بذریعہ پولس عمل میں آئی اگر وہ اسماعیل صاحب کی منکوحہ ہوتی تو اسماعیل صاحب چوں کہ مستطیع تھے اور جمع داری کوتوالی کے وظیفہ یاب تھے۔ اور دو سو روپیہ کا مکان اور پچاس روپیہ کا متفرق سامان

چھوڑ کر فوت ہوئے ہیں ضرور اس عورت کی تجہیز و تکفین اپنے صرفہ سے کرتے''۔

ایسی صورت میں کیا وہ نکاح جائز اور وہ بچہ شرعاً اسماعیل صاحب مرحوم کا صحیح النسب فرزند قرار پاسکتا ہے یا نہیں؟ نیز دیگر ورثا کو کس قدر حصہ ملے گا؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: صورت مسؤل عنہا میں اگر بینۂ شرعیہ سے ثابت ہو جائے کہ اسماعیل صاحب مرحوم نے اس عورت سے نکاح شرعی کیا تھا اور یہ لڑکا اس عورت کے بطن سے نکاح کے بعد چھ مہینے یا اس سے زیادہ مدت گزرنے کے بعد پیدا ہوا ہے تو وہ اسماعیل صاحب کا صحیح النسب فرزند اور ان کا وارث ہوگا اور ان کے تمام متروکہ کا تنہا وارث قرار پائے گا۔ دوسرے ورثاء اس کی موجودگی میں محروم ہوں گے، بصورت ثانیہ مرحوم کا متروکہ ان کی دونوں پوتیوں میں نصف نصف تقسیم ہوگا، نواسہ اور نواسیاں ہر حال میں محروم ہوں گے۔ عالمگیریہ کی جلد اول باب ثبوت النسب صفحہ ۵۵۸ میں ہدایہ سے منقول ہے:

و اذا تزوج الرجل امرأة فجاء ت بالولد لاقل من ستة اشهر منذ تزوجها لم يثبت نسبه و ان جاء ت به لستة اشهر فصاعدا يثبت نسبه منه اعترف به الزوج او سكت فان جحد الولادة تثبت بشهادة امرأة واحدة تشهد بالولادة كذا فى الهداية. وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

اولاد کے درمیان میراث کی تقسیم کا مسئلہ

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں زید نے انتقال کیا اس کے پسماندگان میں دو زوجہ ہیں، زوجۂ اولیٰ مسماۃ زینب جس کے بطن سے مرحوم کا ایک فرزند مسمی خالد اور ایک دختر مسماۃ ہندہ ہے، اور زوجۂ ثانیہ مسماۃ سلمہا جس کے بطن سے ایک فرزند بکر اور ایک دختر مسماۃ رقیہ ہے بکر کی نسبت یہ بحث ہے کہ آیا یہ زید مورث کا فرزند و وارث ہوسکتا ہے یا نہیں؟ کیوں کہ اس کی والدہ مسماۃ سلمہا

کا نکاح زید کے ساتھ بکر کے تولد کے بعد ہوا ہے جب کہ سلمہا اپنے شوہر اول کے نکاح میں تھی اور شوہر اول زندہ تھا اور سلمہا شوہر اول ہی کے مکان میں رہتی تھی مگر زید اس وقت بھی بکر کو اپنا بیٹا کہتا رہا ہے، اور سرکار میں تحریراً بھی اس کا اقرار کیا ہے، اور بعض اوقات یہ بھی کہا ہے کہ بکر اس کا ولد صلبی ہے مگر قبل از نکاح کا، اور ایک تحریر میں اس نے اظہار بھی کیا ہے کہ اس کے متروکہ میں سے جو از قسم زیورات و مکانات ہے زوجۂ اولیٰ اور اس کی اولاد کا کوئی حق نہیں ہے بل کہ جو کچھ متروکہ ہے وہ زوجۂ ثانیہ اور اس کی اولاد مسمی بکر و رقیہ کا حق ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ احوال مذکورہ کی بنا پر کیا بکر زید کا وارث ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ اس کا متروکہ جو از قسم زیورات و مکانات ہے زوجۂ اولیٰ اور اس کی اولاد کو مل سکتا ہے یا نہیں؟ اگر مل سکتا ہے تو کس قدر ملے گا اور تقسیم متروکہ کی شرعی صورت کیا ہوگی؟

یہ بھی امر واقعہ ہے کہ زید کو اپنی زوجۂ اولیٰ سے سخت مخالفت رہی بوجہ نزاع نفقہ وغیرہ جو زید کی اخیر عمر تک برابر قائم رہی اور یہی مخالفت و مخاصمت زید کے اس قسم کی تحریرات و اظہارات کا باعث ہوئی۔ بینوا توجروا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً: جو عورت کسی کے نکاح میں ہو اور تاریخ نکاح سے چھ ماہ کے بعد اس کے بچہ پیدا ہوا ہو تو اس بچہ کا نسب اس عورت کے شوہر سے ثابت ہوگا شوہر اس بچہ کے نسب کا اقرار کرے یا نہ کرے ہر حال میں وہ اسی کا بچہ تسلیم کیا جائے گا، اگر شوہر بچہ کے نسب کا انکار کرے اور زوجین میں لعان کی نوبت نہ آئے تب بھی بچہ کا نسب ثابت ہو جائے گا، البتہ اگر شوہر کسی بچہ کے نسب کا انکار کرے اور زوجین مین لعان ہو جائے یعنی قاضی کے پاس جا کر زوجین قسمیں کھائیں شوہر کہے کہ یہ میرا بچہ نہیں ہے اور زوجہ کہے کہ یہ اسی کا بچہ ہے اور قاضی فیصلہ کر دے کہ یہ بچہ عورت کے شوہر کا نہیں ہے تو اس صورت میں بچہ کا نسب عورت کے شوہر سے ثابت نہ ہوگا۔

عالمگیریہ کی جلد اول باب ثبوت النسب صفحہ ۵۵۸ رمیں ہے:

قال اصحابنا: لثبوت النسب ثلاث مراتب: الاولی النکاح الصحیح و ما ھو فی معناہ من النکاح الفاسد و الحکم فیه انه یثبت النسب من غیر دعوۃ و لا ینتفی بمجرد النفی و انما ینتفی باللعان، فان کانا ممن لا لعان بینهما لا ینتفی نسب الولد کذا فی المحیط.

صورت مسئول عنہا میں جب کہ سلمہا بکر کے پیدا ہونے کے پہلے سے شوہر اول کے نکاح میں تھی زید کے نکاح میں نہ تھی اور شوہر اول ہی کا مکان میں سلمہا کے بطن سے بکر پیدا ہوا اور سلمہا کا شوہر اول اس وقت زندہ تھا زوجین میں رشتہ نکاح قائم تھا، شوہر اول نے بکر کے نسب کا انکار نہیں کیا تھا نہ زوجین میں لعان ہوا تھا تو بکر از روئے احکام شرع شریف سلمہا کے شوہر اول ہی کا فرزند تسلیم کیا جائے گا، اس کے برخلاف زید کا یہ کہنا کہ بکر اس کا فرزند ہے یا سرکار میں کوئی تحریر پیش کر دینا جس میں بکر کی فرزندیت کا اقرار ہو محض لغو اور نا قابل التفات ہے، لہٰذا زید کے متروکہ میں بکر کا کوئی نہیں ہے۔

نظر براں زید متوفی کے متروکہ سے اس کے اخراجات تجہیز و تکفین وضع کرنے اور واجب الادا دیون و زر مہر ادا کرنے اور ماتبقی مال کے ثلث سے وصیت کی تعمیل بموجب احکام شرع شریف کرنے کے بعد جو کچھ باقی رہے اس سے فی روپیہ ہر ایک زوجہ کو ایک ایک آنہ اور فرزند مسمی خالد کو سات آنے اور ہر ایک دختر (ہندہ ورقیہ) کو تین آنے چھ پائی دیئے جائیں ورثاء مذکورین کے حق میں زید نے جو وصیت کی ہے اگر ان کے حصص کے مطابق ہو یا تمام ورثاء رضامند ہوں تو وصیت قابل نفاذ ہے، ورنہ نہیں۔ البتہ بکر کے حق میں زید نے کوئی وصیت کی ہے تو اخراجات تجہیز و تکفین اور ادائے دیون و زر مہر کے بعد جو مال باقی رہے اس کے ثلث سے وصیت کی تعمیل کی جا

سکتی ہے کیوں کہ بکر کا زید سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اور زید کے حق میں بکر اجنبی ہے۔ واللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

یتیم کی پرورش اور اسکے مال میں ولایت اور تصرف کے حق دار کی تعیین کا مسئلہ

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک نابالغ لڑکا مسمی چاند پادشاہ موجود ہے جس کی عمر چھ سال کی ہے۔ قرابت داروں میں اس کے باپ کا چچا مسمی محمد اعظم اور اس کے باپ کے دوسرے چچا کا فرزند مسمی غلام نظام الدین موجود ہے، ان کے سوا کوئی قرابت دار ذکور وانات میں سے موجود نہیں ہے۔

ایسی حالت میں نابالغ مذکور کی پرورش کا استحقاق اور اس کے مال کی ولایت شرعاً کس کو حاصل ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: حامداً ومصلیاً: صورت مسئول عنہا میں چاند پادشاہ نابالغ کے قرابتداروں میں صرف باپ کا چچا اور باپ کا چچیرا بھائی موجود ہے تو نابالغ کی حضانت (حق پرورش) باپ کے چچا مسمیٰ محمد اعظم کو حاصل ہے، باپ کے چچا کی موجودگی میں باپ کے چچا کے فرزند کو حضانت حاصل نہ ہوگی۔ درمختار کے باب الحضانت صفحہ ۹۷۸ر میں ہے:

ثم العصبات بترتیب الارث. اور ردالمختار میں ہے: (قولہ ثم العصبات) ای ان لکم یکن للصغیر احد من محارمہ النساء "بحر" او کان الا انہ ساقط الحضانۃ لانہ کالمعدوم. رملی.

نابالغ کے مال کی ولایت اس شخص کو حاصل ہوگی جس کو قاضی ولی مال مقرر کرے، خواہ وہ محمد اعظم ہو یا غلام نظام الدین، یا کوئی اجنبی شخص ہو۔ درمختار کی کتاب النکاح باب الولی میں ہے:

(الولی فی النکاح) لا المال (العصبة بنفسه) اور ردالمحتار میں ہے: (قوله لا المال) فان الولی فیه الاب و وصیه والجدو وصیه و القاضی و نائبه فقط. وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

نابالغ کی ولایت وحضانت کا حق دار کون؟

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کا انتقال ہو چکا ہے، اس کا ایک فرزند (۹) سالہ اور دو دختر (۱۰-۱۳) سالہ موجود ہیں اور ایک زوجہ ہے جو فرزند اور دختروں کی حقیقی ماں ہے نیز ان نابالغوں کا چچیرا بھائی، پھوپی اور علاتی بہن بھی موجود ہے، ایسی حالت میں نابالغوں کی ولایت وحضانت کا حق ورثاء مذکورین میں سے کس کو حاصل ہے۔ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: صورت مسئول عنها میں نابالغوں کی ولایت نکاح ان کے چچیرے بھائی کو حاصل ہے۔ عالمگیریہ کی جلد اول باب الاولیاء صفحہ ۳۰۱ر میں ہے:

و اقرب الاولیاء الی المرأة الابن ثم ابن الابن و ان سفل ثم الاب ثم الجد ابو الاب و ان علا كذا فی المحیط .... ثم الاخ لاب و ام ثم الاخ لاب و ان سفلوا ثم العم لاب و ام ثم العم لاب ثم ابن العم لاب و ام ثم ابن العم لاب و ان سفلوا.

نابالغوں کے مال کی ولایت قاضی (مسلمان حاکم عدالت) کو حاصل ہے۔ کما مر آنفاً۔ اور نابالغ لڑکیوں کی حضانت کا استحقاق ماں کو حاصل ہے۔ عالمگیریہ کی جلد اول باب الحضانة صفحہ ۵۶۲ر میں ہے:

احق الناس بحضانة الصغیر حال قیام النکاح او بعد فرقة الام.

اور صفحہ ۵۶۴ر میں ہے: و الام و الجدة احق بالجاریة حتی تحیض

و فی نوادر هشام عن محمد رحمه الله تعالیٰ اذا بلغت حد الشهوة فالاب احق و هذا صحیح هکذا فی التبیین.

اور لڑکا چونکہ (۹) سال کا ہوگیا ہے اس لیے وہ اپنے چچیرے بھائی کے پاس رکھا جائے گا تاکہ اس کی تعلیم و تربیت ہو سکے۔ تا آں کہ وہ بالغ ہو جائے اور اپنے کاروبار سنبھال لے؛ لیکن لڑکیاں بلوغ کے بعد بھی اپنی ماں کے پاس ہی رہیں گی تا آں کہ ان کی شادیاں ہو جائیں، یا تنہا رہنے کے قابل ہوں۔ عالمگیریہ کے صفحہ ۵۶۳ رمیں ہے:

و الام و الجدة احق بالغلام حتی یستغنی و قدر بسبع سنین وقال القدوری حتی یأکل وحده و یشرب وحده و یستنجی وحده و قدره ابوبکر رازی بتسع سنین والفتوی علی الاول.

اور صفحہ ۵۶۴ رمیں ہے: و یمسکه هؤلاء ان کان غلاما الی ان یدرک فبعد ذلک ینظر ان کان قد اجتمع رأیه و هو مأمون علی نفسه یخلی سبیله فیذهب حیث یشاء و ان لم یکن لها اب و لا جد و لا غیر هما من العصبات او کان لها عصبة مفسد فللقاضی ان ینظر فی حالها فان کانت مأمونة خلاها تنفرد بالسکنی سواء کانت بکراً او ثیبا و الا وضعها عند امرأة امینة ثقة تقدر علی الحفظ لانه جعل ناظر اللمسلمین کذا فی العینی شرح الکنز. اور درمختار کے باب الحضانة میں ہے: (والام و الجدة) لام او لاب (احق بها) بالصغیرة (حتی تحیض) ای تبلغ فی ظاهر الروایة، اور ردالمحتار میں ہے: و فی الخلاصة و غیرها و اذا استغنی الغلام و بلغت الجاریة فالعصبة اولی یقدم الاقرب فالاقرب و لا حق لابن العم فی حضانة الجاریة اهـ. وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

نابالغ کی پرورش کا مسئلہ

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ احمد حسین عرف چاند پادشاہ نابالغ معمر (۶) سال ہے جس کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے، قرابت داروں میں نابالغ کے دادا کے بھائی اور تین بھتیجے غلام نظام الدین، محمد ابراہیم اور محمد اسماعیل موجود ہیں۔ ایسی صورت میں نابالغ کی حضانت اور ولایت مال شرعاً کس کو حاصل ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً: نابالغ کی حضانت کا حق اس کی والدہ اور والد کے خاندان کی عورتوں کو حاصل رہتا ہے جو اس کے محارم ہوں، اگر یہ نہ ہو تو اس کے عصبات کو حاصل ہوگا عصبات میں بھی جس کا رشتہ قرب تر اور قوی تر ہو اس کو ترجیح دی جائے گی، بشرطیکہ وہ حضانت کی اہلیت رکھتا ہو۔

صورت مسئول عنہا میں چوں کہ احمد حسین نابالغ کے والدین کے خاندان کی کوئی محرمہ عورت موجود نہیں ہے بل کہ صرف عصبات ہیں یعنی نابالغ کے پردادا کا ایک بیٹا اور تین پوتے ہیں، لہذا پردادا کے پوتوں کے مقابلہ میں پردادا کے بیٹے کو یعنی نابالغ کے دادا کے بھائی کو حق حضانت حاصل ہوگا کیوں کہ موجودہ عصبات میں وہی سب سے قریب تر ہے۔ درمختار کے باب الحضانۃ صفحہ ۹۷۸ میں ہے:

ثم العصبات بترتيب الارث. اور ردالمحتار میں ہے: (قوله ثم العصبات) اى ان لم يكن للصغير احد من محارمه النساء. بحر. او كان الا انه ساقط الحضانة لانه كالمعدوم. رملى.

۲- نابالغ کے مال کی ولایت قاضی (مسلمان حاکم عدالت) کو حاصل ہے، قاضی کو اختیار ہے کہ خواہ وہ خود ہی نابالغ کے مال کی نگرانی اور اس میں تصرف کرے یا اپنی طرف سے نیابۃً کسی کو اس کام پر مقرر کرے، قاضی کا

نائب مذکورہ قرابتداروں میں سے ہو یا کوئی اجنبی شخص ہو، دونوں صورتیں جائز ہیں۔ درمختار کے باب الولی صفحہ ۳۱۲؍ میں ہے:

(قوله لا المال) فان الولي فيه الاب و وصيه و الجد و وصيه و القاضي و نائب فقط. وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

طلاق کے بعد نکاح کے دوران دیئے گئے ہدایا وتحائف کے لوٹانے کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ محمد ابراہیم ولد ولی محمد ساکن رائے پلی تعلقہ بھونگیر نے اپنی زوجہ مسماۃ رقیہ بی بنت محمد صفدر علی مرحوم کو بلا ادائی مہر طلاق دے کر اپنا دوسرا عقد کرلیا ہے، زوجہ مطلقہ کے بطن سے ایک فرزند اور ایک دختر شیر خوار تھی، دختر کا انتقال ہو گیا، اب صرف ایک فرزند صغیر سن ہے جو اپنے باپ کے پاس ہے۔

ایسی صورت میں مطلقہ مذکورہ فرزند کی موجودگی میں محمد ابراہیم مذکور سے اپنے زر مہر نیز ان زیورات نقروی وطلائی و پارچہ وغیرہ کو جو محمد ابراہیم کو بھی زوجہ کی طرف سے بوقت عقد جوڑا وغیرہ دیا گیا تھا۔ شرعاً طلب کرسکتی ہے یا نہیں؟ دراں حالیکہ محمد ابراہیم کو بھی زوجہ کی طرف سے بوقت عقد جوڑا وغیرہ دیا گیا تھا۔ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: زر مہر جو ادا نہیں کیا گیا ہو وہ شوہر کے ذمہ دین ہے، محمد ابراہیم نے جب اپنی زوجہ رقیہ بی کو طلاق دیدی ہے تو رقیہ بی اپنا مہر محمد ابراہیم سے طلب کرسکتی ہے، رقیہ بی کے بطن سے لڑکے کا موجود رہنا اس کا مانع نہیں ہے جامع الرموز میں ہے:

المهر دين كسائر الديون.

اسی طرح رقیہ بی مذکورہ زیورات و پارچہ وغیرہ جو اس کو محمد ابراہیم نے

بوقت عقد دیا تھا اس کو بھی بلحاظ عرف طلب کرسکتی ہے، اگر محمد ابراہیم اس کے دینے سے انکار کرے اور یہ دعویٰ کرے کہ اس نے مستعار طور پر دیا تھا بطور تملیک نہیں دیا تو رقیہ بی کو بھی حق حاصل ہے کہ محمد ابراہیم کو بوقت عقد اس نے جوڑا وغیرہ جو کچھ دیا تھا اس کی واپسی کا مطالبہ کرے۔ فتح القدیر کی جلد سوم صفحہ ۲۵۶/ باب المہر میں ہے:

و فی فتاوی اهل سمرقند بعث الیها هدایا و عوضته المرأة ثم زفت الیه ثم فارقها و قال بعثتها الیک عاریة و اراد ان یسترده و ارادت هی ان تسترد العوض فالقول قوله فی الحکم لانه انکر التملیک و اذا استرده تسترد هی ما عوضته. وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِالصَّوَابِ.

کتاب الکسب

حجامت کی اجرت کا شرعی حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص مسلمان اہل السنّت والجماعت ہے جس کا پیشہ حجامت (اصلاح سازی) ہے، اس پیشہ سے اس کو جو آمدنی حاصل ہوتی ہے کیا وہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: اصلاح سازی جس حد تک جائز ہے اس کی اجرت لینا بھی شرعاً جائز ہے اور جو مکروہ ہے اس کیا اجرت لینی بھی مکروہ ہے۔ عنایہ شرح ہدایہ جلد۸/ صفحہ ۹/ کتاب الاجارہ میں ہے:

و اما الحجام فلما روی ان النبی علیه الصلاة و السلام احتجم و اعطی الحجام الاجرة.

و لانه استجار علی عمل معلوم باجر معلوم بلا مانع فیقع

جائزا. اور تبیین الحقائق کی جلد پنجم کتاب الاجارہ صفحہ ۱۲۴/ میں ہے:
لانه عمل معلوم ابيح استيفاؤه فجاز اخذ الاجرة عليه كسائر الاعمال. اور ہدایہ میں ہے:(و لا يجوز الاستئجار على المعصية و المعصية لا تستحق العقد. اور کفایہ میں ہے: (قوله و المعصية لا تستحق العقد) لان عقد الاجارة يستحق به تسليم المعقود عليه شرعا و لا يجوز ان يستحق على المرء شيئ يكون به عاصيا شرعا كيلا تصيرا لمعصية مضافة الى الشرع.

اگر چہ روایات بالا میں ''حجام'' سے مراد ''اصلاح ساز'' نہیں ہے؛ بل کہ پچھنے لگانے والا (سر سے خون نکالنے والا) مراد ہے؛ لیکن عمل معلوم اور اجر معلوم کی جو علت ان روایات میں بیان فرمائی گئی ہے وہ مشترک ہے، اور نفس اصلاح سازی شرعاً جائز ہے۔ باری تعالی کا ارشاد ہے:

محلقين رؤسكم و مقصرين لا تخافون. دوسری جگہ ارشاد ہے: وليقضوا تفثهم. اور درمختار کی جلد پنجم کتاب الحظر والاباحۃ صفحہ ۲۶۰/ میں ہے: ويستحب قلم اظافيره يوم الجمعة. اور ردالمحتار کے صفحہ ۲۶۱/ میں ہے: (قوله و اما حلق رأسه الخ) و فى الروضة للزند و يستى ان السنة فى شعر الرأس اما الفرق او الحلق. اور درمختار میں ہے: و فيه حلق الشارب بدعة و قيل سنة و لا بأس بنتف الشيب و اخذ اللحية و السنة فيها لاقبضة. نیز درمختار میں ہے: (قوله وتنظيف بدنه) بنحو ازالة الشعر من ابطيه و يجوز فيه الحلق و النتف اولى المجتبىٰ عن بعضهم و كلاهما حسن. وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

کتاب الحجر

نابالغ کے مال کی ولایت کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بکر نے زید سے کچھ قرضہ حسنہ بدفعات لیا تھا، مدت، ادائیگی معین نہ تھی ادائے قرض کی نوبت نہ آنے پائی کہ زید کا انتقال ہو گیا، زید کے ورثاء میں زوجہ اور بچے ہیں، زید کا ایک لڑکا بڑا ہے جو عاقل و بالغ ہے اور زید کا باپ بھی موجود ہے، ایسی صورت میں قرضہ کی رقم زید کے باپ کو دی جائے یا بیٹے کو؟ بینوا توجروا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً: زید کے بچے جو نابالغ ہیں ان کی ولایت، زید کے باپ کو حاصل ہے چوں کہ زیادہ حصہ ہیں رقم میں نابالغوں کا ہے، لہذا یہ رقم زید کے باپ کو دی جائے اور بڑے لڑکے اور زوجہ کو بھی اس کی اطلاع کر دی جائے تاکہ وہ اپنا حصہ لے سکیں زید کا باپ بھی خود اس رقم کا حصہ دار ہے اس لیے یہ رقم اسی کے تفویض کی جائے۔ ردالمحتار کی کتاب النکاح باب الولی صفحہ ۳۱۲ رمیں ہے:

(قوله لا المال) فان الولی فیه الاب و وصیه و الجد و وصیه و القاضی و نائبه اهـ. وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

کتاب الهبه

حالتِ صحت میں اپنی ساری جائداد کسی کو ہبہ کر دینا

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کی ایک بھانجی اور چچیرے بھائی کا ایک بیٹا اور ایک پروردہ ہے ان کے سوا زید کا

کوئی اور قرابت دار یا وارث نہیں ہے زید یہ چاہتا ہے کہ اپنی زندگی ہی میں اپنے پروردہ یا پچیرے بھائی کے بیٹے کو اپنی تمام جائداد کا مالک بنائے، اور بھانجی کو کچھ نہ دے کیا زید کا ایسا تصرف اپنی جائداد مملوکہ میں شرعاً درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً: ہر انسان جو عاقل و بالغ ہے اپنی زندگی میں بحالت صحت نفس و ثبات ہوش وحواس اپنی ملک و جائداد جس کو چاہے ہبہ کر سکتا ہے خواہ موہوب لہ اس کا وارث یا قرابتدار ہو یا کوئی اجنبی شخص ہو، لیکن اگر ہبہ کرنے والے کی نیت یہ ہو کہ اپنے ورثاء کو بغیر کسی سبب شرعی کے محروم کرے تو وہ عنداللہ گناہ گار ہوگا، عندالناس اس کا ایسا تصرف نافذ ہو جائے گا۔ درمختار کے کتاب الہبہ صفحہ ۳۱۹ر میں ہے:

> لووهب فی صحته کل المال للولد جاز و اثم. اور قرة عیون الاخیار کی جلد دوم کتاب الہبہ صفحہ ۳۱۹ر میں ہے: (قوله کل المال للولد) ای و قصد حرمان بقية الورثة كما يتفق ذلک فیمن ترک بنتا و خاف مشارکة الغاصب (قوله جاز) ای صح لا تنقض.

صورت مسئول عنہا میں زید کا وارث صرف اس کے پچیرے بھائی کا بیٹا ہے اگر اسی کے نام اپنی تمام جائداد ہبہ کر دے تو عنداللہ وعندالناس ہر حال میں جائز ہے؛ البتہ اگر اس کی موجودگی میں پروردہ کے نام تمام جائداد ہبہ کرنا چاہتا ہے اور اس سے زید کی نیت پچیرے بھائی کے فرزند کو وراثت سے محروم کرنے کی ہے تو وہ عنداللہ جواب دہ ہوگا؛ مگر اس کا ایسا ہبہ نافذ ہو جائے گا۔ بھانجی شرعاً محروم الارث ہے اگر اس کو زید کچھ نہ دے تو زید پر کسی قسم کی ذمہ داری شرعاً عائد نہ ہوگی۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

میراث کی تقسیم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نواب بشیر نواز جنگ مرحوم کے چار فرزند ہیں، محمد عبداللہ خاں معمر ۳۲ر سال، غلام غوث خاں معمر ۷ر سال، غلام محی الدین خاں معمر ۳ر سال اور محمد عبدالرحمٰن خاں معمر ۱۷ر سال ملک املاک کی تفصیل ہے:

۱- بنگلہ واقع سانچہ توپ قیمتی چالیس ہزار روپیہ
۲- بنگلہ روبروئے صدر پٹہ خانہ انگریزی قیمتی اسی ہزار روپیہ
۳- بنگلہ عقب بنگلہ قیمتی بیالیس ہزار روپیہ
۴- مکان قدیم واقع چادر گھاٹ سلیمان جاہ محبوب کی مہندی قیمتی تیس ہزار روپیہ
۵- مکان قدیم واقع اورنگ آباد جے سنگ پور قیمتی تیس ہزار روپیہ
۶- متفرق سامان واسباب خانہ داری

واقعات یہ ہیں کہ مرحوم نے اپنے فرزندوں کے مواجہہ میں ان مکانات کے قبالوں کی پشت پر یہ تحریر کر دیا ہے کہ بنگلہ (۱) اپنے فرزند عبداللہ خاں کو دیا، بنگلہ (۲) فرزندان غلام غوث خاں اور عبدالرحمٰن خاں کو دیا، بنگلہ (۳) فرزند غلام محی الدین خاں کو دیا۔

مکان (۴) کی نسبت یہ فرمایا ہے کہ یہ قدیم مکان ہے میرے بعد ایک ہی جائے جس طرح پر کہ اب ہو اتفاق سے رہو، مکان (۵) وہ اپنے قرضہ میں کہ وہ اس سے اپنا قرض ادا کر لیں گے کہہ کر خاموش ہو گئے۔

بنگلہ (۲) کی نسبت یہ لکھا کہ ضرورتاً سرکار میں خرید لیا جاتا ہے اس کی رقم لے کر غلام غوث خاں کی شادی کر دو اور ان کے لیے ایک مکان واقع رسالہ جوش خیریت آباد میں خرید و اور دیگر مکانات کی تعمیر و توسیع میں صرف کرو۔

تحریر ہذا کے کئی سال کے بعد ان کا انتقال ہو گیا، باوصف اس تحریر کے وہ حین حیات تک جملہ جائداد پر قابض و متصرف رہے، نابالغ فرزند عبدالرحمٰن خاں کے لیے جائداد خریدنے کی سعی بھی کی مگر جب مرضی جائداد نہ ملتے اور بعض خانگی واقعات و حالات کے تحت مکان (۲) کی رقم انہیں کے ہاتھ پر خرچ ہو گئی، اور کوئی سبیل فرزند خرد کے لیے جائداد خریدنے کی پیدا نہیں ہوئی، اسی اثناء میں نواب صاحب موصوف کا انتقال ہو گیا۔

ان کے انتقال پر غلام محی الدین خاں فرزند سوم مکان (۵) پر قابض و متصرف ہو گئے ہیں، اس بیان سے کہ میں نے مرحوم کا قرض ادا کیا ہے اور انھوں نے فی الواقع ان کا قرضہ ادا کیا ہے، مگر مکان (۵) کی مالیت قرضہ ادا شدہ سے بہت بڑھ کر ہے نیز فرزند سوم غلام محی الدین خاں مکان (۴) پر بھی اپنا قبضہ اس بیان سے ظاہر کرنے میں کہ والد نے ایک علٰیحدہ کاغذ پر یہ مکان ان کے نام پر لکھ دیا ہے، محمد عبدالرحمٰن خاں فرزند خرد جن کو اپنے والد کی جائداد سے کچھ نہیں ملا ہے اپنے حق کے طالب ہیں، مگر دوسرے بھائیوں نے ان کو صاف جواب دیدیا ہے کہ تم کو کچھ نہیں دیا جاسکتا، ان تمام مکانات کے منجملہ صرف بنگلہ (۲) نواب صاحب مرحوم کے حین حیات ہی فروخت ہو چکا ہے اور باقی تمام جائداد مصرحہ صدر از قسم متروکہ موجود ہے، ایسی حالت میں جائداد مذکور کی تقسیم شرعاً کس طرح ہوگی، اور محمد عبدالرحمٰن خاں فرزند خرد کو کس جائداد سے کس قدر حصہ پانے کا بروئے احکام خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق حاصل ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً: صورتِ مسئول عنہا میں نواب بشیر نواز جنگ مرحوم نے مکانات مذکورہ کا چوں کہ اپنے فرزندوں کو قبضہ نہیں دیا، اس لیے ان مکانات کا ہبہ صحیح نہیں ہوا، عالمگیریہ کی جلد چہارم صفحہ ۳۸۲ میں ہے:

لا یثبت الملک للموهوب له الا بالقبض و هو المختار هکذا فی الفصول العمادیة.

البتہ مرحوم نے ان مکانات کو جن جن فرزندوں کے لیے نامزد کر دیا ہے، اس کی صورت وصیت کی ہوگی، اگر چاروں فرزند اس کے بموجب عمل کرنے پر رضامند ہیں تو اس کے مطابق عمل کیا جاسکتا ہے بصورت اراضی یہ مکانات داخل متروکہ ہوں گے اور مساوی طور پر چاروں فرزندوں میں تقسیم کر دیئے جائیں گے۔

غلام محی الدین خاں فرزند سوم نے مرحوم کا جس قدر قرضہ اپنی ذات سے ادا کیا ہے اسی قدر قسم وہ متروکہ پدری سے تقسیم متروکہ سے پیشتر وصول کر سکتے ہیں۔ کما فی السراجیه. وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوابِ.

کتاب الوقف

مالِ موقوفہ کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک بی بی کا انتقال ہوگیا جن کی کوئی اولاد نہیں ہے، ان کے حیات ہی میں شوہر کا بھی انتقال ہو چکا تھا، ان کا کوئی وارث بھائی، بھتیجا، بہن بھانجا نہیں ہے، البتہ شوہر مرحوم کے بھائی بھتیجے وغیرہ موجود ہیں، مرحومہ نے کچھ جائداد چھوڑی ہے جو خاص مرحومہ کی کمائی ہوی ہے، مرحومہ نے اس کو اپنی حیات میں وقف کر دیا ہے، ایسی حالت میں تمام جائداد جو وقف کی ہوی ہے، شرعاً موقوفہ متصور ہوگی، یا شوہر کے بھائی بھتیجوں کو اس میں سے حصہ ملے گا، اگر حصہ ملے گا تو ہر ایک کو کس قدر ملے گا، نیز وقف سے شرعاً کیا فائدہ پہنچتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً: زوجہ کے مال میں شوہر کے بھائی بھتیجوں کا شرعاً کوئی حصہ نہیں ہے، صورت مسئول عنہا میں مرحومہ نے جب اپنی جائداد وقف

کردی ہے تو وہ تمام جائداد شرعاً موقوفہ متصور ہوگی، اور واقفہ کے منشاء کے مطابق موقوف علیہم پر صرف کی جائے گی۔ اور اس کا اجر تا قیامت واقفہ مرحومہ کو ان کی نیت کے بموجب ملتا رہے گا۔ ردالمحتار کی کتاب الجہاد جلد ۳ صفحہ ۳۱۸ میں ہے:

اذا مات ابن آدم جاء یجری علیه الأجر عدت ثلاث عشر
علوم بثها و دعاء نجل وغرس النخل والصدقات تجري
وراثة مصحف و لا باط غر و حفر البئر او اجراء نهر
و بیت للغریب بناه یأوی الیه أو بناء محل ذکر
و تعلیم لقرآن کریم شهید للقتال لاجل بر
کذا من سن صالحة لیقفی فخذها من احادیث بشعر

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

وقف کی تولیت کا مسئلہ

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ علاقۂ فوج میں ایک مسجد واقع ہے، یہ فوج غیر مسلم حکومت کی ہے اور جس زمین پر یہ مسجد بنائی گئی ہے بادشاہ اسلام کی ہے اور اس مسجد کو مسلمان اور ملازمین میں فوج نے چندہ کر کے بنایا، تاریخ بنائے مسجد ۱۳۱۵ھ سے مسجد کا انتظام مثل تولیت و امامت و خطابت زید (قلندر خاں صاحب) کے ذمہ رہا، اور اس کی شکست و ریخت وغیرہ کی نگرانی بھی زید نے اپنی زندگی تک افسران فوج اور مصلیان مسجد ان سے رضامند تھے۔

۱۳۴۶ھ میں زید کا انتقال ہو جانے سے اعلیٰ افسر فوج کے تحریری حکم کی بناء پر زید مرحوم کا فرزند مسمی محمد عثمان خاں صالح جانشین ہوا ہے، جس نے اپنے والد محروم کی یادگار میں بصرفہ تخمیناً (۵۲۵) روپیہ مسجد میں برقی روشنی لگائی ہے، علاوہ اس کے امام و موذن کو مقرر کیا ہے، مگر مسجد کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے، فوج یہاں سے چلی

جانے کے بعد مسجد کو چندے کی احتیاج رہے گی۔

ایسی صورت میں از روئے احکام شرع شریف محمد عثمان خاں اور اس کی اولاد اپنے باپ کی خدمات مثل تولیت و امامت و خطابت کی مستحق ہو گی یا نہیں؟ جانشین مذکوران خدمات کی ہر طرح اہلیت و صلاحیت رکھتا ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً: جائداد موقوفہ کی تولیت یعنی اس کا متولی مقرر کرنے کا اختیار اولاً واقف کو حاصل ہے اس کے بعد اس کے وصی کو اگر یہ دونوں نہ ہوں تو قاضی (مسلمان حاکم اوقاف) کو حاصل ہوگا۔ درمختار کی کتاب الوقف میں ہے:

و لا یة نصب القیم الی الواقف ثم لوصیه ثم للقاضی.

صورت مسئول عنہا میں جب کہ زید (قلندر خاں مرحوم) بانی مسجد نہ تھے بل کہ مسجد مسلمانوں اور ملازمین فوج کی بنا کردہ ہے، تو اس کا متولی مقرر کرنے کا اختیار بھی انہیں کو حاصل ہے، اسی بنا پر افسران فوج اور مصلیان مسجد نے زید (قلندر خاں مرحوم) کو اور ان کے بعد ان کے فرزند محمد عثمان خاں کو بر بنائے اہلیت و صلاحیت مسجد کا متولی مقرر کیا ہے اسی طرح آئندہ بھی مسلمانان فوج اور مصلیان مسجد ہی کو تقرر متولی کا اختیار رہے گا محمد عثمان خاں اور اس کی اولاد کو محض اس بنا پر کہ وہ زید (قلندر خاں مرحوم) کی اولاد ہیں، حق تولیت نہیں پہنچ سکتا، بل کہ مسلمانوں اور ملازمین فوج کے مقرر کرنے کی بنا پر وہ ادائے خدمات تولیت و امامت و خطابت کے مجاز متصور ہوں گے، اگر آئندہ یہاں سے فوج چلی جائے تو مصلیان مسجد کو تقرر متولی کا اختیار رہے گا۔ خواہ وہ محمد عثمان خاں اور اس کی اولاد کا تقرر کریں یا کسی اور شخص کا۔

وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

نزولی زمین کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک زمین

نزولی ہے جس پر نزولدار کا قبضہ ہے اور نزولدار کی طرف سے اس کا نزول مالک زمین کو ادا کیا جاتا ہے۔ ایسی زمین پر مسجد تعمیر کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اگر مسجد تعمیر کی جائے تو وہ شرعاً موقوفہ متصور ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: نزولی زمین شخص قابض کی مملوکہ نہیں ہے لہذا بلا اجازت مالک زمین سے تعمیر کرنے اور اس کو وقف کرنے کی اجازت حاصل کرے، اجازت نہ لینے کی صورت میں مالک زمین کو شرعاً یہ اختیار حاصل ہوگا کہ اس کی موقوفہ حیثیت کو توڑ دے۔ ردالمحتار کی جلد سوم کتاب الوقف صفحہ ۳۵۹/ میں ہے:

و ینقض وقف استحق لملک او شفعة و ان جعله مسجداً.

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

اثبات وقف کا مسئلہ

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک مسجد ہے اور اس کے متصل ایک قطعہ زمین ہے جس کو شوکت جنگ بہادر اپنی مملوکہ بتلاتے ہیں اور اس کا نزول بھی وصول کیا کرتے ہیں اور امور مذہبی سرکار عالی کے مرتب کردہ نقشہ میں بھی زمین مذکور خارج از مسجد تسلیم کی گئی ہے۔

عبدالنبی نامی ایک شخص نے محکمۂ صفائی میں درخواست پیش کی کہ وہ اس زمین پر وہ ملکیات مسجد کے لیے تعمیر کرنا چاہتا ہے اور اس درخواست میں اس نے بتلایا ہے کہ زمین مذکور مسجد کی ہے اور تحت مسجد وقف ہے، کیا اس شخص کی مجرد درخواست کی بنا پر وہ زمین مسجد کی ہو جائے گی، اور وقف شدہ سمجھی جائے گی؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: صورت مسئول عنہا میں جب کہ زمین مذکور سرکاری نقشہ مرتبۂ امور مذہبی میں خارج از مسجد بتلائی گئی ہے تو عبدالنبی کو اپنے دعوے کے اثبات میں بینۂ شرعیہ پیش کرنی چاہیے، بغیر اس کے دعوی لائق سماعت نہ ہوگا محض

یہ درخواست پیش کردینے سے کہ زمین مسجد کے علاقہ کی ہے، زمین مذکور حق مسجد اور وقف شدہ نہ سمجھی جائے گی۔ ردالمحتار کی جلد سوم کتاب الوقف صفحہ ۴۹۳ر میں ہے:

و ما لم یکن لها رسوم فی دواوین القضاة القیاس فیها عند التنازع ان من اثبت حقا حکم له به اھ. وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب.

خادم وقف کی اولاد کے لئے جائیدادِ موقوفہ سے انتفاع کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک مسجد کے تحت کچھ زمین ہے جو محمد کبیر کے آباواجداد کو منجانب سرکار بطور انعام شروط بخدمت مسجد عطا ہوئی تھی، جو بالآخر محمد کبیر کے نام بحال ہوئی اور وہ مسجد کی خدمت ادا کرتے ہوئے، اس زمین کی آمدنی سے منتفع ہوکے رہے، محمد کبیر کا انتقال ہوگیا۔ ان کے تین لڑکے (لطیف کبیر، میراں کبیر اور رحمٰن کبیر) تھے ان تینوں فرزندوں کا بھی انتقال ہوگیا، لطیف کبیر کی ایک دختر مسماۃ جوہر بی زندہ ہے، میراں کبیر کی دولڑکیاں (عظیمہ بی اور انور بی) موجود تھیں ان کا بھی انتقال ہوگیا، عظیمہ بی کا ایک فرزند (یٰسین غوری) اور انور بی کی ایک دختر (پادشاہ بی) موجود ہے، رحمٰن کبیر کے دولڑکے مسمیان رزاق کبیر و داؤد کبیر زندہ ہیں اور مسجد اس وقت غیر آباد ہوگئی ہے، ایسی حالت میں زمین مذکور کی آمدنی سے محمد کبیر مرحوم کی اولاد موجودہ کو بروئے احکام شرع شریف کیا حق پہنچتا ہے؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: صورت مسئول عنہا میں زمین مذکور اگر تحت مسجد وقف اور اب وہ مسجد غیر آباد ہوگئی ہے تو قاضی (حاکم اوقاف) کو چاہیے کہ اس زمین کی آمدنی کو کسی دوسری مسجد پر جو آباد ہو اور اس کو آمدنی کی ضرورت ہو منتقل کرے اور اگر مسجد کے تحت وقف نہیں کی گئی تھی بل کہ محمد کبیر کے آباواجداد کے نام بشرط خدمت مسجد عطا ہوئی تھی تو معطی (پادشاہ وقت) کو اختیار ہے کہ اس مسجد

کے غیر آباد ہو جانے کی وجہ سے مشروط الخدمت معاش کو کسی دوسری مسجد پر منتقل کرے یا مدد معاش قرار دے۔ دوسری مسجد پر منتقل کرنے کی صورت میں جس شخص سے ادائے خدمت کا تعلق ہو وہی اس معاش کے پانے کا مستحق ہوگا اور مدد معاش قرار دینے کی صورت میں محمد کبیر مرحوم کے فرزندان علی السویہ اس کی آمدنی کے پانے کے مستحق متصور ہوں گے اور ان کے حصص ان کی اولاد میں خواہ وہ صنف ذکور سے ہو یا اناث سے بحصۂ مساوی منقسم ہوں گے۔ ردالمحتار کی جلد سوم کتاب الوقف صفحہ ۴۳۷ میں ہے:

و فی فتاوی النسفی سئل شیخ الاسلام عن قریة رحلوا و تداعی مسجدها ای الخراب و بعض المتغلبة یستولون علی خشبه و ینقلونه الی دورهم هل لواحد لاهل المحلة ان یبیع الخشب بامر القاضی و یمسک الثمن لیصرفه الی بعض المساجد او الی هذا المسجد قال نعم، نیز اسی صفحہ میں ہے: رباط فی بعض الطرق ضرب و لا ینتفع المارة به و له اوقاف عامرة فسئل هل یجوز نقلها الی رباط آخر ینتفع الناس به قال نعم لان الواقف غرضه انتفاع المارة و یحصل ذلک بالثانی اھ اور رسالۂ صدریہ میں ہے: ان کان الانعام بشرط الخدمة فهو اجرة فلا یرث و لا یورث و لا یستحق الاجرة الا من قام بالخدمة. نیز رسالۂ مذکورہ میں ہے: للامام ان یعطی الوظیفة لزید و اولاده و احفاده فتقسم بینهم بالسویة و لا یفضل الذکور علی الاناث. وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

وقف کی تولیت کا مسئلہ

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حاجی میر دلاور علی نے کچھ جائداد غیر منقولہ یعنی چند مکانات وملکیات وقف کیں، اور تولیت کی نسبت وقف نامہ میں یہ صراحت کی کہ:

”حق تولیت اس کا منمقر، ومسماتان رقیہ بیگم وحسین بی زوجگاں و برادرانِ یک جدی مسمیان میر سعادت علی ومیر یعقوب علی نابالغان کو نسلاً بعد نسلٍ حاصل رہے گا“

میر دلاور علی کا انتقال ہوگیا، مرحوم کی زوجگان بوجہ پردہ نشینی اپنی جانب سے کسی عزیز کو منتظم مقرر کرنا چاہتی ہیں لہٰذا ایسا مقرر کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً ومصلیاً: عورت کسی جائداد موقوفہ کی متولیہ مقرر ہو سکتی ہے، اور اگر وہ خود انتظام نہ کر سکے تو اپنی طرف سے کسی دوسرے شخص کو نائب مقرر کر کے انتظام کرا سکتی ہے عالمگیریہ کی کتاب الوقف صفحہ ۴۸۱/ میں ہے:

و فی الاسعاف لا یولی الا امین قادر بنفسه او بنائبه و یستوی فیه الذکر و الانثیٰ.

اسی طرح نابالغ بھی متولی وقف مقرر ہو سکتا ہے اس صورت میں قاضی (حاکم اوقاف) کو چاہیے کہ نابالغ کی طرف سے بھی کسی کو نائب مقرر کرے، چناں چہ عالمگیریہ کی کتاب الوقف صفحہ ۴۸۲/ میں ہے:

و ان اوصی الی رجل وصبي اقام القاضی بدل الصبی رجلا کذا فی الحاوی.

پس صورت مسئول عنہا میں حاجی میر دلاور علی مرحوم کی جائداد موقوفہ کی

تولیت بموجب وقف نامہ ان کی زوجگان اور ایک جدی برادران نابالغان کو اور ان کے بعدان کی اولاد کو حاصل رہے گی اور ہر فریق کی طرف سے جو نائبین مقرر ہوں گے وہ سب مل کر جائداد موقوفہ کا انتظام کریں گے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

کتاب الرہن

بیع بالوفاء کا مسئلہ

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ موتی بیگم نے اپنا مکان سجاد مرزا بیگ کے ہاتھ مبلغ..........روپیہ پر بطور بیع بالوفا فروخت کیا اور یہ صراحت کی کہ سات سال کے عرصہ میں اگر وہ چاہیں تو مکان مذکور کو بادائی رقم مذکور واپس لے سکیں گی، فروخت کے بعد مکان کا قبضہ بھی سجاد مرزا بیگ کو دیدیا۔

اب مدت مذکور گزر چکی مگر موتی بیگم نے مکان مذکورہ واپس نہیں لیا اور سجاد مرزا بیگ کا انتقال بھی ہو چکا اس مکان پر مرحوم کی اولاد قابض ہے ایسی حالت میں مکان مذکور سجاد مرزا بیگ اور ان کی الاد کی ملک تصور ہوگی یا موتی بیگم کی؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: شئی مرہونہ سے نفع حاصل کرنا چوں کہ شرعاً ناجائز ہے اور اس انتفاع کو ربا (سود) قرار دیا گیا ہے اور بغیر نفع لینے کے کوئی شخص رہن لینے پر رضامند نہیں ہوتا اس لیے ربا سے بچنے کے لیے بعد کے فقہاء نے یہ تجویز کی تھی کہ بیع بالوفا کے طور پر وہ شی جس کو رہن رکھنا مقصود ہے بجائے رہن رکھنے کے اس کو ایک مناسب مدت (مثلاً سال، دو سال، پانچ سال، دس سال) کے لیے خرید لیا جائے اور اس مدت تک مشتری اس شئی سے نفع اٹھائے مثلاً وہ شئی مکان ہو تو اس میں سکونت اختیار کرے یا اس کے کرایہ سے منتفع ہوتا رہے، اور بائع کو اندرون مدت

خیار دیا جائے کہ وہ اس کو خرید لے اور اگر مدت ختم ہو جائے اور بائع کو اس کو خرید نہ سکے تو مشتری ہی اس کا مستقل مالک بن جائے اور بائع کا خیار ساقط کر دے، گویا ربا سے بچنے کا یہ ایک حیلہ ہے لیکن محققین فقہاء نے یہی لکھا ہے کہ بیع بالوفاء بھی در اصل رہن ہی ہے، لہٰذا بائع بمنزلہ راہن اور مشتری کو اندرون مدت ادا کر دے تو شئ مبیع کو جو دراصل شئ مرہونہ ہے مدت ختم ہو جانے کے بعد بھی شرعاً واپس لے سکے گا، محض مدت ختم ہو جانے کی بناء پر بائع (راہن) کا حق اسی روز ساقط نہ ہوگا، البتہ مشتری یعنی مرتہن کو مدت مبینہ کے ختم ہو جانے کے بعد یہ اختیار رہے گا کہ اس کو فروخت کر کے اپنی رقم وصول کر لے۔ عالمگیریہ کی جلد سوم کتاب البیوع باب بستم صفحہ ۲۷۱ر میں ہے:

البیع الذی تعارف اھل زماننا احتیالا للربا و سموہ بیع الوفاء ھو فی الحقیقۃ رھن وھذا المبیع فی ید المشترق کالرھن فی ید المرتھن لا یملکہ و لا یطلق لہ الانتفاع الا باذن مالکہ و ھو ضامن لما اکل من ثمرہ و استھلک من شجرہ و الدین ساقط بھلاکہ فی یدہ اذا کان بہ وفاء بالدین و لا ضمان علیہ فی الزیادۃ اذا ھلکت من غیر صنعہ و للبائع استردادہ اذا قضی دینہ و لا فرق عندنا بینہ و بین الرھن فی حکم من الاحکام کذا فی الفصول العمادیۃ.

پس صورتِ مسئول عنہا میں مکان مذکور کی مالک موتی بیگم صاحبہ ہی ہوں گی البتہ مرزا بیگ مرحوم کے ورثاء کی مدت مبینہ منقضی ہو جانے کی وجہ سے شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ مکان کو فروخت کر کے اپنی رقم کی پا بجائی کرے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

کتاب المفقود

زوجۂ مفقود الخبر کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کا عقد مسمی محمد خاں سے بتاریخ ۲۷؍رجب ۱۳۴۵ھ ہوا، مگر مسمی مذکور عنین ہونے کی وجہ سے آج تک مفقود الخبر ہے بہت کچھ تلاش کی گئی مگر کہیں اس کا پتہ نہ چل سکا، اسی تلاشی میں ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر گیا۔

محمد خاں کا ایک مکان ذاتی ہے اور کچھ جہیز کا سامان موجود ہے، اس کی ایک ہمشیرہ ہندہ ہے جو کچھ سامان تھا فروخت کر چکی ہے اور اب وہ چاہتی ہے کہ مکان بھی فروخت کر دے۔

نوجوان ہندہ کا اس طرح عالم کس مپرسی میں رہنا اب متعذر ہو گیا ہے اور اب ہندہ اپنا دوسرا عقد کرنا چاہتی ہے، لہٰذا دوسرا عقد کرنے کے لیے ہندہ کو ابھی کتنی مدت تک ٹھہرنا ہوگا، اور اس عرصہ میں ہندہ کے نفقہ کا کیا انتظام کیا جائے گا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً: صورت مسئول عنہا میں اگر ہندہ کا شوہر مسمی محمد خاں مفقود الخبر ہے اور ہندہ اس طرح نہیں رہ سکتی تو وہ قاضی (مسلمان حاکم عدالت) کے پاس درخواست پیش کرے قاضی بہ تمسک مذہب حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ چار سال تک اس کی تلاش کا انتظام کرے گا اور اس کے نہ آنے اور پتہ نہ چلنے کی صورت میں مفقود کی وفات کا فیصلہ کرے گا، اور ہندہ کو عدت وفات (چار مہینے دس دن) ختم کرنے اور اس کے بعد نکاح ثانی کر لینے کی اجازت دے سکے گا۔
محمد خاں کی تاریخ مفقودی سے اس وقت تک ڈیڑھ سال کا عرصہ جو گزر چکا ہے وہ

اس چار سال کی مدت میں محسوب نہ ہوگا۔ درمختار کی کتاب المفقود میں ہے:

(و لا یفرق بینه و بینها و لو بعد مضی اربع سنین) خلافا لمالک. اور ردالمحتار میں ہے:(قوله خلافا لمالک) فان عنده تعتد زوجة المفقود عدة الوفاة بعد مضی اربع سنین. اور اس کے بعد ہے: قال القهستانی: لوافتی به فی موضع الضرورة لا بأس به علی ما اظن.

اس مدت تک ہندہ کے نفقہ کا انتظام بھی مفقود کے مال نقد یا سونے چاندی سے قاضی ہی کرے گا۔ درمختار کے باب النفقہ میں ہے:

(و تفرض النفقة) بانواعها الثلاثة (لزوجة الغائب) مدة سفر، صیرفیة و استحسنه فی البحر و لو مفقودا.

اسی طرح مفقود پر جن لوگوں کا نفقہ بغیر حکم قاضی کے بھی واجب تھا، ان کے نفقہ کا انتظام بھی کرے گا مثلاً اس کے ماں باپ یا اولاد؛ لیکن ایسے قرابت دار جن کا نفقہ حکم قاضی کے بغیر واجب نہیں ہوتا مثلاً بھائی بہن وغیرہ، ان کا نفقہ مفقود کے مال سے ادا نہیں کیا جائے گا۔ عالمگیریہ کی جلد دوم کتاب المفقود صفحہ ۳۲۴/ میں ہے:

ینفق من ماله علی من تجب علیه نفقته حال حضرته بغیر قضاء کزوجته و اولاده و ابویه و کل من لا یتحقها بحضرته الا بقضاء فانه لا ینفق علیه کالاخ و الاخت و نحوهما، و معنی قولنا ماله: النقدان کذا فی خزانة المفتین، و التبر بمنزلة النقدین فی هذا الحکم.

پس صورت مسئول عنہا میں مفقود کی بیوہ بہن کا نفقہ مفقود کے مال سے متعلق نہ ہوگا۔

نیز قاضی مفقود کے مال و جائداد کی حفاظت کے لیے کسی کو مقرر کرے گا، جو خراب یا ضائع ہو جانے والی چیزوں کو فروخت کر سکے گا، اور جس میں ایسا اندیشہ نہ ہو اس کو محفوظ رکھے گا، اگر اس کے بھی فروخت کی ضرورت داعی ہو تو قاضی کی اجازت سے اس کو فروخت کیا جا سکے گا۔ عالمگیریہ کے اسی صفحہ میں ہے:

و ینصب القاضی من یحفظ ما له و یقبض غلاته و الدیون التی اقربها غرماؤه. نیز یہ بھی لکھا ہے: ثم الوکیل الذی نصبه القاضی یخاصم فی دین وجب بعقده بلا خلاف و یبیع ما یخاف علیه الفساد من ما له کذا فی التبیین و لا یبیع ما لا یتسارع الیه الفساد فی نفقة و لا فی غیرها منقولا کان او عقاراً کذا فی غایة البیان.

صورت مسئول عنہا میں مفقود کی بیوہ بہن نے جو سامان بطور خود فروخت کر دیا ہے وہ اس کی ذمہ دار ہوگی۔

ہندہ کا سامان جہیز ہندہ کی ملک ہے اس میں مفقود کی بہن کو شرعاً کسی قسم کی مداخلت کا حق نہیں ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

کتاب الاقرار

نسب کے اقرار کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی حیات میں متعدد اشخاص کے سامنے بکر کو اپنا فرزند ہونا بیان کیا اور اس کی فرزندی تسلیم کی، اب زید کا انتقال ہو چکا ہے اور بکر موجود ہے زید کے انتقال کے بعد اس کے متعلقین بکر کو زید کا صلبی فرزند تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہیں، ایسی حالت میں بکر

مذکور شرعاً زید کا وارث ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: صورت مسئول عنہا میں اگر بکر کا نسب کسی اور شخص سے ثابت نہیں ہے اور بکر کی عمر کا لڑکا زید کو ہونا ممکن ہے اور زید نے بکر کی نسبت اپنے فرزند ہونے کا اقرار کیا ہے اور بکر کو بھی اس سے انکار نہیں ہے بشرطیکہ بکر اقرار یا انکار کی تمیز رکھتا ہو، تو بکر شرعاً زید کا فرزند متصور ہوگا، زید کے ایسے اقرار کر لینے، اور بکر کی فرزندی ثابت ہو جانے کے بعد اگر زید کے متعلقین یا کوئی اور شخص یا اشخاص بکر کو زید کا فرزند تسلیم کرنے سے انکار کریں تو ان کا انکار لائق التفات نہ ہوگا، بل کہ خود زید بھی ایک دفعہ اقرار کر لینے کے بعد اپنے اقرار سے رجوع کرتا تو ایسی حالت میں بھی زید کا اس طرح رجوع لائق تسلیم نہ ہوتا، بہر حال بکر مثل دوسرے صحیح النسب فرزندوں کے زید کا صحیح النسب فرزند قرار دیا جائے گا، اور دوسرے فرزندوں کی طرح بکر بھی زید کا وارث ہوگا، تبیین الحقایق کی جلد (۵) کتاب الاقرار صفحہ ۲۷ رمیں ہے:

(و ان اقر بغلام مجهول يولد مثله لمثله) اى مثل المقر (انه ابنه و صدقه الغلام ثبت نسبه و لو مريضاً و شارک الورثة) لان النسب من الحوائج لا صلبية و هو ايضاً اقرار على نفسه على ما بيناه و ليس فيه ضرر على غيره قصدا فيصح و قد ذكرناها فى الدعوى و العتاق و شرط ان لا يكون له نسب معروف لانه اذا كان له نسب معروف لا يمكن ثبوته منه و لاحاجة الى اثباته لاستغنائه به عنه و شرط ان يولد مثله لمثله كيلا يكذب به الظاهر و شرط ان يصدقه الغلام لان الحق له فلا يثبت بدون تصديقه اذا كان مميز او الكلام فيه بخلاف ما اذا كان لا يعبر عن نفسه حيث لا يعتبر تصديقه

لانه فی ید غیره و قد ذکرناه من قبل فاذا صح اقراره شارک الورثة فی المیراث لانه من ضرورات النسب. اورحاشیہ شلبی میں ہے:(قوله ان لا یکون له نسب معروف) ای لان معروف النسب لا یصح دعوی نسبه لانه اذا ثبت من احد لا یقبل الفسخ بعد ذلک اهـ. اتقاني. (قوله شارک الورثة) ای و لا یصح الرجوع بعد ذلک اهـ. اختیار. وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

کتاب الحظر والاباحہ

کن کن جانوروں کو خصی کرنا جائز ہے؟

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ خصی یا آختہ کرنا، کن کن جانوروں کا از روئے فقہ حنفیہ درست و جائز ہے اور کن جانوروں کی نسبت شرعاً ممانعت ہے۔ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: خصی کا عمل خواہ بیضتین خارج کرنے کے ذریعہ سے ہو ان کی رگوں پر ضربات وغیرہ پہنچا کر ان کو بیکار کر دیا جائے، ان اعضاء کو بگاڑ دینا ہے اعضاء کو بگاڑ دینے کو "مثلہ" کہتے ہیں۔ اور یہ شرعاً مکروہ تحریمی اور ناجائز ہے؛ لیکن اس میں اگر کوئی مصلحت ہو مثلاً اس سے کوئی منفعت حاصل ہوتی ہو یا کوئی مضرت دفع ہوتی ہو تو اس کے کرنے میں مضائقہ نہیں ہے نظر براں بہائم کی خصی جائز ہے، اس لیے کہ بہائم اس سے فربہ ہوتے ہیں اور کام زیادہ کرتے ہیں، نیز ان کی قیمت بھی زیادہ وصول ہوتی ہے، نیز بعض اوقات یہ بہائم وحشی ہو جاتے ہیں جس سے لوگوں کی جان کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے، اگر بہائم سینگ والے ہیں تو وہ سینگ سے مارنے لگتے ہیں، اور اگر سینگ والے نہ ہوں تو دانتوں سے کاٹ کھاتے ہیں۔

بہر حال اگر ان کی ایسی مضرت کو دفع کرنے یا ان کو فربہ کر کے کام زیادہ لینے یا ان کو فروخت کر کے قیمت زیادہ وصول کرنے کے لیے ان کو خصی کیا جائے تو چوں کہ یہ عمل دفع ضرر یا جلب منفعت کی خاطر کیا گیا ہے اس لیے شرعاً اس میں مضائقہ نہ ہوگا، اسی طرح بلے کو بھی خصی کیا جا سکتا ہے جب کہ اس سے کسی نفع کے حصول یا کسی ضرر کو دفع کرنا مقصود ہو یہی حکم دوسرے جانوروں کا ہے۔ چنانچہ جن جانوروں کا گوشت کھانا شرعاً جائز ہے ان کے خصی کرنے سے وہ فربہ ہو جاتے ہیں اور گوشت زیادہ میسر آتا ہے اور ان کا گوشت خوش ذائقہ ہوتا ہے نیز ان کا وحشی پن بھی دفع ہو جاتا ہے؛ لہٰذا اس نیت سے بھی خصی کرنا شرعاً جائز ہے چناں چہ قربانی کے جانوروں میں سے خصی کی قربانی اس کے فربہ ہونے اور اس کا گوشت لذیذ ہونے کی بنا پر شرعاً جائز رکھی گئی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل مبارک سے بھی ثابت ہے کہ آپ نے ایسے دنبوں کی قربانی فرمائی تھی۔

اگر جانور کے خصی کرنے سے نہ تو کوئی فائدہ متصور ہو اور نہ دفع ضرر کی کوئی صورت تو شرعاً ناجائز ہے اور جس صورت میں کہ خصی کرنے سے اور کسی معصیت کا اندیشہ ہو جیسے انسان کو خصی کرنا کہ اس سے بدکاری مقصود ہوتی ہے تو چوں کہ ایسا عمل دوسری معصیت کا سبب ہو جاتا ہے لہذا یہ شرعاً حرام ہے، اور خصی بنائے ہوئے انسان سے خدمت لینا بھی شرعاً مکروہ تحریمی ہے کیوں کہ اس سے انسان کو خصی بنانے کا عمل (جو حرام ہے) رواج پاتا ہے اگر خصی کرنے سے ایک طرف نفع ہو اور دوسری طرف ضرر، جیسے گھوڑے کو آختہ کرنا کہ اس سے گھوڑا فربہ ہو کر زیادہ کام دیتا ہے، لیکن گھوڑے آلۂ جہاد بھی ہیں اگر ان کو آختہ کیا جایا کرے تو اس سے گھوڑوں کی نسل ہی منقطع ہو جانے یا ان کی کمی ہونے کا اندیشہ ہے لہٰذا اس میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔ شمس الائمہ حلوائیؒ فرماتے ہیں کہ گھوڑے کو خصی کرنے میں ہمارے اصحاب حنفیہ کے نزدیک مضائقہ نہیں ہے، اور شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ یہ حرام ہے۔ درمختار کی

کتاب الحظر والاباحہ میں ہے:

(و) جاز (خصاء البهائم) حتى الهرة، و اما خصاء الآدمى فحرام، قيل و الفرس و قيدوه بالمنفعة و الا فحرام. اور رد المحتار میں ہے: (قوله و قيدوه) اى جواز خصا ء البهائم بالمنفعة و هى ارادة سمنها أو منعها عن العض بخلاف بنى آدم فانه يراديه المعاصى فيحرم. اور عالمگیریہ کی کتاب الکراہیۃ میں ہے: خصاء بنى آدم حرام بالاتفاق، و اما خصاء الفرس فقد ذكر شمس الائمة الحلوانى فى شرحه انه لا بأس به عند اصحابنا و ذكر شيخ الاسلام فى شرحه أنه حرام. و اما فى غيره من البهائم فلا بأس به اذا كان فيه منفعة و اذا لم يكن فيه منفعة او دفع ضرر فهو حرام كذا فى الذخيرة. و خصاء السنور اذا كان فيه نفع او دفع ضرر لابأس به كذا فى الكبرىٰ. اور تبیین الحقائق للزیلعی کی جلد ششم صفحہ ۳۱ رمیں ہے: (و خصاء البهائم) اى جاز لانه عليه الصلوة و السلام ضحى بكبشين املحين موجوء ين. و الموجوء هو الخصى و (ان لحمه يطيب به و يترك النطاح فكان حسنا. وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

عورتوں کے بے نقاب گھومنے کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید مسلمان حنفی المذہب ہے، اپنے اہل وعیال کو جو وہ عاقلہ و بالغہ ہیں، اپنے ہمراہ بے نقاب لے کر پھرا کرتا ہے کہ، یا اسلام و شرع شریف ایسی بے پردگی و بے نقابی کو روا و جائز رکھا

ہے، بحوالہ آیات قرآنی واحادیث وکلام ائمہ وغیرہ سے بصراحت و بوضاحت فتویٰ مرحمت فرمایا جائے؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: جوان عورتوں کے لیے شرعاً یہ حکم ہے کہ وہ اجنبی لوگوں سے اپنے چہروں کو باہر نکلتے وقت چھپائے رکھیں، علامہ ابوبکر رازی جصاصؒ احکام القرآن میں ارشاد باری تعالیٰ عزاسمہ: یٰاَیُّها النبی قل لازواجک و بناتک و نساء المومنین یدنین علیهن من جلا بیبهن کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

قال ابوبکر: فی هذه الآية دلالة علی ان المرأة الشابة مامورة بستر وجهها عن الاجنبیین و اظهار الستر و العفاف عند الخروج لئلا یطمع اهل الریب فیهن.

صورت مسئولہ میں زید اگر اپنے اہل وعیال کو بے نقاب باہر لیے پھرتا ہے تو اس کا یہ عمل شرعاً ناجائز ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

عورت کے لیے محارم کی تعیین اور محارم کے سامنے پردہ کا حکم

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عورتیں کن کن سے بے پردہ ہوں، اور جن کے سامنے بے پردہ ہوسکتی ہیں، ان کے روبرو کون سے اعضاء وجوارح کے ساتھ بے پردہ ہوسکتی ہیں، اور جن سے پردہ کرنا چاہیے ان کے سامنے نکلیں تو ان کے لیے کیا حکم ہے؟ پس بنظر حالات زمانہ از روئے شرع شریف بوضاحت جواب مرحمت فرمایا جائے۔ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً: عورت کا تمام جسم اس کے چہرے اور ہاتھ، پاؤں کے پنجوں کے سوا قابل ستر ہے، لہٰذا اس کو بے ضرورت نہ کھولے۔ درمختار کی جلد اول کتاب الصلاۃ صفحہ ۲۷۱ میں ہے:

(و للحرة) و لو خنثی (جمیع بدنها) حتی شعرها النازل فی الاصح (خلا الوجه و الکفین) فظهر الکف عورة علی المذهب (و القدمین) علی المعتمد.

ستر مذکور حالت نماز و خارج نماز دونوں کے لیے عام ہے چنانچہ درمختار کے صفحہ ۲۷ر میں ہے:

(و الرابع ستر عورته) و وجوبه عام و لو فی الخلوة علی الصحیح الا لغرض صحیح.

عورت اگر جوان ہو تو فی زمانا اجنبی مرد کے سامنے اپنا چہرہ بھی نہ کھولے۔ درمختار میں ہے:

و تمنع المرأة الشابة عن کشف الوجه بین رجال لا لانه عورة بل لخوف الفتنة.

محارم کے سامنے عورت کا سر چہرہ، چھاتیاں، پنڈلی اور بازو بھی کھلا رہ سکتا ہے بشرطیکہ جانبین کو شہوت سے امن ہو، مگر پیٹ، پیٹھ اور ران کا کشف محارم کے سامنے بھی کسی حال میں جائز نہیں۔ محارم سے وہ لوگ مراد ہیں جن سے ہمیشہ کے لیے نکاح حرام ہو۔ درمختار میں ہے:

(و من محرمه) هی من لا یحل له نکاحها ابداً بنسب او سبب و لو بزنا (الی الرأس و الوجه و الصدر و الساق و العضد ان امن شهوته) و شهوتها ایضاً ذکره فی الهدایة فمن قصره علی الاول فقد قصر، ابن کمال (و الالا، لا الی الظهر و البطن) خلافا للشافعیؒ (و الفخذ) و الاصل قوله تعالی و لا یبدین زینتهن الا لبعولتهن الآیة. و تلک

المذکورات مواضع الزینة بخلاف الظهر و نحوه۔
وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

و الحمد للّٰہ اولاً و آخراً ظاھراً و باطناً و الصلوۃ و السلام علی رسولہ سید الانبیاء و المرسلین سیدنا محمد و علی آلہ و اصحابہ اجمعین و علی اتباعھم باحسان الی یوم الدین و الحمد للہ رب العلمین۔

چودھواں باب

اولادواحفاد

اولادواحفادکااجمالی نقشہ

نامور اولاد و احفاد کا مختصر تذکرہ

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے ہیں، آپ کے والد فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب حجۃ الاسلام مولانا قاسم نانوتوی کے فرزند رشید ایک مشہور عالم دین تھے، آپ کا سلسلہ نسب خلیفہ اول امیر المؤمنین حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔

ابتدائی حالات اور تعلیم

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے، آپ کا تاریخی نام مظفر الدین ہے، بعد میں طیب تجویز کیا گیا، اسی نام سے آپ کو شہرت دوام ملی، اشعار میں کہیں کہیں عارف تخلص فرمایا ہے، سات سال کی عمر میں دار العلوم میں داخل ہوئے، شیخ الہند مولانا محمود حسن، مفتی عزیز اور آپ کے والد محترم حضرت مولانا محمد احمد صاحب کی موجودگی میں آپ کی بسم اللہ کرائی گئی، دو سال کی قلیل ترین مدت میں قرآن مجید قرات و تجوید کے ساتھ حفظ کرلیا حفظ قرآن کے بعد درجہ فارسی میں داخل ہوئے اور پانچ سال میں فارسی نصاب مکمل کیا، اس کے بعد شعبہ عربی میں داخل ہوئے اور آٹھ سال کی مدت میں ساری نصابی کتابیں مکمل کرنے کے بعد ۱۳۳۷ھ ہجری مطابق ۱۹۱۹ء سند فضیلت حاصل کی حدیث میں آپ کے خصوصی استاذ محدث کبیر علامہ انور شاہ کشمیریؒ تھے آپ کو وقت کے مشاہیر علماء سے بھی خصوصی اسناد حدیث حاصل ہوئیں مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے خود آپ کو سہارنپور

طلب فرما کر حدیث کی تلاوت کرا کے اپنی خصوصی سند کو اپنے دست مبارک سے لکھ کر عطا فرمائی اسی طرح مولانا عبداللہ انصاریؒ اور اپنے والد ماجد سے بھی سند حدیث لی ۰ ۱۳۵۰ھ مولانا اشرف علی تھانویؒ سے خلافت حاصل ہوئی۔

درس و تدریس

علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد آپ اپنے ذوق ومزاج کے لحاظ سے درس و تدریس کے مشغلہ کو پسند کرتے تھے ادھر آپ کی علمی استعداد و ذہانت قوت افہام و تفہیم اور خاندانی لحاظ سے خالص علمی پس منظر کو دیکھتے ہوئے اکابر دارالعلوم کی نگاہوں میں بھی آپ کیلئے تدریس کا سلسلہ موزوں ترین تھا البتہ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ کا تقرر بحیثیت استاذ دارالعلوم میں ہوا چناں چہ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ اپنی ذہانت و ذکاوت کی بناء پر نہ صرف دارالعلوم کے اندر مقبول ترین اساتذہ میں شمار ہونے لگے بلکہ تمام علمی حلقوں میں آپ کی فراست وذکاوت قوت بیان اور علمی گہرائی و گیرائی کی شہرت ہوگئی اور آپ کی نکتہ رسی نکتہ آفرینی کے چرچے ہونے لگے دوران تدریس تقریباً ہر علم و فن کی کتابیں آپ کے زیر درس رہیں۔ چناں چہ فقہ، نحو، صرف، منطق، فلسفہ اور معانی وغیرہ تمام فنون کی کتابیں انتہائی حسن وخوبی کے ساتھ پڑھائیں جس سے علمی حلقوں میں آپ کی شہرت کو چار چاند لگے اور اکابر کے ذریعے سند اعتراف ملی۔ تقریباً چھ سات سال کے دوران جب تک آپ صرف استاد دارالعلوم کی حیثیت سے ادارے کی خدمت کرتے رہے آپ نے کبھی کوئی حق الخدمت یا معاوضہ نہیں لیا۔

سراپا

قدنخل ثمر دار، نہ کوتاہ نہ دراز، احسنِ تقویم کا طغرۂ حسین، چہرہ علم وحکمت کی کتاب، آنکھیں فضل وکمال کی محراب، پیشانی چاند کی طرح روشن، نشانِ سجدہ شقِ قمر کا نمونہ بھنویں شرافت وکرامت کا آئینہ، رخسار گلِ پُر بہار، بینی شرافت کی آئینہ دار، سر

خوبصورت گولائی لئے ہوئے اوراس پر چوڑی باڑ کی دوپلی ٹوپی بزرگانہ روایتوں کی نقیب، داڑھی مشرع سنتِ رسول کا اعلان کرتی ہوئی، کاندھے انکساری، خاکساری اور ذمہ داری کا نقشِ جمیل، ہتھیلیاں ریشم سے زیادہ نرم، ہمہ وقت بیگانہ وخویش کی اعانت میں سرگرم، دل صحیفۂ ابرار، دماغ ذہانتوں کا محرم اسرار، چال ڈھال ''و عباد الرحمن الذین یمشون علی الارض ہونا'' کی تفسیر، گفتار میں گہرائی، مزاج میں صفائی، طبیعت میں سچائی، فطرت میں رہنمائی، مجموعی ہیئت میں رعب ودبدبہ، عظمت ووقار، سنجیدگی اور ایک اعلیٰ معیار، جلالِ علم کے ساتھ جمالِ حلم، لطافت کے ساتھ نظافت، شجامت کے ساتھ شرافت اور کرامت۔ (حیات طیب)

یہ خاکہ حضرت حکیم الاسلام کے سوا اور کس کا ہوسکتا ہے!

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

حضرت حکیم الاسلامؒ بحیثیت مہتمم

حکیم الاسلام محمد طیب صاحبؒ کا دور اہتمام نہ صرف سب سے طویل تھا بلکہ دارالعلوم کی ہمہ گیر ترقی عالمی شہرت اور اس کے ایک چھوٹے سے مدرسہ سے جامعہ بننے کا عمل آپ ہی کے باسعادت دور میں پایہ انجام کو پہنچا۔

جب کبھی مطلق لفظ مہتمم بولا یا لکھا جائے تو مراد آپ ہی کی ذات گرامی ہوتی ہے کیوں کہ یہ لفظ صحیح معنوں میں صرف آپ ہی کی ذات پر جچتا ہے۔

بقول مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب:

''ہمارے طالب علمی کے زمانے میں طلبہ دارالعلوم کی زبان پر اکثر یہ جملہ رہا کرتا تھا کہ آخری مہتمم (یعنی حضرت حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ) آخری شیخ الحدیث (یعنی حضرت مولانا سید فخر الدین احمد ہاپوڑی ثم المرادآبادیؒ) اور آخری مفتی (یعنی حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ) کا زمانہ

دیکھ لو۔اب دارالعلوم میں ان کے بعد ان کی جگہ پر جو بھی آئے گا وہ ہرگز ان کے برابر نہ ہوگا۔اور واقعی وہی ہوا جو چیدہ خلق خدا یعنی مہمانان رسولؐ طلبۂ دارالعلوم کی زبان سے اکثر سننے کو ملتا تھا کہ دارالعلوم میں بالا عظیم ہستیوں کی جگہ پر جو حضرات آئے یا آتے رہے وہ اپنی ساری خوبیوں کے باوجود ان کا جواب اور ان کے ہم پلہ نہیں تھے[1]"۔

آپ نے دارالعلوم کو پچپن سال (نائب اہتمام کے دور کو اگر شامل کر لیا جائے تو ساٹھ سال) اپنے خون جگر سے سینچا اور نانوتویؒ کے لگائے ہوئے اس پودے کو ایک تناور درخت بنایا جس کی جڑیں حضرت کی شب و روز کی جد وجہد، سعی پیہم اور مسلسل اسفار نے ہندوستان سے باہر پورے ایشیاء یورپ کے ممالک امریکہ وکنیڈا اور براعظم افریقہ سے لے کر چھوٹے کردہ اور غیر معروف جزائر تک پھیلا دیں، غرضیکہ آپ کے دور اہتمام میں دنیا کے گوشے گوشے سے طلباء نے آکر دینی علوم حاصل کئے۔

حکیم الاسلامؒ کی ذات اور دارالعلوم ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم تھے، نہ آپ کا تذکرہ بغیر دارالعلوم کے مکمل ہوسکتا ہے نہ دارالعلوم کی تاریخ آپ کے بغیر، دارالعلوم نے آپ کے زمانہ اہتمام میں نمایاں ترقیات حاصل کیں، ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۹۲۹ء میں جب آپ نے انتظام دارالعلوم کی باگ ڈور سنبھالی تو دارالعلوم کے نئے نئے اور مفید سے مفید تر ضروری شعبے قائم ہونے لگے، دارالعلوم کی اکثر قابل ذکر عمارتیں آپ ہی کے زمانے میں تعمیر ہوئیں

نام منظور ہو تو کچھ فیض کے اسباب بنا
پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

ان عظیم خدمات کے صلہ میں تاریخ آپؒ کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

---

[1] پس مرگ زندہ، ص: ۳۳۰۔

تدریس و تاسیس مسلم پرسنل لا بورڈ

ہندوستان میں آزادی کے بعد سے ہندو احیاء پرستی اور سرکاری و غیر سرکاری تعصب و تنگ نظری کے ہاتھوں مسلمانوں کو اپنی دینی شناخت کے ساتھ چلنے کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑیں۔ بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں بہ طور خاص مسلمانوں کے پرسنل لاء پر زور و شور سے حملہ کیا گیا۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا قیام اس وقت عمل میں آیا جب حکومت ہند نے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کے ذریعہ مسلمانوں کے شرعی قانون کو تبدیل کرنے کی کوشش کی قانون متبنی پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا مسٹر ایچ آر گھوکھلے، پھر یونین لاء مسٹر نے اس بل کو یونیفارم کی جانب پہلا قدم قرار دیا مسلمانوں کے خلاف حکومت کی ریشہ دوانیوں کے سدّ باب کے لئے حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ نے فوراً ایک جرأت مندانہ اقدام کیا حکیم الاسلامؒ کے منصوبہ کو لے کر بمبئی میں ایک میٹنگ ہوئی ایک عمومی کنونشن منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا، چناں چہ ۲۷، ۲۸/دسمبر ۱۹۷۲ء کو اس میں ایک تاریخی کنونس منعقد ہوا اس طرح حکیم الاسلامؒ نے مسلم پرسنل لاء کی حفاظت کے لئے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کیا اور کنونشن کے داعیوں اور مندوبین کی متفقہ رائے سے قیام عمل میں آیا، ہندوستان میں تحفظ شریعت اسلامیہ کی تحریک کے لئے حضرت حکیم الاسلامؒ کو متفقہ طور پر بورڈ کا صدر اول بنایا گیا۔ اور اخیر عمر تک آپ بالاتفاق آپ ہی صدر رہے۔

خطابت

نطق کو سو ناز ہے تیرے لب اعجاز پر
محو حیرت ہے ثریا، رفعت پرواز پر

بقول مولانا خلیل امینی:

''جب وہ محو تکلم ہوتے، تو سچ مچ لگتا ''بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں''

یا کوئی معصوم فرشتہ وحی الٰہی کی ادائیگی میں مشغول ہے، ان کی تقریر میں زیادہ اتار چڑھاؤ نہ ہوتا وہ میدانی ندیوں کی طرح دھیمی رفتار سے بہتے اور مسلسل بلا انقطاع بہتے، اپنی آواز سے کسی کے لئے باعث سمع خراشی ہوتے نہ اپنے پرجوش و پرسوز انداز گفتار سے کسی کے لئے باعث اذیت، نہ وہ بتکلف ہنسی کا ماحول بنانے کے لئے کوئی کرتب دکھاتے نہ وہ ہاتھ کو ناپسندیدہ انداز میں حرکت دیتے، نہ انگلیوں کے مکروہ اشارے کا سہارا لیتے نہ گرجتے برستے، نہ منہ سے جھاگ نکالتے نہ آنکھیں دکھاتے نہ عام مقررین کی طرح منہ چڑاتے، نہ دین کا بے وجہ نشہ ان کو بدمست کرتا نہ مسلمانوں کے حال بد کا واقعی ادراک ان کے لئے مصنوعی آنسوؤں کے چھلکنے کا باعث بنتا، نہ حاضرین کی طرف سے داد کے طالب ہوتے نہ ستائش کی تمنا کرتے نہ صلہ کی پرواہ، وہ نرمی گدازی اور حلم وکرم کے ساتھ اس طرح بولتے جیسے شیریں خواب محو خواب انسان کے دل و دماغ کو لذت و انبساط اور تازہ دمی کی خوشگواری سے عجیب سی نہ ختم ہونے والی مسرت بخش جاتا ہے، وہ بولتے تو موتی پروتے، وہ اسلام کی سچائیوں کو اس طرح آشکارا کرتے جیسے کوئی پھول نچھاور کر رہا ہو"[1]۔

ایک خطیب کی حیثیت سے حضرت کے زور بیان کی صدائے بازگشت بر صغیر ہندوستان و پاکستان سے لے کر بحر سویز اور بحر اٹلانٹک کے ساحل تک گونج رہی تھی، جہاں حضرت کے نشان قدم اسلام کے ایک مخلص سپاہی اور عظیم مقرر کی حیثیت سے ثبت ہیں اور جہاں آپ کے پراثر لفظوں کا تأثر عظمت دین کے لئے اک دفاعی حصار کا درجہ رکھتا ہے، تاریخ اس حقیقت پر بجا طور پر شاہد رہے گی کہ اسلامی خدمات کے باب میں حضرت کی خطیبانہ اور واعظانہ سرگرمیوں نے رنگ بھرے ہیں اور دنیا

---

[1] پس مرگ زندہ، ص: ۱۴۰۔

کے سامنے قرون اولیٰ کے ان مبلغین کا پیغام تازہ کیا ہے جن کے مدفن آج مسلمانوں کی غفلت پر ماتم کناں ہیں۔

آپ کی تصنیفی وتالیفی خدمات

خطابت وتقریر کی طرح تحریر وتصنیف پر بھی آپ کو غایت درجہ قدرت حاصل تھی، آپ کی تصانیف کی تعداد کافی ہے، چند کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

۱-التشبہ فی الاسلام۔۲-مشاہیر امت۔۳-کلمات طیبات۔۴-اطیب الثمر فی مسئلۃ القضا والقدر۔۵-سائنس اور اسلام۔ ۶-تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام۔۷-مسئلہ زبان اردو ہندوستان میں۔۸-دین وسیاست۔۹-اسباب عروج وزوال اقوام۔۱۰-اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام۔۱۱-الاجتہاد والتقلید۔۱۲-اصول دعوت اسلام۔۱۳-اسلامی مساوات۔۱۴-تفسیر سورۂ فیل۔ ۱۵-فطری حکومت وغیرہ۔اس کے علاوہ آپ کو شعروسخن گوئی پر بھی مکمل قدرت حاصل تھی۔اس سلسلہ میں آپ کا شعری مجموعہ ''عرفان عارف'' اور ''جنون شباب'' قابل ذکر ہے۔

آخری عظیم کارنامہ

دارالعلوم کی عظمت ووقار کے لئے آپ کا آخری عظیم کارنامہ اجلاس صد سالہ کا انعقاد ہے جس نے دارالعلوم دیوبند اور اس کی سوسالہ عظیم خدمات کو عالمی سطح پر ایک قابل لحاظ ادارہ کی حیثیت سے متعارف کرایا اور جس کے ساتھ عرب وعجم کے مسلمانوں کا ایک اٹوٹ مذہبی جذباتی رشتہ ہے حتی کہ مسلمانان عالم اس کے شرعی فیصلوں کو دل وجان سے تسلیم کرتے ہیں، یہ اعتماد دو چار سال میں نہیں پیدا ہوگیا؛ بلکہ یہ ایک مجاہد کی زندگی کے طویل اور ایک صدی کے تین چوتھائی حصے کی پیہم آبلہ پائی کا پھل تھا، یہ ان مسلسل قربانیوں کا ثمرہ تھا جو ایک انسان اپنے دنوں کے چین اور راتوں

کے آرام کو تج کر ہی حاصل کرسکتا ہے۔ یہ صلہ تھا ایک مرد مومن کے اخلاص کا اور انعام تھا، ایک مرد راہ داں کے ایثار کا، اجلاس صد سالہ نے ایک بندہ مومن کی زندگی کے اس نصب العین کو مکمل کر دیا جو دارالعلوم دیوبند کو آسمان علم و تحقیق کے ایک آفتاب عالم تاب کی صورت جگمگاتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا جس کے خیرہ کن نور سے دنیا کا گوشہ گوشہ منور ہو اور جو امت مسلمہ کے سینہ میں دھڑکتا ہوا دل کہلائے

یہ کام ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہیں کا کام ہے جن کے حوصلے ہے زیاد

حضرت مولانا محمد طاہر قاسمیؒ

بانی دارالعلوم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پوتے اور مولانا محمد احمد صاحبؒ کے صاحبزادے مولانا محمد طاہر قاسمی دیوبند میں ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے، آپ اپنے برادر اکبر حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند سے ۹ رسال چھوٹے تھے۔

آپ نے مادر علمی دارالعلوم دیوبند سے سند فراغت حاصل کی، آپ کے ممتاز اساتذہ کرام میں حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ، حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندؒ اور حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ شامل ہیں۔

سند فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ دوسال تک قدوری اور مرقاۃ پڑھاتے رہے، اسی اثناء تصنیف وتالیف کا کام بھی کرتے رہے آپ کی آخری کتاب عقائد اسلام قاسمی آپ کی وفات کے دس یوم بعد شائع ہوئی۔

پہلے آپ نے حضرت شیخ الہندؒ کے دست مبارک پر بیعت کی مگر ان کے انتقال کے بعد آپ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے رجوع ہوئے اور آپ کے مجازین صحبت میں شمار ہوا۔

آپ نے طب کی تعلیم بھی حاصل کی آپ کو علم فلکیات اور علم ہیئت پر بھی دسترس تھی۔

آپ نے تحریک پاکستان کی جدوجہد میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے علاوہ مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ مولانا شبیر علی تھانوی اور دیگر علماء کرام کے شانہ بشانہ

کام کیا۔ نیز حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ کے مشورہ اور ایماء سے مسلمانانِ ہند کو علیحدہ خطۂ وطن کی اہمیت سے آگاہ کیا اور رائے عامہ کو ہموار کیا۔ تاکہ اسلامی مملکت کے قیام کے بعد مسلمان اپنے دین اور شریعت کے مطابق اپنی زندگی گذار سکیں۔

مولانا محمد طاہر قاسمیؒ میں بے پناہ انتظامی صلاحیتیں تھیں اسی کے پیش نظر وقتاً فوقتاً دارالعلوم میں مختلف خدمات انجام دیتے رہے، آپ دارالعلوم دیوبند میں ناظم کتب خانہ (چھ سال) ناظم تعمیرات (۳/سال) اور ناظم مطبخ (۵/سال) کے فرائض سرانجام دیتے رہے اور تقسیم ہند کے بعد تقریباً (۵/سال) یعنی وفات تک ناظم دارالصنائع رہے۔

آپ کی شادی دیوبند کے ایک ممتاز بزرگ جناب محمد منعم عثمانیؒ کی صاحبزادی سے ہوئی، آپ کے سات صاحبزادوں میں قاری زاہر قاسمی مرحوم، مولانا محمد آصف قاسمی، قاری شاکر قاسمی، اور قاری وحید ظفر قاسمی شامل ہیں، آپ کے سب سے بڑے صاحبزادے قاری زاہر قاسمی مرحوم کو جو تحریک پاکستان کے سلسلے میں اپنے والد صاحبؒ کے ہمرکاب رہے۔ ۱۳/اور ۱۴/اگست کی درمیانی شب کو ۱۲ بجے ریڈیو پاکستان سے پہلی مرتبہ تلاوت کلام پاک کی سعادت حاصل ہوئی۔

قاری شاکر قاسمی اور قاری وحید ظفر قاسمی کو پاکستان میں قرأت و نعت کے حوالے سے ممتاز مقام حاصل ہے۔

۱۴/محرم الحرام ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو ۳ بجے شب میں ایک منٹ قبل کلمہ توحید پڑھا اور داعی اجل کو لبیک کہا۔

آپ قبرستان قاسمی دیوبند میں اپنی دادی صاحبہؒ کے پائینتی دفن ہوئے۔

رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب دامت برکاتہم

عاشقان نبوت کے طبقہ میں شروع سے آج تک ایک جماعت ایسی علمائے مخلصین کی رہی ہے جس نے اتباع رسول کو اپنا شعار اور مقصد حیات بنایا، ان کی ہر حرکت وسکون سے سنتیں زندہ ہوتی رہیں۔

ان عاشقان رسول کی طویل فہرست میں موجودہ نام حضرت خطیب الاسلام مولانا محمد سالم صاحب کی ہمہ گیر شخصیت کا ہے، جن کی پاکیزہ زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا ایک حسین مرقع ہے، آپ کی پاکیزہ حیات عشق و اتباع رسول میں ایسی ڈوبی ہوئی ہے کہ آپ کے ہر عمل کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ یہ سنت نبوی کا نمونہ ہے۔

آپ کا ہر عمل رضائے الٰہی کے واسطے ہے، ریا جیسی مہلک بیماری آپ کو چھو کر بھی نہیں گذری، آپ کی طبیعت میں غایت درجہ تواضع وانکساری پائی جاتی ہے، کذب، غیبت، عیاری، چالاکی جیسے رائج الوقت امراض سے اللہ نے آپ کو محفوظ رکھا ہے، آپ کا حلم، بردباری نرم مزاجی اور نرم خوئی مثالی ہے، آپ نے اپنی زبان سے کبھی کسی کے لئے تضحیک یا اہانت آمیز کلمات نہیں نکالے، رکیک باتوں اور سطحی گفتگو سے ہمیشہ اجتناب کیا، سنجیدگی اور عالمانہ شان آپ کی مجالس کی خاص شناخت ہے، جب آپ کسی علمی مسائل پر گفتگو کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ گوہر افشانی ہو رہی ہو، آپ موجودہ دور کے مرجع خلائق ہیں، حکیم الاسلام کے بعد علوم قاسمی کی تشریح وتفہیم میں کوئی آپ کا ہم پلہ نہیں۔

ولادت اور تعلیم

۲۲؍جمادی الثانی ۱۳۴۴ھ ۸؍جنوری ۱۹۲۶ء بروز جمعہ آپ کی ولادت باسعادت ہوئی، آپ کی نگرانی وتربیت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ جیسے مربی کے زیر سایہ ہوئی ناظرہ وحفظ قرآن کریم کی تکمیل جناب پیر جی شریف گنگوہی کے یہاں ہوئی فارسی کا چار سالہ نصاب مکمل کیا فارسی کی تعلیم اس وقت کے جید علماء مولانا عاقل صاحب، مولانا ظہیر صاحب مولانا حسن صاحب کے زیر نگرانی ہوئی ۱۳۶۲ھ میں حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے میزان پڑھی اس وقت صرف موصوف کو یہ سعادت حاصل ہے کہ پوری دنیا میں آپ حکیم الامت کے تن تنہا شاگرد ہیں باقی درسی کتابوں میں کنز الدقائق حضرت مولانا اختر حسین صاحب، میبذی قاری اصغر صاحب، مختصر المعانی اور سلم العلوم مولانا عبدالسمیع صاحب سے، اور ہدایہ مولانا عبدالاحد صاحبؒ سے پڑھی، دورۂ حدیث شریف کی کتب آپ کو حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ اور مولانا فخر الدین صاحبؒ جیسے علماء کبار سے پڑھنے کا شرف حاصل ہے۔

ابا جی نے ہمیں ایک واقعہ سنایا کہ وہ ایک بار حج کے لئے تشریف لے گئے، وہاں ایک سو تیرہ ۱۱۳ سالہ ایک محدث موجود تھے، میں ان کی شہرت سن کر ان سے ملنے گیا اور اپنا سندی تعارف کرایا اور ان سے اجازت حدیث کی درخواست کی تو انہوں نے فرمایا، پہلے آپ ہم کو اجازت حدیث دیں، بعد میں میں دوں گا، چناں چہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اجازت حدیث دی، اس لحاظ سے موصوف سندی اعتبار سے بھی ہندوستان و پاکستان میں ایک ممتاز شخصیت ہیں، ۱۳۶۷ھ مطابق ۱۹۴۸ء میں آپ نے دورۂ حدیث شریف سے فراغت حاصل کی۔

آغاز تدریس

فراغت کے فوراً بعد درسی خدمات کی انجام دہی کے لئے دار العلوم میں تقرر ہوا، ابتداءً نور الایضاح ترجمہ قرآن پاک، بعد میں ہدایہ مشکوٰۃ شریف اور ابوداؤد جیسی اہم کتب آپ سے متعلق رہیں اور اس وقت بخاری شریف میں آپ سے استفادہ جاری ہے، دار العلوم کے ایام میں خصوصاً شرح عقائد کا درس بہت مقبول رہا، اس کے علاوہ جن کتابوں کو اچھے اچھے اساتذہ پڑھانے کی ہمت نہ کرتے آپ نے ان کتب میں اپنا مقام بنایا اور کتاب کو مکمل شرح و بسط کے ساتھ حل کیا۔

علمی و اصلاحی خدمات

خطیب الاسلام ہمیشہ علمی کاموں میں محرک رہے، زمانۂ تدریس میں دار العلوم دیوبند کے ایک تحقیقی مرکز المعارف کا قیام عمل میں آیا اور آپ کو اس کا ذمہ دار بنایا گیا ۱۹۶۶ء میں مراسلاتی طریقہ تعلیم کی بنیاد پر اسلامی علوم و معارف کو جدید جامعات مصروف تعلیم و طلباء کے طالب کے لیے آسانی و قابل حصول بنانے کی فرض سے جامعہ دینیات قائم فرمایا جو کہ اس دور کا جدید ترین طریقہ تعلیم تھا۔ جو الحمد للہ آج بھی قائم ہے اور اس سے طلباء و طالبات مستفید ہو رہے ہیں، دوران قیام دار العلوم آپ نے قرآن کریم پر ایک جہت سے کام آغاز کیا تھا کچھ کام ہو بھی چکا تھا، افسوس کہ سقوط دار العلوم کی نظر ہو گیا اور علمی حلقہ ایک نادر دینی سرمایہ سے محروم ہو گیا۔

سقوط دار العلوم کے بعد آپ دار العلوم وقف کے مہتمم بنے اور ایسی بے سروسامانی کے دور میں جب پریشانیاں اور مجبوریاں دامن گیر تھیں ایسے عالم میں آپ ثابت قدم رہے اور میر کارواں کی حیثیت سے اس کارواں کو آگے بڑھایا، الحمد للہ اتنے قلیل وقت میں آج دار العلوم وقف جس مقام پر ہے وہ محتاج تعارف نہیں، اس کی

شہرت اور عزت وجلال آپ کی رہین منت ہے، مسلسل علالت جسمانی نقاہت اور عمر کے اس مرحلے پر پہنچنے کے باوجود بھی آپ کے ارادے عزائم اور حوصلے پست نہیں، آپ کے شب وروز اسی فکر میں گزرتے ہیں کہ کس طرح ادارہ کا فیض عام ہو، دارالعلوم کے مسند اہتمام پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ بخاری شریف کی تدریس کے ذریعہ طالبان علوم نبویہ کے علمی تشنگی بجھا رہے ہیں۔

سفر آپ کی زندگی کا مستقل ایک باب ہے، اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ آپ کی زندگی کا دوتہائی حصہ سفر میں گزرا، کبھی مدارس اسلامیہ کے جلسوں میں، کبھی فقہی سیمیناروں میں شرکت، کبھی مسلم پرسنل لاء بورڈ کی میٹنگ میں موجود، کبھی دینی تبلیغی اجتماعات میں خطاب، چلنا بس چلنا، نہ کہیں ٹھہرنا نہ کہیں رکنا۔

نہیں اس نے دیکھے ہے پست و بلند
سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
سفر زندگی کے لئے برگ وساز
سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز

ڈاکٹر اقبال کے ان اشعار کے صحیح معنوں میں آپ مصداق ہیں۔

خطابت

آپ کے عالمانہ وحکیمانہ خطابت کا شہرہ عہد شباب ہی میں ملک کی سرحدیں پار کر کے بیرونی ممالک میں پہنچ چکا تھا، علم میں گہرائی، فکر میں گیرائی، مطالعہ میں وسعت کی وجہ سے زبان سے نکلا ہوا ہر جملہ فکر وبصیرت سے منور حکمت وفلسفہ کے رنگ میں کتاب وسنت کی بے مثال تشریح وتفہیم کا ملکہ، تہ در تہ موتیوں کی تلاش آپ کا خاص ہنر ہے آپ اسٹیج پر موجود ہوں تو سامعین کو اس بات کا یقین اور اعتماد ہوتا ہے کہ اب علم وفن کے چشمے پھوٹیں گے اور برسوں سے خشک اور گرم ہواؤں کی زد میں جھلس

رہے، موضوعات کو زندگی کا حسن اور تازگی اس اسلوب کی گواہ ہے جو صرف اور صرف آپ کا انداز بیان ہے

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب ہے انداز بیاں اور

خطیب الاسلام اور ان کا قلم

تقریر کے آسمان پر جس طرح ماہ وانجم کی محفل سجائی، ایسے ہی تحریروں کی دنیا میں بھی قوس وقزح کے رنگ پیدا کئے، ان کے مقالات اور مضامین عمیق مطالعہ، دقت نظر، وسعت معلومات کا نتیجہ ہیں۔ ہر موضوع پر لکھنا ان کا پسندیدہ اور محبوب مشغلہ، موضوع یا عنوان کے جدید وقدیم ہونے سے ان کے قلم کی روانی، بہاؤ اور تیزی قطعی متاثر نہیں ہوتی، ہند اور بیرون ہند کے مؤقر رسائل بڑی ہی اہمیت کے ساتھ آپ کے مضامین کو جگہ دیتے ہیں، علاوہ ازیں آپ کے رشحات قلم سے بے شمار کتابیں معرض وجود پر آئیں، جن میں مبادیٔ التربیۃ الاسلامیۃ (عربی) (۱) جائزہ تراجم قرآن (۲) تاجدار ارض حرم کا پیغام (۳) مردان غازی (۴) ایک عظیم تاریخی خدمات (۵) سفر نامہ برما قابل ذکر ہیں۔ آپ کے خطبات کا مجموعہ بنام خطبات خطیب الاسلام کی ۵ جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ علاوہ ازیں علمی ادبی موضوعات پر آپ کے بے شمار مقالات ہیں جو قابل اشاعت ہیں۔ اس کے علاوہ منجانب اللہ آپ میں شعری کمالات بھی ودیعت ہوئے ہیں، اپنی اہلیہ محترمہ کے انتقال کے موقع پر آپ نے ایک دل سوز مرثیہ لکھا جو واقعی شعری کمالات کا مظہر ہے۔

مناصب

آپ کے زبردست کارناموں اور اعلیٰ خدمات کو سراہتے ہوئے مصری حکومت کئی سال پہلے آپ کو نشان امتیاز (نوط الامتیاز) سے نواز چکی ہے، ابھی حال

ہی میں جنوبی افریقہ کے شہر جوہانس برگ میں ۸۰ ممالک کی تقریباً دوسوعبقری شخصیات اور مذہبی رہنماؤں کی موجودگی میں ''جائزۃ الامام محمد قاسم النانوتوی ایوارڈ'' سے سرفراز کیا گیا، اس نوعیت کا ایوارڈ کسی ہندوستانی عالم دین کو پہلی مرتبہ دیا گیا۔

جہاں تک ذمہ داریوں کا تعلق ہے تو اس وقت آپ ایشیاء کی عظیم اسلامی درس گاہ دارالعلوم وقف کے مہتمم، مصر علماء کونسل، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء کے سینئر نائب صدر، آپ انڈیا مجلس مشاورت کے صدر جامعہ دینیات کے سرپرست مظاہر علوم وقف کی مجلس شوریٰ کے ستون اور مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے کورٹ رکن ہیں اس کے علاوہ بیشمار تنظیموں، جماعتوں اور مدارس کی سرپرستی آپ کے ذمہ ہے۔

متکلم اسلام حضرت مولانا محمد اسلم قاسمی صاحب دامت برکاتہم

صدر المدرسین و ناظم مجلس تعلیمی دارالعلوم وقف دیوبند

دیوبند علم و فضل کا مرکز اور اصحاب کمال کی بستی ہے، یہاں کے خمیر سے اٹھنے والے افراد و اشخاص کے کمالات، امتیازات، خدمات اور اوصاف کا احاطہ ناممکن ہے، دیوبند کے دامن میں ٹکے ستارے اس کی کشادہ پیشانی پر نور کی لکیریں اور اس کی آنکھوں میں جلتے علم و کمال کے دیئے گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے ہر حصہ میں روشن رہے، سال بہ سال، منزل بہ منزل، ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے، جنہوں نے پچھلوں کی روایتوں کو بھی زندہ نہیں رکھا؛ بلکہ دور جدید کے تقاضوں کی تکمیل بھی کی اور کردار و عمل اور اخلاق و عادات ہی میں منفرد نہیں تھے؛ بلکہ ان کے قدم جس میدان کی جانب بھی اٹھے، رنگ و نور کی بارش ہوئی، ان کے وجود سے فضائیں عطر بیز اور ماحول خوش گوار رہا، وہ جہاں پہنچے اور جس آبادی میں ان کے قدم پڑے وہاں ان کا استقبال ہوا، قدر دانوں نے ان کو اپنے دل میں جگہ دی اور قدر و منزلت کی ہر بلندی کو انہوں نے حاصل کیا۔

دیوبند کو دیوبند بنانے اور دنیا میں اس کا مقام پیدا کرنے، میں جس خانوادے کی خدمات سب سے نمایاں ہیں وہ ہے خانوادۂ قاسمی، متکلم اسلام حضرت مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی مدظلہ العالی اسی خانوادے کے روشن چشم و چراغ ہیں، آپ نے ۳؍جون ۱۹۳۸ء کو حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب کے گھر آنکھیں کھولیں، دارالعلوم دیوبند میں جناب قاری کامل صاحبؒ کے پاس قرآن کریم

ناظرہ کیا، بعدہ فارسی خانہ میں داخل ہوئے اور چار سال دارالعلوم میں فارسی پڑھی، آپ کے فارسی کے اساتذہ میں مولانا بشیر صاحبؒ، مولانا ظہیر صاحبؒ، قاری مشفع صاحبؒ، وغیرہ قابل ذکر ہیں، فارسی کی تکمیل کے بعد درجات عربیہ میں داخل ہوئے، اور ۱۹۵۹ء میں فراغت حاصل کی، آپ کے درجات عربیہ کے اساتذہ میں حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالاحد صاحبؒ، حضرت مولانا نعیم صاحبؒ اور برادر اکبر حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم وغیرہ قابل ذکر ہیں، آپ کو سند حدیث حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ سے حاصل ہے؛ لیکن جس سال آپ نے دورہ حدیث شریف میں تھے اسی سال حضرت مدنیؒ انتقال فرماگئے، ان کے بعد حضرت مولانا فخرالدین صاحب مسند حدیث پر جلوہ افروز ہوئے، آپ کو ان سے بھی اجازت حدیث حاصل ہے۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد آپ عصری علوم میں مصروف ہوگئے، علی گڑھ سے میٹرک کا امتحان دیا اور عصری علوم میں مہارت حاصل کی، ۱۹۲۹ء میں دارالعلوم میں آپ کا تقرر ہوا، مختلف شعبہ جات میں آپ نے خدمات انجام دیں، دارالعلوم وقف دیوبند کے قیام کے بعد آپ نے یہاں باضابطہ تدریس کا آغاز کیا، مشکوۃ شریف، ابوداؤد شریف، ترمذی شریف، جیسی اہم کتابیں آپ سے متعلق رہیں، اور اب گذشتہ کئی سال سے بخاری شریف جلد اول آپ سے متعلق ہے، ان کا درس بیحد مقبول شگفتہ، سلجھی ہوئی تقریر، آسان انداز بیان، الجھی ہوئی عبارتوں اور مشکل ترین مسائل کو خوبصورتی کے ساتھ ادا فرماتے ہیں، طلبہ میں مقبول بھی محبوب بھی، ایک محبوب استاد کی حیثیت سے ان کی پہچان قائم ہے، اختلافی مسائل میں علماء کے اختلاف اور ان کے صحیح مذاہب کی تفصیل مستند کتابوں کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں پھر ائمہ کے دلائل اور آخر میں امام ابوحنیفہؒ کے دلائل کا ذکر ہوتا ہے، مگر اس شان

سے کہ ائمہ پر کوئی حرف نہ آئے، بخاری میں ترجمۃ الباب کی تشریح اور حدیث سے اس کی مطابقت پر پوری توجہ صرف ہوتی ہے۔

حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیریؒ کی وفات کے بعد ۲۰۰۸ء میں آپ کو صدرالمدرسین اور ناظم مجلس تعلیمی کے منصب پر فائز کیا گیا، جس کو آپ بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں، دارالعلوم وقف دیوبند میں اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کے باوجود سادگی اور تواضع کا مجسمہ ہیں، تدریس کے ساتھ ساتھ تحریر وقلم سے بھی ان کا مضبوط رشتہ ہے، سیرت حلبیہ کا مکمل ترجمہ سیرت پاک کے نام سے سیرت کے موضوع پر ایک اہم مجموعہ آپ کے قلم سے نکلا۔ آپ بے مثال خطیب، انفرادی شان کے مدرس، بلند پایہ مصنف، سحر طراز صاحب قلم وادیب، بلند فکر شاعر، کثیرالمطالعہ قدیم اور جدید کے پختہ عالم، گوناگوں صلاحیتوں کے حامل، خاموش طبیعت، متین، پروقار اور بردبار، یورپی ممالک میں حکیم الاسلامؒ کے رفیق سفر اور حکیمانہ خطاب کے ترجمان، اجلاسِ صد سالہ کے ناظم وروحِ رواں، دارالعلوم وقف دیوبند کے محدث، صدرالمدرسین اور ناظم مجلس تعلیمی، اپنی بے مثال خطابت کے حوالے سے ملک و بیرونِ ملک مقبول ومشہور شخصیت، **اطال اللہ حیاتہٗ بالعافیۃ.**

ایک قلمکار فکری شہ پاروں کے ذریعہ اپنی موجودگی اور کام کا احساس دلاتا ہے، اپنی صلاحیتوں کے چراغ ہتھیلیوں پر سجاتا، اپنوں اور غیروں کو روشنی دکھا کے آگے بڑھ جاتا ہے، یہی عمل ہے جس نے حضرت کو زندہ رکھا ہوا ہے، حضرت مولانا لکھتے ہیں اور پوری طرح ڈوب کر لکھتے ہیں، موضوع کوئی بھی ہو، عنوان کسی بھی نوعیت کا ہو، اس میں ان کی انفرادیت صاف نظر آتی ہے، ان کے اکثر مقالات ومضامین تحقیق ودلائل سے پر ہوتے ہیں، ایک وقت میں سیرت رسول آپ کا خاص عنوان تھا آپ نے اس پر لکھا اور بہت کچھ لکھا، مجموعہ سیرت رسول، ولادت نشوونما، اصحاب کہف، آپ کے قلم سے نکلی ہوئی تحقیقی کتابیں ہیں، سیرت حلبیہ جو عربی میں ۳

جلدوں پر مشتمل تھی، آپ نے اس میں ترجمہ کے علاوہ کچھ اہم اضافات کیے، آج یہ کتاب چھ جلدوں میں حضرت کی تحقیقات کے ساتھ دستیاب ہے، عربی کی مشہور لغت المنجد پر ضمیمہ بھی موصوف کا ایک علمی کارنامہ ہے۔ اپنے والد محترم حکیم الاسلام کے شعری مجموعہ عرفان عارف کو آپ ہی نے ترتیب دیا، آپ خود بھی فن شعر گوئی میں خاصا ملکہ رکھتے ہیں اور اس کے علاوہ آپ کے متعدد مقالات ومضامین ہیں جو مختلف رسائل وکتب میں بکھرے ہوئے ہیں، جو بہت اہم اور لائق استفادہ ہیں۔

جناب ڈاکٹر محمد اعظم صاحب قاسمی

ذی علم، صاحبِ بصیرت، چہرہ شائستگی، وقار اور علمی عظمت کا گواہ، سیرت واخلاق خاندانی شرافتوں کا نمائندہ، اسلامیات میں مہارت کے ساتھ عصری علوم سے بھی آگاہ، اردو ادب کے شہ سوار، انگریزی میں عبور۔

حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کی فکر کے ایک خاص گوشے پر فاضلانہ مقالے سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور پھر وہیں شعبہ اسلامیات کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ تاحال مستقل اقامت علی گڑھ ہی میں ہے۔ بڑے فاضل، صاحبِ فکر اور رنگا رنگ خوبیوں کے انسان۔

مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی

حفظ قرآن کے بعد دار العلوم دیوبند میں تعلیم مکمل کی ۱۹۷۵ء میں دار العلوم سے فارغ ہوئے دوران تعلیم ہی پرائیویٹ طور پر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے ہائی اسکول سے ایم. اے. تک امتحانات دیئے اور ان میں نمایاں نمبرات سے کامیابی حاصل کی، دار العلوم سے فضیلت کے بعد ۱۹۷۶ء میں جامعۃ الازہر قاہرہ میں کلیہ شرعیہ سے ماجستر (ایم. اے.) کیا، مصر سے ۱۹۸۰ء میں واپسی ہوئی۔

علمی واصلاحی خدمات

مولانا محمد سفیان قاسمی صاحب صحیح معنوں میں اپنے والدمکرم کے خلف الرشید ہیں۔ ۱۹۸۱ء کے بعد دار العلوم سے وابستگی ہوئی، شروع میں ابتدائی کتب زیر تدریس رہیں، تدریجاً انتظامی ذمہ داریاں بھی سپرد ہوئیں، گذشتہ چار پانچ سالوں سے نیابت اہتمام متعلق ہونے سے ساتھ ساتھ مؤطا امام مالک کے اسباق بھی متعلق ہیں، دینی علوم میں امتیازی صلاحیتوں کے ساتھ عصری علوم میں طاق ماضی میں جامعہ دینیات جیسے معتبر ادارے کے ذمہ دار، ۲۰۰۷ء کلکتہ اجلاس میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے رکن منتخب کئے گئے، اس کے علاوہ آل انڈیا مجلس مشاورت کے بھی رکن ہیں، ذہانت، فراست، ذوق مطالعہ اور عالمانہ بذلہ سنجی میں خانوادۂ قاسمی کے فرد جلیل ہیں، آپ کے ذوق مطالعہ کا اندازہ ان کی لائبریری سے لگایا جاسکتا ہے جس میں علوم اسلامیہ کی نادر و نایاب کتابوں کا ذخیرہ ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کے کئی بڑے شاعروں کے انتخابات موجود ہیں، لائبریری کا ایک بڑا خانہ مزاحیہ ادب سے پر ہے

جس میں پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، مرزا فرحت اللہ بیگ، کنہیالال کپور، دلاور فگار، اور مشتاق یوسفی جیسے نامور مزاح نگاہوں کے تمام مجموعے موجود ہیں۔ آپ کے اندر شاعرانہ ذوق بھی بدرجۂ اتم موجود ہے؛ کیوں کہ خانوادۂ قاسمی ایک ایسا خانوادہ ہے جس میں حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند سے لے کر والد محترم تک ہر ایک میں شعری صلاحیتیں قدرتی طور پر ودیعت کی گئی ہیں۔

والد صاحب کبھی کبھی برجستہ شعر بھی کہتے ہیں، ابھی حال ہی میں حکیم اختر صاحب کی وفات کے موقع پر ایک برجستہ قطعہ منظوم فرمایا جو ماہنامہ ندائے دارالعلوم میں شائع ہو چکا ہے، جب آپ کسی مضمون پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس کی تمہید مولانا آزاد کی نثر کی یاد دلاتی ہے۔ ماہنامہ ندائے دارالعلوم کے آپ مدیر اعلیٰ ہیں۔ آپ ہی کی اعلی ادارت نے ماہنامے کو استحکام و استقلال بخشا، اس میں آپ کے متعدد مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں، مزاج میں انکساری اور قلندرانہ اوصاف موجود ہیں بقول غالب ع

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ

فی الحال دارالعلوم وقف کی ہمہ وقت تعلیمی و تعمیری ترقی کے لئے سرگرم عمل رہتے ہیں، موصوف کی شبانہ روز مساعی اور انتظامی حکمت عملیوں کے نتیجہ میں دارالعلوم وقف دیوبند الحمدللہ ہر طرح سے مستحکم اور ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

مولانا محمد فاروق قاسمی

دارالعلوم وقف دیوبند کے باصلاحیت مدرّس، نیک نہاد، سنجیدہ مزاج اور باوقار عالم، بچپن میں جد امجد حضرت حکیم الاسلامؒ سے خوب استفادہ کیا۔ ''معارف حکیم الاسلام'' کے نام سے ایک مجموعہ موصوف ہی کی محنت سے منظر عام پر آچکا۔

تمت

حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند

اسلام نے اپنی تاریخ میں ہر آن اور ہر لمحہ یہ ثبوت پیش کیا ہے کہ اس کا چمن ہر موسم میں نئے نئے پھول کھلا سکتا ہے۔ عقل وادراک کے کارواں نے جب سے نقل ووحی کی روشنی میں سفر شروع کیا ہے، اس کے سامنے علم وحکمت، فکر وبصیرت اور فضل وکمال کی ایک وسیع الآفاق کائنات بے نقاب ہوتی چلی گئی، عقل ونقل کے اس حیرت زا ارتباط اور درایت وروایت کے اس محیّر العقول ارتفاق نے ابتداء اسلام میں رجالِ دین کا ایک کہکشانی افق دریافت کیا، جس کو کرّہ ارضی پر ''اصحاب رسولؐ '' کے نام سے جانا گیا، اور اس پاکیزہ گروہ انسانی کے پایۂ استناد، کو الم نشرح کرنے کے لئے رب کائنات نے ''رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ'' کی شہادتِ افتخار اور سند اعتزاز سے سرفراز فرمایا۔

اسلام کے اس عہد زرّیں کے بعد پھر ہر دور میں سیدنا الامام الاعظم ابوحنیفہؒ، سیدنا الامام مالک بن انسؒ، سیدنا الامام الشافعیؒ اور امام غزالیؒ وغیرہ جیسی شخصیات وجود میں آئیں، تیرہویں صدی کے موسم اور دینی احوال کے مناسب حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتوی علیہ الرحمہ کو وجود بخشا، حجۃ الاسلام علیہ الرحمہ اس بزم میں گو آخر میں آئے مگر پیچھے نہیں بیٹھے۔ انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور حیرت انگیز علم وحکمت کی بلندیوں سے ہر دور کے اساطین علم اور رجال معرفت کی تصویر پیش کی۔

دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کے انقلابی کارنامے اور برصغیر میں دین کی وقیع اور رفیع خدمات کے حوالہ سے وہ کون شخص ہے جو ان کے بار احسان سے زیر بار، اور ان کے دینی وتعلیمی کارناموں کا منت کش نہیں ہے۔ ضرورت تھی کہ حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ کے علوم ومعارف اور افکار کو سہل زبان میں پیش کیا جائے، ان کی شخصیت اور انقلابی کارناموں سے دنیا کو متعارف کرایا جائے۔ یہ ایک ایسا اہم اور گراں قدر کام تھا کہ جس کی انجام دہی حلقۂ دارالعلوم دیوبند، قاسمی برادری اور فکر دیوبند کے ہر علمبردار کے کاندھوں پر فرض اور قرض کے درجہ سے کم نہ تھی۔

دارالعلوم وقف دیوبند اپنی بے سروسامانی کے باوجود جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ خالص نصرت الٰہی ہی ہے۔ خدا تعالیٰ کے فضل عمیم اور احسانِ عظیم کا نتیجہ ہے۔

''حجۃ الاسلام اکیڈمی'' کا قیام بھی اسی سلسلہ کی ایک مفید کڑی ہے۔

ISBN: 978-81-929441-3-5

Hujjat al-Islām Academy
Al-jamia al-Islamia Darululoom Waqf, Deoband
Eidgah Road, P.O. Deoband-247554, Distt: Saharanpur U.P. India
Tel : + 91-1336-222352, Mob: + 91-9897076726
Website: www.dud.edu.in, www.darululoomwaqf.com
Email: hujjatulislamacademy@dud.edu.in, hujjatulislamacademy2013@gmail.com